گلشن ہند

مشہور شعرائے اُردو کا ایک تذکرہ

جس کو

میرزا علی متخلص بہ لطف

نے، بعہد مارکوئس آوف ویلزلی گورنر جنرل ہند، اُردو کے مشہور سرپرست مسٹر جان گلگرسٹ کی
فرمائش سے، علی ابراہیم خاں کے فارسی تذکرہ گلزار ابراہیم سے، مع اضافوں کے اُردو زبان میں،
جو آج سے ایک سو پانچ برس پیشتر کی سادہ اُردو نثر کا ایک عمدہ نمونہ ہے،

سنہ ۱۸۰۱ع

میں تصنیف کیا، اور

سنہ ۱۹۰۶ع

میں

شمس العلما مولوی شبلی کی تصحیح و تحشیہ اور مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے
کے ایک عالمانہ مقدمہ کے ساتھ، اُردو زبان کی خدمت کے لئے

عبداللہ خاں نے حیدر آباد دکن سے شائع کیا

اور

دار الاشاعت پنجاب

کے

رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور میں چھپا

ڈیڈی کیشن

ہز ایکسلنسی مہاراجہ یمین السلطنتہ
بہادر وزیر اعظم دولت آصفیہ کو چوں کہ
اُردو زبان سے ایک خاص دلچسپی ہے
اور آپ خود بھی اُردو زبان کے ایک
ممتاز مصنّف اور بلند پایہ شاعر ہیں ،
لہذا یہ کتاب جناب کے نام نامی پر
ڈیڈیکیٹ کی جاتی ہے ۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

خاکسار
عبداللہ خاں حیدر آباد دکن

پبلشر کی التماس

۱۳۲۶ھ ہجری کے موسم برسات میں پائے تخت حیدرآباد کی مشہور ندی میں، جو حصارِ شہر کے نیچے بہتی چلی گئی ہے، ایک عظیم الشان سیلاب آیا۔ اس سیلاب سے لاکھوں روپے کا نقصان ہوا، اور کچھ لوگوں کو بہ مصداق "چوں خراب شود خانۂ خدا گردد" فائدہ بھی پہنچا۔ لیکن اس طوفان کی سب سے بڑی اور مفید یادگار یہ تذکرہ ہے، جو پبلک میں پیش کیا جاتا ہے۔ اگر سیلاب نہ آتا تو اس منحوس زمین سے اس علمی چشمے کا بہنا ممکن نہ تھا۔ یہ سیلاب جہاں اَور ہزارہا چیزوں کو اپنے ساتھ لایا، وہاں کسی آفت زدہ کا ایک کتب خانہ بھی بہا لایا؛ اور اُس میں یہ تذکرہ بھی تھا۔ پبلک میں یہ آب آورد کتابیں کوڑیوں کے داموں بکیں، اور یہ تذکرہ ہمارے کرم فرما، مولوی غلام محمد صاحب مددگار کیبنٹ کونسل دولت آصفیہ کے ہاتھ لگا، انہوں نے علامہ شبلی کو دکھایا۔ علامہ موصوف نے اس کو بدرجۂ غایت پسند کیا، اور انجمن ترقی اُردو کی طرف سے شائع کرنے کا قصد کیا؛ لیکن انجمن اپنی پیچ در پیچ طرزِ عمل کی وجہ سے اس کو نہ چھاپ سکی۔ اور علامہ موصوف نے ہم کو اُس کے شائع کرنے کی رائے دی اور خود اُس کے اِڈِٹ کرنے کا وعدہ کیا۔ چنانچہ علامہ موصوف نے اس کی تصحیح بھی کی، اور اس پر کچھ نوٹ بھی لگائے، جو بجنسہ چھاپ دیئے گئے ہیں۔

اس تذکرے کی معنوی خوبیاں، اور تاریخی حیثیت سے اُس کی اہمیت، اُس مقدمے سے ظاہر ہوگی جو ہمارے کرم فرما مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے، پرنسپل مدرسہ آصفیہ حیدرآباد نے ہماری فرمائش سے اس تذکرے پر لکھا ہے۔ جس میں اُنھوں نے اُردو زبان کی نشو و نما کی تاریخ اور اُس کی قدیم تصانیف کا بیان اور تذکرہ ہذا کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب کو ریویو لکھنے میں جو خاص ملکہ ہے، اُس کو تمام اُردو داں پبلک جانتی ہے، کہ وہ کس خوبی سے اس اہم کام کو انجام دیتے ہیں، اس لئے ہم بجز شکریے کے اَور زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

مقدمہ

بر تذکرۂ گلشنِ ہند

(از مولوی عبدالحق صاحب بی۔ اے۔ پرنسپل مدرسہ آصفیہ۔ حیدرآباد دکن۔)

یہ کتاب شعرائے اُردو کا قابل قدر و نایاب تذکرہ ہے اتفاق زمانہ سے ایک ایسے نیک دل اور باہمت شخص[1] کے ہاتھ لگ گیا جس نے باوجود بے بضاعتی کے چھپوانے کا تہیہ کیا، اور مجھ سے کتاب پر مقدمہ لکھنے کی فرمایش کی۔ میں خود بے بضاعت، تاہم اس فرمایش کو جو اُنہوں نے دلی شوق سے کی تھی ٹال نہ سکا، اور بسر و چشم قبول کیا۔

حقیقت اس کتاب کی یہ ہے کہ نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ کے عہد، اور امیر الممالک لارڈ وارن ہیسٹنگز، گورنر جنرل کے زمانے میں، علی ابراہیم خاں نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا فارسی

---

[1] مولوی عبداللہ خان صاحب کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد دکن ۲۵ ص ۲۔ ابراہیم خاں متخلص بہ خلیل، مشہور ادیب اور مورخ ہیں۔ پٹنہ کے رہنے والے تھے اور بعہد گورنر جنرل لارڈ کارنوالس، بنارس میں چیف جسٹس اور جج انگریزی رہے۔ اور سنہ ۱۲۰۸ ہجری میں انتقال کیا ان کی ... تصانیف یہ ہیں:
(۱) گلزار ابراہیم تذکرہ شعرائے اُردو، جو شاہ عالم کی بادشاہت، آصف الدولہ کی وزارت، اور وارن ہیسٹنگز کی گورنر جنرلی میں ۱۱۹۸ھ و ۱۱۹۶ھ میں لکھا ہے، اور جس پر میرزا علی لطف نے اپنے اس تذکرہ گلشن ہند کی بنیاد رکھی۔
(۲) خلاصۃ الکلام اور صحف ابراہیم، یہ دونوں فارسی شعرا کے تذکرے ہیں۔
(۳) وقائع جنگ مرہٹہ، یہ کتاب بعہد لارڈ کارنوالس ۱۲۰۱ ہجری میں لکھی گئی۔ اس میں ۱۱۶۱ھ سے ۱۱۹۶ھ تک کے حالات درج ہیں۔ بریگز صاحب نے انگریزی میں اس کتاب کا ترجمہ کیا ہے۔ اس میں بڑی خوبی سے مرہٹوں کے حالات لکھے گئے ہیں اور پانی پت کی جنگ کا حال ایک ایسے شخص سے سن کر لکھا گیا ہے جس نے اپنی آنکھوں سے جنگ دیکھی تھی۔
(۴) ایک کتاب میں راجہ چیت سنگھ والی بنارس کے بغاوت کے حالات لکھے ہیں۔ یہ واقعہ خود مصنف کے زمانے کا ہے، مگر چونکہ اس کتاب کے شروع ہی میں یہ ظاہر کیا ہے کہ مسٹر علی ابراہیم خاں یکے از نمک خواران کمپنی انگریز" لہٰذا کسی قدر بدگمانی ہوتی ہے۔
(۵) خطوط، جو برٹش میوزیم کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ اور جس سے اُس زمانے کے بعض حالات پر روشنی پڑتی ہے۔

ہمیں مولوی غلام محمد صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا ہے، جنہوں نے اپنی علمی فیاضی سے، یہ کتاب ہم کو چھاپنے کے لئے دی اور کئی سال تک ہمارے پاس رہی۔ علامہ شبلی بھی خاص شکریے کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اپنی عنایت سے اُس کی تصحیح اور تحشی میں اپنا وقت صرف کیا ✦

اس کتاب کے چھپوانے میں خاص اہتمام کیا گیا ہے، اور حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ اس کا ایک حرف بھی چھوٹنے نہ پائے۔ البتہ صرف اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ میر، سودا، درد اور مصنف کا نمونۂ کلام، جو اس تذکرے میں نہایت کثرت کے ساتھ درج تھا، اُس میں سے صرف عمدہ نمونہ چن لیا گیا ہے، اور اس خدمت کو بھی مولوی عبدالحق صاحب کے ذوق سلیم نے انجام دیا ہے۔ اس کے سوا اس میں اور کوئی تصرف نہیں کیا گیا بلکہ مقدمے اور نوٹوں سے اُس کو اور زیادہ مخزن معلومات بنایا گیا ہے۔ جس کی قدردانی کی پبلک سے اُمید کی جاتی ہے۔ اگر پبلک نے اس کی قدردانی کی تو ہم بہت جلد اور مفید علمی کتابوں کے شائع کرنے کے قابل ہو سکیں گے جو انگریزی اور عربی سے ترجمہ کی گئی ہیں ✦

عبداللہ خاں

کتب خانہ آصفیہ
حیدرآباد دکن
۱۶ نومبر ۱۹۰۶ء

میں لکھا تھا؛ اور اس کا نام گلزار ابراہیم رکھا تھا۔ کوئی بارہ برس کی محنت میں سنہ ۱۱۹۸ ہجری مطابق سنہ ۱۷۸۴ عیسوی میں جاکر ختم ہوا۔ اتفاق سے یہ تذکرہ اُردو کے بڑے قدردان اور محسن، مسٹر گلکرسٹ کی نظر سے گزرا۔ انہوں نے مؤلف تذکرۂ ہٰذا سے فرمائش کی کہ اگر اس کا ترجمہ سلیس اُردو میں ہو جائے تو بہت خوب ہو۔ اُن کا منشا اس سے یہ تھا کہ انگریز بھی اسے پڑھ سکیں، اور ان میں اُردو زبان اور شاعری کا ذوق پیدا ہو جائے۔ اس طرح یہ کتاب اُردو میں لکھی گئی۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ نرا ترجمہ ہے، بلکہ مترجم نے اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہے، حالات میں بھی اور کلام میں بھی، جس سے بالکل نئی صورت پیدا ہو گئی ہے اور ایک تالیف کی حیثیت ہو گئی ہے۔

یہ تالیف اُس زمانے میں ہوئی جب کہ دلّی میں شاہ عالم بادشاہ اور لکھنؤ میں نواب سعادت علی خاں رونق بخش مسند حکومت تھے۔ بادشاہ تو ایک بے بسی اور بےکسی کی حالت میں تھے، اور نام کے بادشاہ رہ گئے تھے؛ البتہ پورب کی طرف سے ایک جھلکی دکھائی دی۔ دلّی کے اہل کمال اپنے وطن سے مُنہ موڑ اُسی طرف ہو لئے۔ یہ قدردانی کے بھوکے تھے، قدر ہوتے جو دیکھی تو وہیں کے ہو رہے۔ سب سے زیادہ شاعری کا ہنگامہ گرم تھا۔ بچہ بچہ شاعری کا دم بھرتا تھا۔ اِدھر کے اساتذہ جو پہنچے تو اُنہوں نے وہ رنگ جمایا کہ سب رنگ پھیکے پڑ گئے۔ یہاں تک کہ نواب سعادت علی خاں جیسا عالی دماغ، متین، منتظم، اور کام کرنے والا شخص بھی اس کے اثر سے نہ بچا۔ باوجود اس کے انشاء اللہ خاں سے جو ہزار پھکڑوں کا ایک پھکڑ تھا، آخر انہیں اپنی گوں نہ دیکھ کر کہہ ہی دیا۔

"میں ہوں ہنسنا ور تو ہے مطلع میرا تیرا بیل نہیں"

کہتے ہیں کہ یہ اُردو شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ بیشک، لیکن یہ ایک ایسا عروج تھا جس کے ایک رُخ پر عروج اور دوسرے رُخ پر زوال کی تصویر نظر آتی تھی۔ عروج تو اس لئے کہ زبان روز بروز منجھتی جاتی تھی اور صاف اور شستہ ہوتی جاتی تھی، اور زوال اس لئے کہ فن شاعری میں صرف فارسی والوں کی تقلید کی جاتی تھی اور تقلید بھی ناقص۔ اس کے بعد اور لوگ جو پیدا ہوئے وہ بھی اسی ڈگر پر ہو لئے۔ شاعری بس اسی کا نام رہ گیا تھا کہ بندش چست ہے، قافیے کو کبھی طرح نباہ دیا

ایک آدھ محاورہ آگیا، کسی نئی یا سنگلاخ زمین میں غزل کہ دی، کبھی کبھار ڈھنے تڑھنے سال دو سال میں کسی نئی تشبیہ یا استعارے کا استعمال ہوگیا؛ رہا مضمون، سو خدا کے فضل سے اس میں برکت ہی برکت تھی، اور اب بھی وہی حال ہے۔ مضمون تو مضمون تشبیہات تک مقرر ہیں، اور جو ایک وہی استعمال ہوتی چلی آتی ہیں۔ کسی نئی تشبیہ کا لکھنا بڑی بہادری اور جرأت کا کام ہے، کیونکہ نکتہ سنج شاعر اس کے لئے سند طلب کرتے ہیں۔ جیسے کوئی قانون داں کسی فوجداری جرم میں تعزیرات ہند کی دفعہ تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ ان شعراء کی محنت سے زبان صاف ہوگئی، لیکن اپنی شاعری کی طرح ٹھٹھر کے رہ گئی، اور جو حصار کہ ہمارے نغز گو شعرا نے اس کے گرد باندھ دیا تھا اس سے آگے قدم نہ رکھ سکی۔ اس سے بڑھ کر محدود ہونے کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ شاعری کا دعویٰ ہے، اردو کے استاد ہیں۔ مگر خط و کتابت فارسی میں کرتے ہیں، دیوان اردو ہے، مگر مقدمہ فارسی میں لکھا ہے۔ کوئی معاملہ آپڑا اظہار مطلب فارسی میں ہوتا ہے اردو میں نہیں، کسی طبیب کے پاس جائیے نسخہ فارسی میں ہے (اور یہ اب تک رائج ہے)، سرکاری دفاتر میں فارسی رائج ہے، یہاں تک کہ خط کی مشق کے لئے بھی شعر لکھے جاتے ہیں تو فارسی، اب اردو کو وسعت ہو تو کیوں کر ہو۔

لیکن ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی، اور جس کا تسلط اس وقت ہندوستان پر اس طرح بڑھتا چلا جاتا تھا، جیسے ساون بھادوں کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے، اس نے اردو کی دستگیری کی۔ اور وہ اس لئے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لئے اس کا جاننا ضروری تھا۔ دوسرے یہ زبان ریاست کی گود میں پلی تھی، جہاں جہاں اس وقت بھی مغلیہ حکومت کے آثار باقی تھے، اسی کا دور دورہ تھا۔ علاوہ اس کے ہندوستان کی جدید زبانوں میں سب سے زیادہ ہونہار نظر آئی۔ اس لئے انہوں نے اس کی سرپرستی کی۔ سب سے بڑا احسان ڈاکٹر جان گلکرسٹ کا ہے جس نے انیسویں صدی کے شروع میں، بمقام فورٹ ولیم کلکتہ اس کا ایک محکمہ قائم کیا، جس کا انتظام ان کے سپرد تھا۔ اصلی مقصد یہ تھا کہ جو انگریز یہاں ملازمت اختیار کرتے ہیں، ان کی

تعلیم کے لئے اُردو کی مناسب اور مفید کتابیں تالیف کرائی جائیں۔ اور غالباً اسی شخص کا احسان ہے کہ بجائے فارسی کے اُردو زبان دفتر کی زبان قرار پائی۔ یہ عجب واقعہ ہے، اور یاد رکھنے کی بات ہے کہ فارسی جو مسلمان فاتحوں کی چہیتی زبان تھی، ایک ہندو راجہ ٹوڈرمل کی کوشش سے دفاتر میں داخل ہوئی، اور دوسرے دور میں اردو نے ایک انگریز کی وساطت سے دربار سرکار میں رسائی پائی۔ اس شخص نے اس وقت کے قابل قابل لوگ بہم پہنچائے۔ اور مختلف کتابیں لکھوائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو نثر کا لکھنا اسی وقت سے شروع ہوا، اور بلا مبالغہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں، کہ جو احسان ولی نے اردو نظم پر کیا تھا، اس سے زیادہ نہیں تو اسی قدر احسان جان گلکرسٹ نے اردو نثر پر کیا ہے ✦

چوں کہ یہ تذکرہ بھی اسی نامور اور قابل شخص کی تحریک سے لکھا گیا تھا، لہٰذا اس مقام پر مختصراً یہ بیان کرنا اس کی نگرانی میں، یا اور انگریزوں کی سعی سے کیا کیا کام ہوا، اور اُردو زبان میں کس قدر اضافہ ہوا، نامناسب نہ ہوگا ✦

اس سلسلے میں سب سے اول سید محمد حیدر بخش حیدری قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے سنہ ۱۸۰۱ عیسوی میں توتا کہانی لکھی، جو اصل میں انہوں نے طوطی نامہ کو اپنی زبان میں لکھا ہے۔ طوطی نامہ ابن نشاطی نے عبداللہ قطب علی شاہ کے زمانے میں، دکنی زبان میں لکھا تھا، مگر ماخذ اس کا ایک سنسکرت کتاب ہے۔ آرائش محفل یعنی مشہور قصۂ حاتم بھی جو اب تک عوام میں دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے، انہیں کا لکھا ہوا ہے۔ ایک کتاب گل مغفرت یا دہ مجلس مسلمانوں کے اولیاء اللہ کے حالات میں بھی لکھی ہے۔ فارسی کی مشہور کتاب بہار دانش کا بھی اردو ترجمہ کیا ہے جس کا نام گلزار دانش ہے۔ ایک اور کتاب تاریخ نادری اُردو میں لکھی، یہ کسی فارسی تاریخ کا ترجمہ ہے ✦

دوسرے صاحب میر بہادر علی حسینی ہیں انہوں نے میر حسن دہلوی کی مشہور و معروف مثنوی سحر البیان (قصہ بدر منیر و بے نظیر) کو اردو نثر میں کیا ہے اور اس کا نام نثر بے نظیر رکھا ہے۔ اور ایک اور کتاب اخلاق ہندی کے نام سے لکھی ہے، اس کتاب کا ماخذ فارسی کتاب مفرح القلوب

ہے جو اصل میں سنسکرت سے لی گئی ہے۔ یہ دونوں کتابیں سنہ ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی تھیں +

میر امن دہلوی سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ احمد شاہ درانی کے زمانے میں جو دلی پر آفت آئی تو یہ وطن کو چھوڑ کر پٹنہ میں آ رہے۔ پھر یہاں سے سنہ ۱۸۰۱ء میں کلکتہ پہنچے۔ باغ و بہار کی وجہ سے کا نام ہمیشہ یاد رہے گا۔ یہ کتاب سنہ ۱۸۰۲ء میں لکھی گئی ہے۔ اور انیسویں صدی کے آغاز کی جو زبان تھی اس کا اعلےٰ نمونہ ہے۔ اس کتاب کا ماخذ امیر خسرو کی چہار درویش ہے میر امن نے امیر خسرو کی تصنیف سے ترجمہ نہیں کیا، بلکہ اس سے پیشتر ایک صاحب تحسین نامی ساکن اٹاوہ نے اسے امیر خسرو کی کتاب سے ترجمہ کیا تھا، اور اس کا نام نو طرز مرصع رکھا تھا۔ میر امن نے اخلاق محسنی کے تتبع میں ایک کتاب گنج خوبی بھی اسی زمانے میں لکھی۔ حفیظ الدین احمد فورٹ ولیم کالج میں پروفیسر تھے۔ سنہ ۱۸۰۳ء میں انہوں نے علامی ابوالفضل کی کتاب عیار دانش کا ترجمہ اردو میں کیا۔ اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ اصل کتاب سنسکرت میں ہے، اور عربی میں کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہے +

میر شیر علی افسوس بھی اسی سلسلے میں ممتاز شخص ہیں۔ دہلی کے رہنے والے تھے۔ گیارہ برس کے سن میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آئے۔ بہت سے انقلابات کے بعد نواب سالار جنگ اور پھر ان کے بیٹے نوازش علی خاں کے ہاں ملازم رہے، اور جب یہ شیرازہ بکھر گیا تو صاحب عالم و عالمیان مرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے متوسل ہو گئے۔ مگر جب شہزادہ عالم کا کوچ شاہجہان آباد کی طرف ہوا تو یہ ساتھ نہ جا سکے۔ اور نواب سرفراز الدولہ بہادر کے ساتھ زندگی کے دن بسر کرنے لگے۔ تلمذ ان کو میر حیدر علی حیران سے ہے، اور بعض کا قول ہے کہ میر درد اور میر سوز کے شاگرد ہیں۔ اتنے میں صاحب عالی شان، بارلو صاحب نے، مسٹر گلکرسٹ کے مشورے سے، زبان دانان ریختہ کو لکھنؤ سے طلب فرمایا، چنانچہ لکھنؤ کے رزیڈنٹ مسٹر اسکاٹ نے میر شیر علی افسوس کو انتخاب کیا، اور دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کر کے پانسو روپیے خرچ راہ دیا، اور کلکتہ روانہ کیا۔ سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ پہنچے، اور نو برس بعد انتقال کر گئے۔ یہاں انہوں نے

ایک قابل قدر کتاب آرایش محفل لکھی، جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں۔ اس کتاب کا ماخذ سبحان رائے کی کتاب خلاصۃ التواریخ ہے، اور مرنے سے سال بھر پہلے یعنی سنہ ۱۸۰۸ء میں سعدی کی گلستان کا ترجمہ باغ اُردو کے نام سے اُردو میں کیا۔

نہال چند نے سنہ ۱۸۰۳ء میں مثنوی گل بکاولی کو اُردو نثر میں لکھا، اور نام اس کا مذہب عشق رکھا۔

کاظم علی جوان بھی دہلی کے تھے، بعد ازاں لکھنؤ میں آئے، اور وہاں سے سنہ ۱۸۰۰ء میں کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں آئے۔ انہوں نے سنہ ۱۸۰۲ء میں شکنتلا کا قصہ اُردو میں لکھا۔ نواز کبیشر نے جو برج بھاکا میں (سنہ ۱۷۱۶ء) شکنتلا کی کہانی لکھی تھی، اس کا یہ ترجمہ ہے۔ انہوں نے ایک بارہ ماسہ بھی لکھا ہے، اور اس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے، جس کا نام دستور ہند ہے، اور جو سنہ ۱۸۱۲ء میں چھپا۔

اکرام علی نے سنہ ۱۸۱۰ء میں رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالے کا ترجمہ عربی سے اُردو میں کیا، جس میں شاہ اجنہ کے سامنے انسان و حیوان کا جھگڑا پیش ہے، کہ ہم دونوں میں کون افضل ہے۔ یہ منجملہ اُن رسائل کے ہے جو بغداد کی مشہور سوسائٹی اخوان الصفا کے اہتمام سے لکھے گئے تھے۔

سری لالو گجرات کا برہمن تھا، جو شمالی ہند میں آکر آباد ہوگیا تھا۔ اس نے فورٹ ولیم کالج کی نگرانی میں ہندی کی بعض کتابیں، مثلاً پریم ساگر، راج نیتی، و لطایف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں۔ سنگھاسن بتیسی، سری لالو اور جوان نے مل کر سنہ ۱۸۰۱ء میں لکھی، جو آدھی اُردو آدھی ہندی ہے۔

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی، جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مثل ہے، اور نیز ولا کی مدد سے قصہ مادھونال کو برج بھاکا سے اُردو میں ترجمہ کیا۔

علاوہ اس کے خود گلکرسٹ نے سنہ ۱۸۰۲ء میں اُردو کی ایک لغت لکھی، زبان کے بعض قواعد لکھے، اور مختلف طرح سے اُردو زبان کی خدمت کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر گلکرسٹ سے اول بھی

ایک شخص فرگسن نامی نے اُردو کی ایک لغت لکھی تھی جو لندن میں ۱۷۷۳ء میں طبع ہوئی۔ مگر چونکہ
وہ بالکل ناکافی تھی، جرنل ولیم کرک پیٹرک نے ایک ڈکشنری لکھنے کا ارادہ کیا، جس کے انہوں نے
تین حصے کئے، مگر اس کا ایک ہی حصہ طبع ہوتے پایا۔ اس حصے میں انہوں نے وہ الفاظ دئے
جو عربی فارسی سے ہندی میں آ گئے ہیں۔ باقی دو حصوں کے طبع کرنے کے لئے انہیں ناگری
حروف کی ضرورت تھی جو میسر نہ تھا، وہ جلد تیار نہ ہو سکا، اور کتاب ناقص رہ گئی۔ یہ ایک حصہ لندن میں ۱۷۸۵ء
میں طبع ہوا۔ لندن سے جب یہ واپس آئے تو دیکھا کہ ڈاکٹر گلکرسٹ بھی اسی کام میں لگے ہوئے
ہیں، تو چاہا کہ دونوں مل کر اسے انجام دیں، مگر چوں کہ ان کو اور بہت سے کام کرنے تھے،
اس لئے تھوڑے دنوں کے بعد وہ الگ ہو گئے، اور ڈاکٹر گلکرسٹ تنہا یہ کام کرتے رہے۔
ڈاکٹر صاحب نے ایک حصہ انگریزی ہندوستانی لغت کا تیار کر کے ۱۷۹۰ء میں چھاپ دیا،
مگر دوسری جلد ہندوستانی انگریزی لغت ختم نہ کر سکے۔ علاوہ اُن تمام دقتوں کے جن سے وہ گھبرا
گئے تھے، ایک دقت یہ بھی تھی کہ خریدار بہم نہ پہنچے۔ صرف ستر صاحبوں نے خریداری منظور کی۔
حالاں کہ خرچ کا اندازہ کم سے کم چالیس ہزار روپیہ کا کیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کام کو نہایت
حسرت کے ساتھ خیرباد کہا۔ اس کے بعد میجر ڈیوڈ تامسن رچرڈسن سپرنٹنڈنٹ وکمانڈنٹ
ملٹری ایکاڈمی نے اُردو لغت لکھنی شروع کی، مگر افسوس کہ اس کا بھی وہی حشر ہوا، اور طبع
ہوتے ہوتے رہ گئی۔ اس کے بعد ۱۸۰۸ء میں ڈاکٹر ٹیلر نے ایک ہندوستانی انگریزی لغت
طبع کرائی۔ اسی کتاب کو پھر ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے فورٹ ولیم کالج کے دیسی ادیبوں کی امداد سے نظر
ثانی کر کے چھپوایا۔

گلیڈون نے ایک لغت فارسی اور ہندوستانی زبان کی دو جلدوں میں لکھی، جو کلکتہ
میں ۱۸۰۹ء میں چھپی۔ مسٹر جان شیکسپیر نے ایک اُردو لغت ۱۸۱۷ء میں طبع کرائی، یہ
کتاب زیادہ تر ٹیلر کی لغت سے ماخوذ ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اسی کتاب کو دوسرے قالب
میں پیش کیا گیا ہے۔ فوربس کی لغت ۱۸۴۷ء میں لندن میں چھپی۔ ایک فرانسیسی

برٹرینڈ نے بھی ایک لغت لکھی، جو پیرس میں ۱۸۵۸ء میں طبع ہوئی۔ برائس کی لغت سنہ ۱۸۶۴ء میں لندن میں چھپی۔ پلیٹ نے بھی ایک لغت لکھی ہے، جس کے طبع ہونے کا سن مجھے معلوم نہیں ہوا۔ اس زمانے میں ڈاکٹر فیلن نے اردو کی کئی لغات لکھیں، ان کی ہندوستانی انگریزی لغت درحقیقت سب سے بہتر ہے، یہاں تک کہ اہل زبان نے بھی جو دو ایک لغت لکھے ہیں، ان میں بھی زیادہ تر فیلن کا تتبع کیا گیا ہے، بلکہ اسی سے ماخوذ ہیں۔

اس مقدمے میں جو انگریزوں کے احسان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس تذکرے سے بھی بعض باتیں ایسی معلوم ہوتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں کو اس زبان سے خاص دلچسپی تھی، اور اس کی ترقی دینے میں انہوں نے حتی الامکان کوشش کی۔ میر شیر علی افسوس کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے، اور وہ ہم نے اسی تذکرے سے لیا ہے۔ میر کے حال میں لکھا ہے:۔

"جن ایام میں کہ درخواست صاحبانِ عالی شان کی زبان دانانِ ریختہ کے مقدمہ میں کلکتے سے لکھنؤ گئی تو پہلے کرنل اسکاٹ صاحب کے سامنے تقریب میر کی ہوئی، لیکن علت پیری سے وہاں سے جانے کے معمول ہوئے، اور جوانانِ نومشق مربی گری سے قوت بہ فنی کے مقبول ہوئے۔ زمانہ خوش طبعوں سے کبھی نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنؤ پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست خالی ہے۔"

غالباً اس جگہ کے لئے میر شیر علی افسوس کا انتخاب ہوا، کاش میر صاحب کا انتخاب ہوتا! چوں کہ ان کی نظم میں انتہا درجے کی فصاحت و شیرینی اور سلاست اور گھلاوٹ موجود ہے، اس لئے ممکن تھا کہ وہ فورٹ ولیم کالج میں جا کر نثر میں کوئی ایسی یادگار چھوڑ جاتے کہ اہل زبان ان کی نظم کی طرح اسے سر اور آنکھوں پر رکھتے، اور اردو زبان میں ایک عجیب اور قابل قدر اضافہ ہوتا۔

نواب محبت خاں محبت، خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں، کے ذکر میں لکھا ہے کہ:۔

[illegible]

"انہوں نے نواب ممتاز یار الدولہ مسٹر جانسین کی فرمایش سے قصہ سسی پنوں کا اردو میں نظم کیا ہا۔ نام اس کا اسرار محبت رکھا۔"

میر قمر الدین کے حال میں درج ہے کہ۔

"انہوں نے میر محمد حسین۔ فرنگی لقب، کے توسل سے ممتاز الدولہ مسٹر جانسین کی سرکار میں توسل حاصل کیا، اور ان کی رفاقت میں کلکتہ آکر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہسٹین (ہیسٹنگز) جلادت جنگ بہادر کی جانب سے پیشگاہ نظامت صوبہ بنگ سے ملک الشعرا کا خطاب لیا۔"

اس زمانے میں علاوہ ڈاکٹر فیلن کے، جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، کرنل ہال رائیڈ سابق ڈائرکٹر سر رشتہ تعلیم پنجاب نے بھی اردو زبان کی ترقی میں بیش بہا مدد دی، سلسلہ تعلیم کے لئے عمدہ عمدہ کتابیں لکھوائیں، انگریزی سے بھی بعض چیزیں ترجمہ کرائیں، اور اس میں مفید اور نیک مشورہ دیا۔ کتابت اور چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا، اور اس میں کارآمد صلاحیں کیں۔ اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ لاہور میں ایک انجمن قایم کی جس میں نیچرل مضامین پر عمدہ عمدہ نظمیں لکھوائیں شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالی، اور شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کی بعض نظمیں انہیں کی تحریک سے لکھی گئیں اور وہیں پڑھی گئیں۔ کرنل ہالرائیڈ کا یہ کام بہت قابل قدر اور قابل تعریف ہے، اس لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو نثر کی طرح اردو نیچرل شاعری کی بنا بھی ایک حد تک انگریزوں ہی کے ہاتھوں رکھی گئی۔ آج کل مسٹر ہل ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن پنجاب نے جو انجمن ترقی اردو کی صدارت قبول فرما کر اردو کی سرپرستی فرمائی ہے وہ بھی کچھ کم قابل شکریہ نہیں۔ اسی سلسلے میں جو ایک اور قابل قدر کام انگریزوں کے ہاتھوں ہوا ہے، اور جس کا ذکر میں یہاں مناسب سمجھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ سب سے اول اردو کتابیں بھی انہوں ہی نے چھپوائیں، اول اول فورٹ ولیم کالج ہی کے پریس میں اردو کتابیں ٹائپ میں طبع ہوئیں، اور جتنی کتابیں کہ ڈاکٹر گلکرسٹ، اور اس کے جانشینوں کی نگرانی اور مشورے سے تیار ہوتی تھیں وہیں چھپتی تھیں اس کے بعد لیتھوگراف پریس سب سے پہلے دہلی میں ۱۸۳۷ء میں، استعمال ہوا۔

اور اس کے بعد سے روز بروز کتابوں کے چھپنے میں ترقی ہوتی رہی ۔

وہ انگریز حاکم، جس نے اس ملک میں بیٹھ کر جو اردو کا جنم بھوم اور وطن مالوفہ ہے، اُسے دفاتر سے نکال کر ذلیل کرنا چاہتا تھا، وہ سخت غلطی پر تھا۔ اگر وہ اس زبان کی تاریخ سے واقف ہوتا، اور یہ جانتا کہ اس کے واجب التعظیم بزرگوں نے اس کے حاصل کرنے اور اسے وسعت دینے میں کیسی کیسی مشقتیں جھیلی ہیں، اور اس عجیب وغریب سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی اس عجیب وغریب زبان کی بنیاد بھی مستحکم کی ہے، تو ضرور اپنی حرکت پر نادم ہوتا۔ یہ زبان کسی خاص قوم یا کسی خاص ملت کی نہیں ہے، اس پر دنیا کی تین بڑی قوموں نے عرق ریزی کی ہے، ہندو اس کی ماں ہیں، مسلمان اس کے باوا ہیں، اور انگریز اس کے گاڈ فادر ہیں۔ جو لوگ اس کے مٹانے کی کوشش کرتے ہیں وہ گویا اس نشانی کو مٹانا چاہتے ہیں، جو تینوں کے اتحاد کی یادگار رہے۔ وہ غلطی پر ہیں، جب تک ہندو اور مسلمان اور انگریز دنیا میں قائم ہیں، کم از کم اس وقت تک یہ زبان ضرور قائم رہے گی ۔

افسوس ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے حالات کچھ نہیں لکھے۔ دیباچے میں تو ذکر ہی نہیں، شعرا کے سلسلے میں جہاں اپنا حال لکھا ہے وہ بھی برائے نام ہے بلکہ دوسرے شعرا کے مقابلے میں بالکل کم اور ناکافی ہے، البتہ اپنا کلام بڑے شوق سے نقل کیا ہے، اور شاید اس موقع کو غنیمت سمجھ کر سب کا سب درج تذکرہ کر دیا ہے۔ لہذا ہم نے کچھ ان کے کلام سے اور کچھ ادھر اُدھر سے تھوڑا بہت حال بہم پہنچایا ہے ۔

نام میرزا علی تخلص لطف تھا، ان کے والد کاظم بیگ خاں استرآباد کے رہنے والے تھے، سنہ ۱۱۵۰ ہجری میں نادرشاہ کے ساتھ شاہ جہان آباد تشریف لائے، اور ابو المنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے دربار شاہی میں رسوخ پایا، فارسی کے شاعر تھے اور ہجری تخلص کرتے تھے۔ فارسی میں میرزا علی لطف باپ ہی کے شاگرد تھے۔ میرزا لطف دیباچے میں لکھتے ہیں

سنہ ۱۲۱۵ میں حیدرآباد کا قصد تھا، مگر جب کہ مسٹر گلکرسٹ نے بڑے اخلاق اور تپاک کے ساتھ مجھ سے اس

"تذکرے کے لکھنے کی خواہش کی لہٰذا میں نے اسے بسروچشم قبول کیا"

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

"آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ ہجری اور ۱۸۰۱ء کے ہیں اور سلطنت قایم ہے، اُسی بادشاہ دشمن
دل خدا پرست سے ....."

پھر اس کے بعد نواب سعادت علی خاں بہادر کا ذکر کیا ہے، اور بعد ازاں مارکوئس آف ولزلی عالی مقام
کی نسبت یہ لکھتے ہیں:-

"موافق حکم اس صاحب والا مناقب کے، کہ نام نامی اور اسم گرامی اُس کا اوپر مذکور ہو چکا ہے، اس
ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا:"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تذکرہ مؤلف نے ۱۸۰۱ء میں ترتیب دیا، اس کے مادہ تاریخ سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ۱۲۱۵ ہجری میں لکھی گئی۔

"حیراں پھری ہیں بے سر و پا بہمن اور دے"
"تاریخ اس کی جب سے کہ رشکِ بہشت ہے"
۱۲ - ۱۲۲۶ = ۱۲۱۵ ہجری

اور غالباً یہی سال اختتام تذکرہ کا بھی ہے۔

دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس فرمایش کے بعد نہیں، تو اول ضرور حیدرآباد میں تشریف رکھتے تھے، کیوں کہ ان کے کلام میں وہ قصاید درج ہیں جو انہوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ، اور میر عالم کی مدح میں لکھے تھے۔ اعظم الامرا مرہٹوں کی قید سے نجات پانے کے بعد دوبارہ ۱۷۹۷ء میں وزیر مقرر ہوئے، اور مئی ۱۸۰۴ء میں انتقال کر گئے۔ ان کے بعد اسی سال میر عالم وزیر ہوئے، اور ۱۸۰۸ء میں وفات پائی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤلف اس زمانے میں حیدرآباد چلے گئے تھے۔ چوں کہ ان کو زیادہ تر یا تو انگریزوں سے سابقہ رہا ہے، یا اہلِ حیدرآباد سے، اس لئے انہوں نے ایک شعر میں اس حقی کو بڑی خوبی

[1] ڈاکٹر جان گلکرسٹ ۱۲

سے ادا کیا ہے، کہتے ہیں:-

"ہوا آوارہ ہندستاں سے لطف آگے خدا جانے
دکن کے سانولوں نے مارا یا انگلن کے گوروں نے"

جو قصیدہ اُنھوں نے اعظم الامرا ارسطو جاہ کی مدح میں لکھا ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی وہ فراغ بال اور خوش حال تھے، اور دکن میں جاکر ارسطو جاہ کے ہاں ڈیڑھ سو روپیے ماہانہ کے ملازم ہو گئے تھے، مگر اس تنخواہ سے خوش نہیں تھے، اضافے کی درخواستیں اور بڑے زور سے کرتے ہیں:-

کل ہی کی بات ہے، یہ مسافر وطن میں تھا
سو وہ سو آشنا کا حقِ بندگی گزار

شکرِ خدا، کہ آج بیک بینی و دو گوش
گرچہ دکن میں ہے، نہیں ہر سپو لوزنار

ہر چند ہے تری ہی عنایت سے یہ سکوں
لازم وگرنہ تھا بشریت کو اضطرار

اس سامعہ خراشی سے مجھ کو جو ہے غرض
سو یہ ہے، اے امیرِ فلک قدر و کے تبار

سرکار سے تری جو زراہِ تفضلات
ہے ڈیڑھ سو روپے ترے خادم کا ماہوار

ہر چند جائے شکر ہے، پر عرض کیا کروں
جس طرح اس میں کاٹتا ہوں لیل و نہار

ہے گفتگو پچاس تو ہن ڈیڑھ سو میں سے
ہو کر سوار چھاتی پہ لے جاتے ہیں کہار

مخلوقِ خدا کا بار اُٹھاتی ہے پالکی
میں اپنی پالکی کا ہوں برعکس زیر بار

باقی جو سو ہے، کئی دن میں زباں پہ ہم
مثلِ مجرّداتِ نقطان کا ہے شمار

تجھ سا ہو قدردانِ نکات، اور یہ نکتہ سنج
یوں ہو اسیرِ پنجۂ چرخِ ستم شمار

فضل و ہنر جو مجھ میں ہے وہ سب یک طرف
اہلِ قدردانیاں بھی تری سب یہ یک کنار

ہے ہمتِ بلند کا تیری جو اقتضا
اس امر میں تو ہے تجھے آیندہ اختیار

آزبس کہ کم دماغ ہوں ضیقِ معاش سے
بالفعل تو اضافے کا ہوں گا اُمیدوار

لیکن نہ وہ اضافہ جو ہو مرے برائے نام
کہ فرہوں سو پچاس میں گر ہو کشودِ کار

تصنیف مِل چاہتا ہے تجھ سے ضیف	کیوں کر یہ بے حیائی نہیں ہوتی بلہا
غالب ہے تجھ پہ شاق نہ ہوں تیرے تین سو	پھ سوجب اُنھیوں کو تو دے بلکہ چھ ہزار

جو شکایت شاعر نے اخیر شعر میں کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں قدیم سے چلی آ رہی ہے، اور اب تک باقی ہے ✦

پھر اس قصیدے میں شاعر نے تعلی کی لی ہے، اور ناصر علی کا ذکر کیا ہے کہ ذوالفقار خاں کے پاس اس نے قصیدہ کہا اور صرف اس کے اس مطلع پر ✦

"اے شان حیدری زجبینِ تو آشکار
نام تو در نبرد کند کار ذوالفقار"

امیر الامراء نے زر وسیم نثار کیا۔ پھر اس مطلع کو پڑھ کر کہتا ہے کہ اس میں کیا رکھا ہے:-

"غیر لفظ ذوالفقار نہیں اس میں کوئی بات — ایسی کہ ڈال دیویں سپر جس کے آگے یار
تحسین قدردانی میں لیکن بڑے تھم — انعام ہی سے لگیا جو خانِ باوقار"

اور پھر خود اس مطلع کا جواب لکھتا ہے:-

"کہتی ہے فارسی میں بھی مطلع — ہاں در جواب مطلع ناصر علی بیار
اے فدیہ ہا زنام تو خورشید اعتبار — تاثیر اسم اعظم از اسم تو آشکار"

کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس میں بھی سوائے لفظ اعظم کے اور کیا رکھا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ باوجود اس کے یہ مطلع ناصر علی کے مطلع کو نہیں پہنچتا ✦

میر عالم بہادر کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس میں بھی یہی رونا رویا ہے،

"پر اتنی عرض اے حاجت روائے خلق ہے تجھ سے — کہ میں خواہاں نہیں کچھ ملک و کوس و طبل و لشکر کا
توجہ اتنی فرما تو کہ ما یحتاج کی رو سے — نہ ہوں محتاج عند الوقت سیم و زر و گوہر کا"

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ اپنے تذکرہ شعرا گلشن بیخار میں لکھتے ہیں کہ:-

"میرزا لطف کچھ روز نواح عظیم آباد میں بھی رہے ہیں، اور نسبت شاگردی میر تقی سے رکھتے ہیں۔"

لیکن خود میرزا لطف اپنے حال میں یہ لکھتے ہیں:۔

"اور شعور ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع نا صواب سے ہے"

اور اسی کو صحیح سمجھنا چاہیئے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ میر تقی کے بہت بڑے مداح اور ماننے والے ہیں، اور غالباً اسی وجہ سے وہ ان کی شاگردی سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔

لطف ایک معمولی شاعر ہیں، غزل و قصیدہ و مثنوی سب کچھ لکھا ہے، مگر کلام میں لطف نہیں ہے۔

البتہ یہ تذکرہ اُن کا ایک ایسا کارنامہ ہے، جو اردو زبان میں قابل یادگار ہے۔ چوں کہ انگریز با اقتدار کی فرمایش سے لکھا ہے، زبان صاف اور سادہ ہے، تاہم قافئے کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ تذکرے اگرچہ اَور بھی لکھے گئے ہیں، مگر اس میں بعض خصوصیتیں ایسی ہیں کہ جس سے یہ درحقیقت قابل قدر ہے۔

۱۔ اوّل تو سو برس پہلے کی زبان ہے، جس سے زبان کے متعلق بہت کچھ پتہ لگ سکتا ہے، اور محقق علم اللسان کو، اور نیز اُن لوگوں کو جنہیں زبان کا چسکا ہے، بہت کچھ نئی باتیں معلوم ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ ایک ظاہر بات جو ہمیں عام طور پر اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوئی، وہ یہ ہے، کہ دکن کی زبان میں بعض الفاظ جو روزمرّہ بول چال میں آتے ہیں، اور ہندوستانیوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں، وہ درحقیقت پرانی زبان کی یادگار ہیں۔ مثلاً "کرکے" کا خاص استعمال، جو ہم یہاں ہر روز سنتے ہیں۔ اس تذکرے میں بھی جا بجا پایا جاتا ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:۔

"شورش تخلص، متوطن عظیم آباد کے، مشہور میر بھنا کرکے تھے۔"

اسی طرح میر قمرالدین منّت کے حال میں لکھا ہے:۔

"چنانچہ شکرستان کرکے، ایک نسخہ اس شیریں مقال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے"

دکن میں بعض لوگ "بعد میں" کی جگہ "بعد از" بولتے ہیں، سودا نے ایک شعر میں یہی لفظ لکھا ہے۔

"ہے جیتے جی تو مجھے کوئے یار میں رونا ۔۔۔ رہے گا مرگ کے "بعداز" مزار میں رونا"

فعل کے بعض استعمال بھی بعض اوقات باطل ایسے ہیں جو ہم حیدرآباد میں اکثر سنتے ہیں۔ مثلاً فعل متعدی میں فعل بہ لحاظ مفعول کے آتا ہے، مگر اس کتاب میں بعض جگہ فاعل کے لحاظ سے آیا ہے۔ دکن میں عموماً اسی طرح بولتے ہیں۔ ضیا کے حال میں لکھا ہے:۔

"میر تقی سے جبکہ لکھنؤ میں آئے تو طور سکونت کا دیں ٹھیرے۔"

یہ فقیر کے تذکرے میں لکھتے ہیں:۔

"پھر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے۔"

دکن میں عام طور پر "میں کہا" بولتے ہیں، قایم کہتے ہیں:۔

"میں کہا 'عہد کیا کیا تھا رات'،

"ہنس کے کہنے لگا کہ 'یاد نہیں'۔"

۲۔ دوسرے علاوہ اس کے کہ مؤلف ایسے زمانے میں تھا جب کہ اردو زبان عروج پر تھی، اور بڑے بڑے اساتذہ زندہ تھے، مؤلف ان کا ہم عصر تھا، اور ان میں سے اکثر سے ان کی شناسائی اور دوستی تھی، اور اس لئے جس وثوق اور صحت کے ساتھ اُن کے حالات یہ لکھ سکتا ہے دوسرا نہیں لکھ سکتا۔ اور بعض حالات تو ایسے لکھے ہیں جو کہیں دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آئے۔ مثلاً رزیڈنٹ لکھنؤ کا میر تقی کو فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں زبان ریختہ میں تالیف و تصنیف کے لئے طلب کرنا، اور بوجہ پیرانہ سالی اُن کا منتخب نہ ہونا۔ یا میر صاحب ہی کے حال میں ایک ایسا فقرہ لکھا ہے جس کا دل پر بہت اثر ہوتا ہے، اور جو صرف اس تذکرے کا مؤلف ہی لکھ سکتا تھا، کیوں کہ وہ ان کا دیکھنے والا تھا اور خاص ارادت رکھتا تھا۔ علاوہ اس کے اس سے میر صاحب کی اس خاص وضع اور طبیعت کا اندازہ بھی ہوتا ہے، جو انہوں نے عمر بھر نباہی۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ناقدردانی سے اغنیا کی، اور نابجی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوائے سخنرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر، جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی

"بیان میں سحانی پروانے سے مقال کا، وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں پوچھتا اُس کی رنج ہے"

شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنی کتاب آبحیات میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جب میر صاحب لکھنؤ گئے تو نواب آصف الدولہ نے دو سو روپیہ مہینہ کردیا، مگر چوں کہ بد مزاج انتہا درجے کے تھے

نواب سے بگاڑ کرلیا اور گھر بیٹھ رہے، اور زندگی فقر و فاقے میں گزار دی"

مگر اس تذکرے کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صحیح نہیں، کیوں کہ اس میں لکھا ہے کہ:

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے روز ملازمت خلعت فاخرہ دیا، اور تین سو روپیہ مشاہرہ مقرر کرکے تحسین

ناظر کے سپرد کردیا، اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی بعد چندے صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں

قصور نہ ہوا، اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج کے دن تک، کہ ۱۲۲۱ھ ہجری ہیں، وہی حال

ہے جو اوپر مذکور ہوا"

مگر صاحب تذکرہ کا چند سطر اوپر یہ لکھنا کہ وہ نانِ شبینہ کا محتاج ہے یا تو مبالغہ ہے، یا یہ ہے کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں اُن کے کمال کی پوری قدر نہ ہوئی۔ غرض یہ کہ بعض باتیں اس میں نئی نظر آتی ہیں۔

۳۔ تیسرے، صاحب تذکرہ نے ایک یہ کام بھی بہت اچھا کیا ہے، کہ جن لوگوں کو تھوڑا یا بہت یا کسی قدر تعلق سلطنت سے رہا ہے، ان کے تذکرے میں تاریخی حالات بھی خوب خوب لکھے ہیں۔ چنانچہ شاہ عالم المتخلص بہ آفتاب کے حال میں ان کا بزمانہ ولی عہدی عماد الملک کے خوف سے دلی چھوڑنا، باپ کا دھوکے سے فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل ہونا، اور ان کا ۱۱۷۳ھ ہجری میں تخت نشین ہونا، رام نرائن سے جنگ، دلیر خاں کی دلیری اور جان نثاری، فتح و نصرت کا حاصل ہونا وغیرہ وغیرہ، بالتفصیل لکھا ہے۔ اور اخیر میں کور نمک سنگدل غلام قادر خاں روہیلے کا دردناک واقعہ بھی درج کیا ہے؛ اور بادشاہ کی دردناک غزل بھی نقل کردی ہے، جس میں یہ واقعہ منظوم ہے، اور خود اُردو نظم میں ترجمہ کرکے متن میں درج کی ہے، اس لئے کہ تذکرہ اُردو کا ہے، اور اصل غزل حاشیے پر لکھ دی ہے؛ البتہ اتنا تکلف کیا ہے۔ اسی طرح تاناشاہ، آصف الدولہ، اور

مرزا محمد رضا اُمیدؔ کے حالات میں اکثر تاریخی واقعات اور قصص لکھے ہیں۔ خصوصاً میرزا محمد رضا امیدؔ کے تذکرے میں ، امیر الامرا حسین علی خاں ، اور ان کے بھائی کے حالات بڑی خوبی سے تحریر کئے ہیں۔ ہم چوتھے اس کتاب سے زمانے کی سوسائٹی پر بھی روشنی پڑتی ہے ، اور یہ بات تو صاف صاف نظر آتی ہے ، کہ ہمارے شاعروں کا گروہ عجیب بے فکرا تھا ، اور دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہ تھی۔ اخیر میں جب ہمارے بادشاہ نواب اور امرا اس طرف جھکے ، تو وہ بھی ایسے ہی ہوگئے۔ ان لوگوں نے رہا سہا انہیں ، ور ڈبو دیا۔ ملک گیری اور ملک داری کبھی کی جا چکی تھی ، اس لئے اولوالعزمی اور ہمت بھی اس کے ساتھ ہی رخصت ہوگئی۔ جسمانی اور دماغی قویٰ میں انحطاط پیدا ہوگیا تھا ، ایسی حالت میں حقیقی مسرت کہاں! البتہ عارضی خوش حالی اور جھوٹی زندہ دلی موجود تھی ، شعر شاعری نے اس کا سامان اَور مہیا کر دیا ، دیوانہ را ہوئے بس است ، شاعروں کی بن آئی ، وہ تو اس شغل میں رہے ، اور یہاں کام تمام ہوگیا۔ اس زمانے کی سب سے بڑی علمی اور مہذب مجلسیں مشاعرے تھے ، جن کے لئے بڑے بڑے اہتمام کئے جاتے تھے ، اس کے خاص خاص آداب تھے ، بڈھے بوڑھے نوجوان بچے سب ہی شریک ہوتے تھے ، باکمال سخن وروں کو دل کھول کے داد دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی بحث مباحثے ہوتے ہوتے لڑائی جھگڑے ہو جاتے ، اور دھکا فضیحتی تک نوبت پہنچ جاتی تھی۔ نوجوان ان مشاعروں میں شریک ہوتے ، اور اپنے کانوں سے تحسین و آفرین کے نعرے سنتے تھے جو شعرا کے لئے سب سے بڑی داد اور سب سے بڑا انعام تھا ، تو ان کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوتی تھی ، کسی اُستاد کے پاس حاضر ہوئے ، شاگرد ہوگئے ، اور شعر کہنا شروع کر دیا۔ گویا شعر کہنے کے لئے صرف کسی اُستاد کا شاگرد ہو جانا کافی ہے۔ یہ مشاعرے درحقیقت شاعر گر تھے۔ میں ان مشاعروں کو بُرا نہیں سمجھتا مگر جہاں یہی سب سے بڑی علمی اور ادبی مجالس ہوں تو ایسی سوسائٹی کی حالت کیا ہوگی؟

علاوہ اس عام حالت کے ، تذکرے میں جو بعض باتیں ضمناً بیان کر دی ہیں ، وہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ ایک واقعہ ، جس کا مجھ پر بھی اثر ہوا ، یہ ہے کہ نواب وزیر اودھ اُس زمانے میں جب کہ ان کا عروج اقبال تھا ، اور بادشاہ نام کے بادشاہ رہ گئے تھے ، تب بھی شاہانِ دہلی اور ان کے

گھرانے کی بے انتہا تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اور تعظیم بھی ایسی کہ آج کل کے نوجوانوں کے خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ چنانچہ میرزا جواں بخت جہاندار شاہ کے حال میں لکھا ہے کہ وہ ۱۱۹۸ھ ہجری میں دلی سے لکھنو چلے آئے تھے۔

"نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب آداب و خدمت گزاری کے تھے، سب ادا کئے، خواصی میں بیٹھ
"کے سوا گھڑیوں ہاتھ باندھے سامنے کھڑے رہے، باوصف اس نازبرداری کے کہ کبھی پیادہ قدم کاہے کو
"چلے تھے پانچوں ہتھیار باندھے ہوئے ایک لاکھ کی ہو گھوڑی کی پیش کش پر دس دس مرتبہ جھک کر پرے جاکر آداب بجالائے"

۵۔ پانچویں، بعض ایسے لوگوں کا حال بھی دیا ہے جس کی نسبت اردو کی شاعری کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کوئی کہہ سکتا ہے کہ شاہ ولی اللہ اردو کے شاعر تھے۔ اور ان کا تخلص اشتیاق تھا یا عبد القادر بیدل بھی اردو میں شعر کہتے تھے۔ یا تانا شاہ سے بھی ایک شعر منسوب ہے، جو آدھا اردو اور آدھا ہندی ہے۔ بعض ایسے شعرا کا بھی کلام درج ہے کہ جن کا نام تو بہت مشہور ہے مگر کلام دستیاب نہیں ہوتا۔ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد اپنے تذکرہ آبحیات میں لکھتے ہیں کہ:-

"ایک موقع پر میر حسن مرحوم کا سفر شاہ مدار کی چھڑیوں کے ساتھ اتفاق پڑا؛ چنانچہ سفر مذکور کا حال ایک مثنوی کے
"قالب میں ڈھالا ہے، اس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنو کی ہجو کی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے
"کہ اس وقت عورتوں کی پوشاک وہاں کیا تھی، اور چھڑیوں والوں کے جزئیات رسوم کیا کیا تھے۔ میں نے
"یہ مثنوی دلی کی تباہی سے پہلے دیکھی تھی، اب نہیں ملتی، لوگ بہت تعریف لکھتے ہیں"

حسن اتفاق سے صاحب تذکرہ نے اس مثنوی کا وہ حصہ، جس میں فیض آباد کی تعریف اور لکھنو کی ہجو ہے۔ میر حسن کے حالات میں نقل کر دیا ہے۔ ناظرین کو لکھنو کی ہجو میں یہ شعر دیکھ کر بہت تعجب ہوگا

"زبس کوفے سے یہ شہر ہم حد ہے　　اگر شیعہ کہے نیک اس کو بد ہے"

اس مثنوی کا نام غالباً گلزار ارم تھا۔ میر حسن کے دوسرے کلام کا بھی انتخاب کیا ہے: "در حقیقت کلام سب اچھا ہے، مگر افسوس آج کل نہیں ملتا۔"

خواجہ میر درد کے بھائی میاں سید محمد میر اثر، کی مثنوی خواب و خیال اب تک سنی ہی سنی تھی، اس کے

چند شعرا اثر کے حالات میں بیچ ہیں شمس العلما مولوی شبلی نے اس پر مفصلہ ذیل نوٹ لکھا ہے[۵]، جو کتاب کے صفحہ ۳۴ پر درج ہے:

"مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوق کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چوں کہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہو سکتی، اس لئے اس کی وجہ یہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثر کی مثنوی دیکھی تھی، اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کر سکتے ہیں، کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہو سکتی ہے۔"

ہمیں تعجب ہے، کہ مولوی شبلی صاحب نے صرف "اعتراف" کا لفظ لکھا ہے، حالاں کہ مولانا حالی نے ان مثنویوں کی بے حد تعریف کی ہے، سوائے ایک نقص کے جس سے خود مولوی شبلی صاحب کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، اور یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا کی شاعری کا اعتراف کیا ہے" بلکہ میر انیس کی شاعری کی اس قدر توصیف و ثنا کی ہے کہ اس سے بڑھ کر ممکن نہیں، یہاں تک کہ خود مولوی شبلی صاحب نے بھی موازنہ دبیر و انیس میں انہیں اتنا نہیں سراہا۔ اکثر لوگوں کو جن کی نظر ظاہر بیں ہے اور سطح ہی پر رہتی ہے، مولانا حالی سے یہ شکایت ہے کہ لکھنؤ کی شاعری کی مذمت کی ہے حالاں کہ مولانا نے کہیں اپنے دیوان میں لکھنؤ کی شاعری پر بحث نہیں کی عام شاعری پر، یا اُردو شاعری کے نشو و نما اور اُس کے مختلف اصناف پر بحث کرتے ہوئے تمثیلاً بعض اشعار یا کتب کا ذکر آگیا ہے، اور اس میں دلی لکھنؤ والے دونوں ہیں، اس پر سے لوگوں نے ایسا گمان کر لیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مقدمہ دیوان حالی میں کوئی خاص لحاظ اس کا نہیں کیا گیا۔ اصل بات یہ ہے کہ ہمارے اہل وطن اپنی اور اپنے یار دوستوں یا عزیزوں یا بزرگوں کی کتاب پر تقریظ سننے کے شائق ہیں تنقید کے روادار نہیں۔ مولانا حالی نے جو شاعری پر مقدمہ لکھا ہے، وہ صرف ان کے دیوان کا مقدمہ نہیں، بلکہ اُردو میں فن تنقید کا پہلا مقدمہ ہے۔ اس میں جو بعض ایسی رایوں کا اظہار کیا ہے، جو صرف ذوق سلیم اور عالی دماغ کا نتیجہ ہو سکتی ہیں، تو لوگوں کے عام، (بلکہ عامیانہ) خیالات کو صدمہ پہنچا، اور وہ بت جنہیں وہ مدت سے پوجتے چلے آ رہے تھے، یکایک متزلزل ہو گئے، اور ڈھ گئے۔ زیادہ تر یہ خیال گلزار نسیم کی نکتہ چینی سے پیدا ہو گیا ہے۔ مولانا نے اس کی

[۵] شمس العلما مولوی شبلی نے از راہ نوازش اس تذکرہ پر جا بجا نوٹ تحریر فرمائے ہیں۔

خواہ مخواہ اس لئے نکتہ چینی نہیں کی کہ وہ ایک لکھنوی کی لکھی ہوئی ہے، بلکہ درحقیقت وہ اُس رتبے کی مستحق نہیں ہے جو لوگوں نے ناسمجھی سے اُسے دے رکھا ہے۔ مجھے تو اُلٹی یہ شکایت ہے کہ مولانا نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، صرف چند ایسی غلطیوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے، جو اگرچہ صریح اور بیّن ہیں، مگر اس قدر اور ایسی نہیں کہ جس سے اُس کی پوری قلعی کھل جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی کو اُردو زبان سے کچھ تعلق ہی نہیں، مولانا کا اگر اس میں قصور ہے تو صرف اتنا کہ انہوں نے دن کو دن اور رات کو رات کہہ دیا ہے۔ اب ہم خواجہ اثر کی مثنوی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں

اول تو اس مثنوی کی تعریف سب کرتے چلے آتے ہیں، چنانچہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سا سخن فہم اپنے تذکرہ گلشن بیخار میں لکھتا ہے :۔

"مثنوی بعنوان شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورہ بحت است، واین بحت مرغوب عام"

مولوی محمد حسین آزاد آب حیات میں کہتے ہیں کہ :۔

"ایک مثنوی خواب و خیال ان کی مشہور ہے، اور بہت اچھی لکھی ہے"

دوسرے ان کے کلام سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، کیوں کہ اس میں درد، زبان کی صفائی، شستگی اور لطافت بدرجۂ کمال موجود ہے، اور یہ سب باتیں مثنوی کے لئے خاص طور پر مناسب ہیں۔ مگر صاحب تذکرہ نے غضب یہ کیا ہے، کہ مثنوی کا وہ حصہ منتخب کیا، جس سے کسی طرح صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا سراپا کا مضمون اس قدر مبتذل ہے کہ اس میں کوئی نیا مضمون پیدا کرنا، یا اس میں زبان کی فصاحت و سلاست دکھانا بہت مشکل ہے۔ اور چوں کہ اس مثنوی کی تعریف زیادہ تر زبان کی ہے، اس لئے صرف سراپا کے چند اشعار پر سے حکم لگانا درست نہیں ہے۔ صاحب تذکرہ نے اپنے اس ذوق کا ثبوت آدھ بھی ایک آدھ جگہ دیا ہے، مثلاً جوشش کے کلام کو پسند نہیں کرتا، مگر انتخابی اشعار بہت اچھے ہیں۔ اسی طرح مصحفی کی تعریف کی ہے، لیکن انتخاب اس قدر خراب دیا ہے کہ اس سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ کوئی اچھا شاعر ہے لیکن اس کا کیا جواب ہے، کہ جو شعر خواجہ اثر کا بہ تبدیل لفظ شوق نے اپنا کر لیا ہے، یعنی :۔

اثر   ہاتھا پائی میں ہاسے نبتے جانا   کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا

شوق ... اتھا پانی میں ہا نپتے جانا   چھوٹے کپڑوں کو دُھانپتے جانا

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ایسا شعر یا خواجہ اثر کہہ سکتے تھے یا ان کے بعد نواب میرزا شوق، اگر یہ شعر ان کا ہے تو یہ کہنے کی پوری وجہ ہے، کہ شوق کی نظر سے یہ مثنوی گزری ہے، تو اس طرز کا اثر ضرور اس پر پڑا ہوگا۔ مولٰنا حالی فرماتے ہیں :-

"خواب وخیال کے اکثر مصرعے اور شعر تھوڑے تھوڑے تفاوت سے بہار عشق میں موجود ہیں"۔

یہ ایک مزید ثبوت ہے۔

دوسرے یہ بھی خیال رکھنا چاہئے کہ وہ مثنوی اُس زمانے میں لکھی گئی جب کہ اُردو میں غالباً کوئی مثنوی نہ تھی۔ باوجود اس کے مولٰنا حالی نے صاف لکھ دیا ہے :-

"اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالت میں خواب وخیال کو بہار عشق سے کچھ نسبت نہیں ہو سکتی"۔

اخیر اس میں تو ظاہراً ایک حد تک کچھ گنجایش بھی نظر آتی ہے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ مولوی شبلی صاحب نے اس سے بڑھ کر ایک ریمارک مولٰنا حالی کی تنقید گلزار نسیم کے متعلق ایک خط میں لکھ دیا تھا جسے لالہ ریک بست سہے صاحب نے اپنے دیباچہ گلزار نسیم میں بطور سند کے درج فرمایا ہے تعجب ہے کہ ایک ایسے فاضل محقق اور صاحب ذوق قلم سے ایسے الفاظ نکلیں جو تحقیق اور ذوق سلیم سے کوسوں دور ہیں۔ اور خصوصاً ایسی کتاب کی نسبت جو قطع نظر اس کے کہ اس میں زبان کا لطف نام کو نہیں سیکڑوں نقلی اور معنوی غلطیوں سے پُر ہے۔ ہم اس موقع پر زیادہ بحث کرنا نہیں چاہتے، اور اس بحث کے لئے بھی ناظرین سے معافی چاہتے ہیں موقع آپڑا تھا اس لئے یہ چند الفاظ لکھے گئے۔

۶۔ چھٹے، صاحب تذکرہ نے بعض مقامات پر پردے ہی پردے میں خوب چوٹیں کی ہیں؛ جن میں تعصب کی جھلک نظر آتی ہے؛ مثلاً: شاہ ولی اللہ صاحب کی نسبت لکھا ہے کہ:۔

"قرۃ العین فی ابطال شہادت الحسنین اور جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ ان کی تصانیف سے ہیں"۔

حالاں کہ ان مباحث میں ان کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ نہ شہادت حسنین کا ابطال کیا ہے، نہ مناقب معاویہ میں کوئی کتاب لکھی ہے، یہ محض اتہام ہے۔ اس کے بعد یہ کہ کر کہ یہ والد ہیں شاہ عبدالعزیز کے "خوب ہجو ملیح کی ہے"؛ اور آخر میں یہ لکھا ہے:۔

"کیوں نہ ہوآخر کیسے باپ کا بیٹا ہے، فی الواقع لئالی منظوموں کے عالی منصب ہوتے ہیں سونا بگلا دوں کے ناکارہ بقول شاعر کہتے

شیر کے بچے میں خوش شبہ اے منعم   بھونکتے ہیں کتے کی بھی تو آگی موجود ہے"

یا مظہر جان جاناں کے حالات میں لکھتے ہیں :-

"سنہ ۱۱۹۵ ہجری تھے کہ اس روشن ساز مسائل صدیقی نے، اور اس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے، اس آئینہ رُخسار کو دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کی منازل کے طریق پر کیا"

یا تانا شاہ کے حالات میں مؤلف عالمگیر کی نسبت یوں گوہر فشانی کرتا ہے کہ :-

"خلد مکان نے استیصال بادشاہان دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا۔ خلد مکان کی حرکت کا لکھنا تو مکہ مسجد کا کھدوانا نرا بہتان اور صریح جھوٹ ہے۔ تعجب ہے کہ مؤلف نے جو خود حیدر آباد میں رہا ہے، اس کذب کا لکھنا کیوں کر گوارا کیا۔ ہمیں شاید ناظرین کو یہ اطمینان دلانے کی ضرورت نہیں۔ کہ مکہ مسجد موجود ہے اور اب تک نظر بد سے محفوظ ہے۔

لیکن قطع نظر ان امور کے وہ بعض وقت سچ کہنے سے بھی درگذر نہیں کرتا، مثلاً نواب آصف الدولہ کے حالات میں ان کی داد و دہش اور مروت کی بے انتہا ستائش کی ہے، لیکن آخر میں صاف لکھ دیا ہے:-

"افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی، تابعوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ سیر و شکار سے کام رکھا ہمیشہ کوئی واقف اہل کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رُتبہ نام کا نہ پایا"

یا سراج الدین علی خاں آرزو نے، جو نکتہ چینی شیخ علی حزیں کے کلام پر کی ہے، اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ

"عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے، نہیں صاف نزاع معلوم ہوتی ہے، جب بایک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے"

اس تذکرے کے پڑھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اکثر شاعر اور خصوصاً نامور اور مشہور اساتذہ سب کے سب دلی کے تھے۔ دلی کو جہاں یہ فخر ہے کہ اردو نے اس میں جنم لیا، وہاں اس کا یہ فخر بھی بجا ہے کہ جتنے اعلیٰ شاعر ہوئے ہیں وہ یہیں کے تھے۔ اگر تاریخ پر نظر ڈالی جائے یہ شہر بھی عجیب و غریب نظر آتا ہے، زمانہ قدیم سے محسود آفاق اور مرجع خلایق رہا، کبھی راجاؤں اور مہاراجاؤں کی راج دہانی، کبھی سلاطین

اسلام کا دارالخلافت کبھی طغیانی کی بدولت بگڑ کر خراب ہوا اور رفتہ رفتہ پھر آباد ہوا؛ کبھی معرکۂ جنگ وجدل وقتل عام ہے، اور کبھی گھر گھر دن عید اور رات شب برات ہے؛ کبھی تخت گاہ شاہان اور مرجع کمال سب، اور کبھی ایک مطلق العنان سودائی کی لٹک سے خاصہ کھنڈر ہے؛ کبھی مورد بلیات وآفات ہے، اور کبھی منزل حسنات وبرکات؛ غرض یہ نگری یوں ہیں اجڑتی اور بستی، بگڑتی اور بنتی رہی؛ مگر باوجود اس کے اس کے حسن عالم فروز میں نئی ادا پیدا ہوتی رہی، اور ہر حادثے کے بعد فوراً سنبھل گئی لیکن اخیر زمانے میں جب سلطنت مغلیہ میں انحطاط اور زوال کی علامات پیدا ہو گئیں، تو وہ ایک دھچکے ایسے لگے کہ پھر پنپنا محال سب سے اول نادر شاہ کا ایسا تھپیڑا لگا، کہ اس نے بٹھا ہی تو دیا، اس کے سترہ برس بعد ہی احمد شاہ ابدالی کی چڑھائی ہوئی؛ پھر مرہٹوں نے وہ اودھم مچائی کہ رہا سہا سب خاک میں ملا دیا، اب تک جو باکمال دلی میں پڑے وضعداری نباہ رہے تھے۔ ان حادثوں کے بعد وہ بھی نہ ٹک سکے۔ سوائے ایک میر درد کے جن کی نسبت صاحب تذکرہ لکھتے ہیں:

"جس ایام میں معمورۂ شاہجہان آباد کا ہر ایک کوچہ اس خجستہ بنیاد کا مجمع اہل کمال سے، اور بکثرت متمنان عدیم المثال تھے، رشک ہفت اقلیم اور غیرت جنت النعیم تھا، تو معمورے پر شہر کے عرصہ ربع مسکوں کا تنگ، اور اس خراب آباد کو تشبیہ سے ہفت اقلیم کے ننگ تھا۔ جب کہ متواتر نزول آفات کے باعث، اور مکروہ و بلیات کے سبب خراب ہوا، اور معمورۂ عقوبت معذاب ہوا تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے، اور ہر ایک صاحب بنا جاگیرین نے اور ہر ایک متمول الدامنے، اور ہر امیر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا، اور بھاگے اُدھر کو جدھر پایا ٹھکانا، مگر وحید الاعتبار، کہ تلم نامی اُس کا خواجہ میر تھا، اس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے، اور حامل جفاؤں کے ہوئے؛ اور شاہجہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم راہ اپنے کنج عزلت سے نہ گئے۔"

ایسے وقت میں شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں، بڑے بڑے وضعداروں اور متوکلوں کی ٹھیک نکل جاتی ہے۔ دلی کے اجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا۔ اقبال نے کچھ دنوں اس کا ساتھ دیا، اب دے کے صرف یہی ایک ٹھکانا اور آسرا مسلمانوں کا رہ گیا تھا: آصف الدولہ سا لکھ لٹ نواب تھا، اہل کمال کی قدر ہونے لگی، پھر تو جو تھا وہیں پہنچا، اور پہنچ کر وہیں کا ہو رہا۔ غالباً سب سے پہلے نادر شاہ کی تباہی کے بعد سراج الدین علی خاں آرزو پہنچے، اس کے بعد سودا تشریف لے گئے؛ سودا کے انتقال کے بعد میر تقی نے ۱۷۸۲ء میں دلی سے لکھنؤ کو کوچ فرمایا

میر صاحب کے جاتے ہی دلی سونی ہو گئی، اور میر حسن، میر سوز، جرأت، سب لکھنؤ میں جا بسے، اور دلی کی رونق لکھنؤ میں آگئی اس طرح لکھنؤ کی شاعری کی ابتدا ہوئی، اب یہاں لکھنؤ کی سوسائٹی کا اردو زبان اور اردو شاعری پر کیا اثر ہوا اس وقت اس سے ہماری بحث خارج ہے

مجھے خیال تھا کہ اس تذکرے سے میر انشاء اللہ خان کے متعلق کوئی نئی بات معلوم ہوگی اور کم سے کم اس قصے کی تحقیق ہو جائے گی جو شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد نے ان کے آخر زندگی کے متعلق لکھا ہے، مگر یہ تذکرہ ۱۲۲۱ ہجری میں لکھا گیا، اور ۱۲۲۱ھ تک میر انشاء اللہ خاں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے، یا اسی سال نواب سعادت علی خاں کے ہاں رسائی ہوئی، کیونکہ مرزا سلیمان شکوہ اسی سال (۱۲۲۱ھ) لکھنؤ سے واپس دلی چلے گئے۔ یہ واقعہ آزاد نے سعادت یار خاں رنگین کی زبانی بیان کیا ہے، صرف یہ لکھ کر تمام واقعہ بیان کر دیا ہے کہ "سعادت یار خاں رنگین کہا کرتے تھے" مگر یہ نہ معلوم ہوا کس سے کہتے تھے، اور آزاد نے کس سے سنا۔ آب حیات میں بعض بعض جگہ وہ مجالس رنگین کا حوالہ دیتے ہیں، مگر مجالس رنگین میں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں ہے۔ اتفاق سے مجالس رنگین بھی ۱۲۲۱ھ میں لکھی گئی، میر انشاء اللہ خاں اور سعادت یار خاں رنگین دونوں مرزا سلیمان شکوہ کے ہاں ملازم تھے۔ اور چونکہ یہ واقعہ بہت بعد کا ہے اس لئے یوں بھی اس میں نہیں ہو سکتا۔ کیا اچھا ہوتا اگر مولوی محمد حسین آزاد اس روایت کا سلسلہ بیان کر دیتے۔

مولف نے اپنے دیباچہ میں بیان کیا ہے:-

"یہ کتاب ہم نے دو حصوں میں لکھی ہے، یہ پہلا حصہ ہے جس میں سلاطین نامدار، امرائے عالی مقدار، اور شعرائے صاحب اقتدار کے حالات لکھے گئے ہیں، اور دوسری جلد میں غیر مشہور شعرا کا تذکرہ ہوگا"

اس دوسری جلد کے متعلق ہمیں کوئی اطلاع نہیں کہ لکھی گئی تھی یا نہیں۔

مولف نے شعرا کا کلام جو بطور انتخاب کے درج کیا ہے اس میں اتنا تصرف کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے کلام چھپ چکے ہیں ان کے انتخابی کلام کو پبلشر نے کم کر دیا ہے، صرف اعلیٰ درجہ کے اشعار رکھے ہیں، مگر جن شعرا کا کلام نہیں چھپا ان کے کلام کو بجنسہ ویسا ہی رہنے دیا ہے۔ خود مولف نے اپنے کلام سے صفحے کے صفحے رنگ دیئے تھے، اس میں بھی انتخاب کر دیا گیا ہے۔

اب مجھے اس تذکرے کے متعلق اس قدر اور کہنا باقی ہے کہ اس کے طبع ہونے سے اردو لٹریچر میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا، اور جو لوگ اردو زبان کی ترقی کے خواہاں ہیں وہ ضرور اس کی اشاعت میں کوشش فرمائیں گے۔

عبد الحق بی۔ اے (پرنسپل مدرسہ آصفیہ)
حیدر آباد دکن، اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رعنائی اور زیبائی، دلبرانِ سخن کو اُس زینت آفریں کی حمد سے حاصل ہے، جس نے معشوقانِ زبانِ ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ پہنایا۔ دلربائی اور رنگیں ادائی، نازفروشانِ ناطقہ کو اُس بے نیاز کی ثنا سے شامل ہے، جس نے محبوبانِ کلامِ اُردو کو زیورِ الفاظ عربی اور فارسی کی آرائش کے ساتھ خرام ناز سکھایا +

ثنا اور حمد ہے اُس ذوالمنن کو
یہ بخشی جس نے رنگینی سخن کو
چمن[1] کے ہم نے معنی کی جو لی باس
تو ہر گل کی نئی بُو ہے نئی باس

سرسبزی اور شادابی، چمنِ بیان نے اُس بہارِ گلشنِ نبوت کی نعت سے پائی، جس کی آبیاریِ فیضِ عام کے باعث خارِ خارِ نظمِ دلخراش اُردو کا رشکِ رگِ گل ہے۔ تر و تازگی اور سبزی گلبن معانی کو اُس رونق گلزار رسالت کی توصیف نے عطا فرمائی، جس کی نسیم نعت کی موج زنی سے ہر فقرۂ پریشان نظمِ ریختہ کا حسرتِ سنبل ہے۔ **قطعہ**

رحمۃ للعالمیں جب سے سنی ہے اُس کی ذات
گرمی خورشیدِ محشر سے نہیں کچھ بیم ہے
گو ہمارے جرم ہم کو آتشِ نمرود ہوں
وہ شفیع اپنا ہے، تو گلزار اپنا جحیم ہے

سله اس مصرعہ میں تعقید ہے، اصل عبارت یوں ہے۔ معنی کے چمن کی جو ہم نے باس لی، باس لینا یعنی خوشبو سونگھنا +

آبداری تیغ زباں کو اُس جوہر شمشیر شجاعت کی منقبت نے بخشی ہے، جس کی سیفِ دشمن گداز کے مضمون نے دو مصرعۂ آبدار کو بخشا رتبہ ذوالفقار[1] کا ۔ اور وسعت میدانِ سخن طرازی کو اُس شہسوار عرصۂ یکہ تازی کی تعریف نے عطا کی ہے، جس کی گشت گلگوں کی تحریر سے کمیتِ خامہ کرتا ہے صفحۂ کاغذ کو تختۂ گلزار کا

ہے گلستانِ ولایت کا وہ باب — تذکرے کا علمِ دیں کے انتخاب
لفظ و معنی مصرعِ آئیں کا ہے — مطلعِ دلکش بیاضِ دیں کا ہے
مدِ بسم اللہ سرِ لوحِ نجات — شاہ بیتِ کلیاتِ کائنات
اور فرزند اُس کے عالی دودماں — تا جنابِ حضرتِ صاحب زماں
آلِ پیغمبر اور اصحابِ کرام — ہو نزولِ رحمت اُن پر اور سلام

بعد حمد اور صلوٰۃ کے، رنگ دینے والوں کو چمن بیان کے معلوم ہووے، کہ شاہ گیتی افروز روشن ضمیر، شاہ عالم بادشاہ غازی کی بادشاہت میں، اور شمعِ شبستانِ دولت و اقبال وزیر اعظم ہندوستان نواب وزیر الممالک آصف الدولہ آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ کی وزارت میں، اور رونقِ بزم انصاف و عدالت نواب عماد الدولہ امیر الممالک گورنر جنرل وارن[2] ہیسٹن جلادت جنگ بہادر کی ریاست اور امارت میں، علی ابراہیم خاں مرحوم نے ایک تذکرہ شعرائے ہند کا عبارت فارسی میں لکھا ہے، اور نام اُس کا گلزارِ ابراہیم رکھا ہے سنہ ۱۱۹۸ گیارہ سو اٹھانوے ہجری اور ایک ہزار سات سو چوراسی عیسوی میں وہ تذکرہ تمام ہوا۔ مشہور یوں ہے کہ بارہ برس میں سرانجام ہوا۔ رفتہ رفتہ جب سر حلقۂ بزم نکتہ دانی، رونق افزائے محفلِ معانی، سخن کی جان، اور سخن دانوں کی قدر دان، صاحب والا مناقب، مسٹر گلگرسٹ[3] صاحب کی نظر مبارک سے گذرا

[1] یعنی ذوالفقار کا رتبہ بخشا ۱۲

[2] اس عہد ہندوستان کے گورنر جنرل دہلی کے دربار سے خطاب حاصل کرتے تھے، اور اُس کو اپنی تحریر و تقریر میں استعمال کرتے تھے ۱۲

[3] یعنی گلگرسٹ صاحب ہیں جن کے ایما سے میر امن صاحب نے چار درویش لکھی۔ در حقیقت اردو زبان کا سنگ بنیاد یہی شخص ہے ۱۲

ازبس کہ شاعروں کا احوال اس میں مجمل لکھا تھا، ایک مدت سے صاحب عالی حوصلہ کو خیال اس بات کا تھا کہ اگر بیان اس کا مفصل زبانِ ریختہ میں کیا جائے، تو خوب ہو، اور ہر ایک شاعر کی پوری پوری غزل اپنا جلوہ دکھائے، تو نہایت طبع کے مرغوب ہو۔ مبتدی اس سے بڑا مزا پائیں گے، اور نومشق کیفیت بہت اُٹھائینگے۔

چنانچہ اس خیر خواہ خفی وجلی، **میرزا علی** کو، کہ **لطف** تخلص کرتا ہے، نہایت محبت و اخلاق سے فرمایا کہ "تو اگر تن وہی اس مقدمہ میں کرے، تو ہم اس تذکرے کو اپنی طرز پر لکھیں"۔ اگرچہ یہ پابندِ اُلفت کا اس ایام میں ارادہ **حیدرآباد** کی سیر کا رکھتا تھا، لیکن اس خُلق مجسّم کے اخلاق کا کیا بیان کروں کہ اس مضمون کو اس وقت اس خوبی سے ادا فرمایا، کہ مجھ سے سوائے اس بات کے اور کچھ بن نہ آیا، کہ میں لاکھ جان سے حاضر ہوں، اور ایک سر مو آپ کے فرمانے سے نہیں باہر ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ خلق بھی سحر حلال ہے، جن لوگوں کا یہ آئین ہے اُن کا خوشا حال ہے۔ بغرض مدعائے دلی اُس صاحب عالی تدبیر کا یہ معلوم ہوا، کہ ان فارسی کتابوں کے ہندی نثر کرنے سے مراد ہمیں یہ ہے کہ صاحبان انگریز تازہ ولایت سے جو آتے ہیں، ہم اُن کی تربیت کے لئے سارا یہ خونِ جگر کھاتے ہیں، تاکہ اُن کے ذہن میں آسانی سے یہ عبارت آوے، اور اُن کی طبیعت اُس سے بخوبی مزا اُٹھاوے[ل]۔ تو بس لازم ہے کہ اس عبارت میں لفظ عربی اگر آوے، تو ایسا جس کو مبتدی دیکھ کر کہیں "سبحان اللہ"، اور لفظ فارسی جگہ پاوے، تو ویسا جس کو نومشق پڑھ کر کہیں "واہ واہ"۔ اُمید جناب اقدس الٰہی سے یہ ہے کہ اس طور پر سرانجام اور مقبولِ نگاہ خاص و عام ہو۔

الحمدللہ آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری اور اٹھارہ سو ایک مطابق عیسوی

[ل] اس فقرہ سے اندازہ کرو کہ اس وقت کے اہل قلم سادہ اُردو لکھنے کو کس قدر خلاف شان سمجھتے تھے۔ مصنف صاحبان انگریز پر احسان رکھتا ہے کہ ان کی خاطر سے اس نے یہ ذلّت گوارا کی ۱۲

کے ہیں، عہدِ سلطنت قایم ہے ایسے بادشاہ روشن دل خدا پرست سے، جس کی چشم حقیقت
بیں کے سامنے دلقِ گدائی اور خلعتِ شاہی برابر ہے، اور نظرِ معرفت اثر کے روبرو مساوی
کلاہِ فقیر اور تاجِ اسکندر ہے۔ تخت نشین بارگاہِ سرفرازی، **شاہ عالم بادشاہ غازی**،
قایم رکھے اللہ تعالیٰ اس شاہِ بے آزار کو، اور زیادہ کرے اُس کی قدرت اور اقتدار کو۔ اور بالفعل
مسندِ وزارت کو زیب اور زینت اُس رونق بخشِ بزمِ عیش و کامرانی سے ہے، جس کی محفلِ عیش
و نشاط کی غیرت سے تعجب نہیں ہے کہ زہرہ غرقِ عرقِ پشیمانی میں ہو، اور مشتری مانند آئینہ
کے گرفتارِ بندِ حیرانی میں۔ ساغر نوشِ خمخانۂ دولت و اقبال، مخمورِ بادۂ جاہ و جلال، یمین الدولہ
ناظم الملک **سعادت علی خاں** بہادر مبارز جنگ، ساقیِ روزگار جامِ اُمید کو اُس کے شربِ
مراد سے چھلکتا رکھے اور اس ایامِ فرخندہ فرجام میں محفلِ حکومت اور ایالت اُس امیرِ صاحب
تدبیر سے رونق پذیر ہے، جس کی بہارِ گلشنِ عدالت میں تحقیقات ہے چاکِ گریبانِ گل کی[۱]
اور پرسش ہے نالۂ مولخراشِ بلبل کی، کہ گل کا گریبان کیوں چاک ہے؟ اور بلبل کی آواز کیوں
دردناک ہے؟ سوسن کی زبان بندی سو سو بار ہوتی ہے، اور نرگس کے احوال کی تلاش ہے
کہ راتوں کو کیوں نہیں سوتی ہے؟ اس زبان داری پر کیا باعث ہے سوسن کی بے زبانی کا؟
اس چشم خماری پر کیا موجب ہے نرگس کی حیرانی کا؟ قمری کے طوقِ گردن کی جست وجو ہے، اور
صدا اُس کی حق کو کو تی ہے، اُس میں گفتگو ہے، کہ کسی چیز کا اس کی گم ہونا ثابت ہوتا ہے لفظِ "کوکو"
کی تکرار سے، گلا اس کا باندھا گیا کس تقصیر کے اقرار سے؟ غنچہ کی گٹھری کو نسیم بے اجازت بہار
کے کھولے، تو صاحبِ تقصیر ہے، اور زرِ نقد کو گل کے خزاں ہنسی سے بھی ٹٹولے، تو واجب
التعذیر ہے۔

سبحان اللہ عدل اور انصاف ویسا کہ جس کا مشکل بیان ہے عقل اور فراست ایسی کہ جس

---

[۱] یعنی گریبان گل کی چاک کی تحقیقات ہے ۱۲

میں قاصر زبان ہے ارسطو کو سامنے تقریر کے دعویٰ طفلِ دبستانی کا، اور افلاطون کو روبرو تحریر کے
اظہار ہیچمدانی کا۔ یہاں تک تو اُس کی قدردانی سے اب علم کا رواج ہے، کہ مملکتِ جہل جاہلوں
کے ہاتھوں سے ہوتی جاتی تاراج ہے۔ معمارِ حکم نے اُس کے وہ مدرسہ عالی شان بنا لیا ہے۔
جس کے بامِ عرش مقام کی پہلی سیڑھی اگر ساتویں آسمان کو کہئے تو بجا ہے۔ کرسی شاہ نشین کی
گھمنڈ عرش نشانی کا رکھتی ہے۔ نسبت اس کو بیت الشرفِ آفتاب سے کیونکر دی جا سکتی
ہے۔ صفائی کو دیوار کی دیکھ کر فقط آئینہ ہی حیرت سے نہیں پشت بردیوار ہے، بلکہ شرمندگی
سے پانی پانی گوہر آبدار ہے۔ تعریف سے اُس امیر عالی منزلت کی عہدہ برآ ہونا مجال نہیں ہے
زبان کی، اور توصیف سے اُس والا مرتبت کی نکتہ سرا ہونا طاقت نہیں ہے بیان کی۔ شہسوارِ
معرکۂ دشمن ستیزی، سر حلقہ گروہ خرد پژوہ انگریزی، زبدۂ نوئینانِ عظیم الشان، مشیرِ خاصِ حضور
فیض معمور بادشاہ کیوان بارگاہِ انگلستان، اشرف الاشراف مارکویس ولزلی، گورنر جنرل بہادر
ناظمِ ممالکِ محروسۂ سرکار کمپنی انگریز بہادر، و میر اعظمِ عساکر بادشاہی و سرکار کمپنی متعلقہ کشور ہند،
فدوی شاہ عالم بادشاہ غازی۔ عہدِ دولت میں اس عالی جناب کے ازبسکہ آرام اور چین ہر ایک
شخص کے نصیب ہے، اور عزّ و وقار اہلِ علم کے قریب ہے، موافق حکم اس صاحبِ والا مناقب کے،
کہ نام نامی اور اسمِ گرامی اس کا اوپر مذکور ہوا ہے، اس ہیچمدان نے یہ تذکرہ لکھا، اور نام اس
کا، بموجب ارشاد اس صاحب ممدوح کے، **گلشنِ ہند** رکھا۔

اگرچہ احتیاج تاریخ کے نظم کرنے کی نہ تھی، کس واسطے کہ نثر میں سنہ ہجری اور عیسوی دونوں
کی کیفیت لکھی ہے، اور علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاید یہی سمجھ کر گلزارِ ابراہیم میں تاریخ نظم سے
چشم پوشی کی ہے، لیکن یہ نہ چاہئے، کیونکہ بہ نسبت نثر کے نظم پر ہر ایک شخص کان دھرتا ہے،
اور حافظہ اس کو بہت جلد قبول کرتا ہے، تعجب کیا ہے کہ اس کا اشتہار ہو، اور اہلِ سخن کی زبان پر
اس کی تکرار ہو، تو جس کو سنی سنائی بھی یہ تاریخ یاد ہو گی، اس کو بن دیکھے اس تذکرہ کے معلوم اس کی
بنیاد ہو گی۔ بارہا صفات کے اشتہار سے ذات کو شہرت ہوئی ہے۔ اس فائدہ کے واسطے تاریخ

نظم اس کی اس طور پر لکھی گئی ہے ۔ قطعہ

ہر ایک گل ہمیشہ بہار، اس حدیقہ کا — کہتا ہے یوں خزاں سے کہ تو کیا پلٹ سکے
حیراں پھریں ہیں بے سر و پا ہمن اور دے — تاریخ اس کی جب سے کہ رشک بہشت ہے
۱۲۱۵ھ ۱۸۰۱ء

گلگشت کرنے والوں سے چمنستان نازک خیالی کے پوشیدہ نہ رہے، کہ اس نخلبند حدیقۂ بے استعدادی نے حسب الارشاد صاحب عالی شان مرقوم الصدر کے گلشن ہند کی دو جلدیں کی ہیں۔ جلد اوّل یہ جو تحریر کی جاتی ہے، اس میں عرش پروازیاں سلاطین نامدار کی، اور گوہر باریاں وزرائے والا اعتبار کی، اور خوش استعدادیاں امرائے عالی مقدار کی، اور سخن تراشیاں شعرائے صاحب وقار کی، جو کہ نام آور اور صاحب دیوان تھے، بیان کی گئی ہیں۔ اور جلد دوم میں مذکور کئے گئے ہیں شعرائے گم نام وغیرہ مشہور، یا وہ نومشق کہ ہنوز نہیں تمام کر چکے ہیں کہانی شمع و پروانہ اور گل و بلبل کی۔ توفیق اس کتاب کی تمامی میں اُس مرجع کل سے چاہتا ہوں، کہ جس کی طرف رجوع ہے جزو کل کی۔ جل جلالہ و عم نوالہ۔

باب الف

۱۔ آفتاب

آفتاب تخلص، نور نیر جہانبانی، مہر سپہر صاحب قرانی شاہ عالم بادشاہ ابن عالمگیر ثانی شاہزادگی میں گوہر صدفِ سلطنت کا نام عالی گوہر تھا۔ اُسی ایام میں عماد الملک کے خوف سے دلی سے نکلے، اور بعد بہت آوارگی کے نجیب خاں کے یہاں، کہ سردار قوم افغان کا تھا اور نجیب الدولہ خطاب رکھتا تھا، منتظر عنایت الٰہی کے ہو کر ٹھیرے۔ اس میں بعد ایک مدت کے محمد قلی خاں، بھتیجے نواب صفدر جنگ کو، کہ ناظم صوبۂ الہ آباد کا تھا، حوصلہ بنگالہ کی تسخیر کا دامن گیر ہوا۔ مشورے سے نواب شجاع الدولہ کے، کہ وہ باطن میں محمد قلی خاں کے برباد کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، خان مذکور نے شاہزادے کو نجیب خاں کے ہاتھ سے بلوا کے، اور وسیلہ حزم کا ٹھیرا کے، آپ مع

فوج کے رکاب سعادت میں داخل ہوئے، الہ آباد سے کوچ کرکے قریب عظیم آباد کے آپہنچے
اب آگئے رام نرائن، عظیم آباد کے نائب نظامت، کالبے حواس ہوکر محمد قلی خاں کی معرفت
حضور میں شاہزادے کے حاضر ہونا مشہور ہے، اور پھر بگڑ کے چندے قلعہ میں عظیم آباد کے بند ہوکر
لڑنا، یہ بھی تواریخ بینوں کی نگاہ سے نہیں مستور ہے۔

ابھی محمد قلی خاں قلعے کو لگے ہی ہوئے تھے، کہ اس میں بھاایک چند روز کے شہر جعفر علی خاں
اور میرن کی آمد آمد کا، واسطے رام نرائن کی کمک کے مع کرنیل کلف بہادر ثابت جنگ کے
مشرق کی طرف سے، ہوا۔ محمد قلی خاں نے اُن کی لڑائی سے عہدہ برآ ہونے کی طاقت اپنے بیچ
میں نہ پاکے، پیش از اُن کے داخل ہونے کے، کوچ بنارس کی طرف کیا، اور شاہزادہ عالی تبار
عالی گوہر نے، کرم ناسی کی ندیٹی سے، کہ صوبہ عظیم آباد کی سرحد میں ہے، عبور کرکے تھوڑی دور
گئے تھے، کہ باپ کے مارے جانے کا احوال اس طور سے سُنا، کہ مہدی قلی خاں کشمیری، علی قلی خاں
کے بھائی نے، کہ رفیق عمادالملک کا تھا، حسب الارشاد اپنے آقا کے حضور اعلیٰ میں عرض کی
کہ ''ایک فقیر بہت بڑا صاحب کمال فیروز شاہ کے کوٹلہ میں آکے اُترا ہے، حضرت کو ملاقات
اس سے کرنی ضرور ہے'' حضرت بیچارے اجل گرفتہ، حکم میں تو عمادالملک کے تھے ہی، اپنے
پاؤں سے آپ قبر میں تشریف لے گئے۔ وہاں فقیر کہاں تھا، کئی ایک خونخوار جفا کار، بے
شرم اور بے رحم اُس حجرے میں بٹھا رکھے تھے، جانتے ہیں اس بے گناہ کو پیش قبضوں سے
مار کر لاش کو اوپر سے ریتی کی طرف کر دیا۔ شاہزادے نے سُنتے ہی اس خبر کے، گھٹولے میں
پہنچ کر، موافق ضابطۂ خاندان بابریہ کے ۱۱۷۳ھ گیارہ سو تہتر ہجری میں القاب ''شاہ عالم''
کے ساتھ تخت سلطنت پر جلوس فرمایا۔ اور قلمدان وزارت کا مع خلعت جلد نواب شجاع الدولہ
کے واسطے بھجوایا۔ ساتھ ہی اس کے خلعت امیرالامرائی کا، کہ عبارت میر بخشی گری سے ہے،

۵۱؎ یعنی اس ندی سے جس کا نام کرم ناسا ہے۔

نجیب الدولہ کے لئے روانہ ہوا۔ اور نواب منیر الدولہ نے اُسی وقت موافق ارشاد کے ایلچی گری کے طور پر ابدالی کی طرف کوچ کیا۔ اتنے میں کامگار خاں پانچ چھ ہزار سوار سے، اور دلیر خاں اصالت خاں اپنی تمام جمعیت سے حاضر ہوکر، اقرار جانفشانی کے ساتھ داخل دائرۂ دولت کے ہوئے۔ چنانچہ کامگار خاں نے اخراجات ضروری کا اپنا ذمہ کیا، اور زمینداروں سے اتنے ہی عرصے میں، جس جس ڈھب سے بنا، کچھ کچھ رُپیا بھی لیا۔ تجویز یہ ٹھہری کہ میرن کے آنے سے آگے ہی رام نرائن سے لڑیجیے، اور خدا فضل کرے، تو قلعے عظیم آباد کے عمل کیجیے۔ بادشاہ کو بھی یہ مشورہ پسند آیا، اور اسی وقت پیش خیمے کے کوچ کو حکم فرمایا۔ کامگار خاں اور دلیر خاں متصل رام نرائن کے لشکر کے، کہ دیو ہانڈی کے کنارے پر پڑا تھا، آپڑے۔ اور بعد کئی دن کے میدان جنگ آراستہ کرکے کمال جانفشانی اور سرفروشی کے ساتھ لڑے۔

سب سے پہلے دلیر خاں اور اصالت خاں نے گھوڑے چلائے، اور نہایت بہادری سے رام نرائن کی فوج میں درآئے۔ سچ تو یہ ہے کہ غول ان کا نشانہ تھا چھروں کی مار کا، اور ہدف تھا بندوقوں کی باڑھ کا، بجلی کی طرح کڑک کر ہر ایک اژدہا توپ کا سا گرم آتش فشانی تھا، اور گولیوں کی بارش کے ساون بھادوں کا مینہ شرمندگی سے پانی پانی تھا۔ اس میں بندوقوں کی مار سے نشان[۱] کے ہاتھی کا منہ پھر گیا۔ کسی نے دلیر خاں سے پکار کر کہا کہ "نشان کا ہاتھی پھر کھڑا ہوا" فرمایا "کیا ہوا، ہاتھی پھرا، اور گو کہ آسمان بھی پھرے دلیر خاں تو نہیں پھرا۔" یہ کہ کے دونوں بھائیوں نے کود کے گھوڑوں سے ایک تین سو جوانوں سے، کہ وہ رفیق ان کے تھے، ایسی ہی جانبازی کی کہ ساری زمین ان کی لاشوں سے بھر دی، اور تمام فوج رام نرائن کی تلے اوپر کردی، خاطر خواہ دلاوری اور بہادری سے دل بھر کے، شجاعت اور تہوّر کا حق ادا کرکے، دونوں بھائیوں نے مع رفیقوں کے جان شیریں نثار کی، لیکن رام نرائن کی فوج میں بھی باقی نہ رہی جلادت گفتار کی۔

[۱] یعنی وہ ہاتھی جس پر نشان سلطنت تھا۔

اس میں توپ اور بندوق تو بند ہو ہی گئی تھی، کامگار خاں مع اپنی فوج کے جو ایک طرف سے بیٹھا، تو برابر رام نرائن کے جا نکلا۔ لوگ رام نرائن کے، ازبسکہ دلیر خاں کی لڑائی کھائے ہوئے تھے، دوبارہ کامگار خاں کے مقابلے کی طاقت نہ لا کے پسپا ہوئے۔

رام نرائن نے مقدمہ بے ڈول دیکھا، عین لڑائی میں کپتان کاکری صاحب سے کہلا بھیجا کہ "آدھے لوگ اپنے میری کمک کو بھیجئے"۔ کپتان مذکور نے موافق حکم نائب نظامت کے اپنی فوج کے دو حصے کئے، اور آدھے آدمی اِدھر بھیج دیئے۔ لیکن لوگ ان کے بھی تو لڑائی کی محنت اُٹھا چکے تھے، اور جس قدر چاہئے تھا جی لڑا چکے تھے، کچھ کام بن نہ آیا، اور کسی طرح سے بندوبست نے لڑائی کے انتظام نہ پایا۔ چنانچہ کامگار خاں نے گھوڑا رام نرائن کے ہاتھی سے ملا دیا، اور اتنے تیر اور نیزے مارے کہ اپنی دانست میں اُنہوں نے مار لیا، لیکن اس مدبر نے زخمی ہوکر حوضے میں لیٹ جانے کو غنیمت جانا اور تختوں کی آڑ کو وسیلہ زندگانی کا گردانا۔ غرض لڑائی بگڑ گئی، بہت سے لوگ رام نرائن کے ساتھ کے مارے گئے، اور کچھ تھوڑے سے لوگ بھاگ بھی بچا نہ گئے۔ مہدی دھر مع رحم خاں اور غلام شاہ کے، کہ ہمراہ اُن فوج کے تھے، کامگار خاں کے ہاتھ میں گرفتار ہوئے۔ احمد خاں قریشی اور مراد خاں، بیٹا بہرام خاں بلوچ کا، بھاگ کے رام نرائن کے شریک، عظیم آباد کی طرف قدم گزار ہوئے۔ شاہ عالم بادشاہ غازی نے فتح اور نصرت کے ساتھ کھیت پر ڈیرا کرنے کا حکم دیا، اور بھاگے ہوؤں کا پیچھا مطلق نہ کیا۔ اب آگے بیان ساتھ تفصیل کے موجب طول کلام کا ہے ✦

مختصر یہ کہ آج کے دن تک، کہ ۱۲۱۵ سنہ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، اور جلوس مبارک کو سنہ بیالیسواں ۴۲ ہے، وہ اورنگ نشین بارگاہِ جاہ و جلال تختِ سلطنت پر ساتھ عیش و نشاط کے حکمراں ہے ✦

سنہ تیئسویں میں عہد سلطنت کے، متلو علی خاں ناظر کی بے بصیرتی سے شیخ غلام قادر خاں

زبیلے نے جو کورنگی کی ہے مفصل بیان اس کا غضب ہے، اور بہنایت ترک ادب ہے. لیکن حضرت نے خود اپنی زبان بلاغت بیان سے اس روداد کو اس تفصیل کے ساتھ نظم کیا ہے، کہ اور کسی بندۂ آستان دولت کی کیا مجال تھی کہ اس واردات کو اس بے ادبی سے زبان تک لاتا، ازبسکہ وہ غزل فارسی ہے، داخل کرنا اس کا بیچ کتاب کے خلاف آئین نثر ہندی کے معلوم ہوا، اس واسطے تیمناً و تبرکاً اس غزل کو حاشئے پر کتاب کے لکھا ہے، اور ترجمہ اس کا لفظاً باللفظ کر کے اس طرح داخل کتاب کیا ہے **نظم**

حادثے کی اُٹھی آندھی جو مری خواری کو	دم میں برباد کیا میری جہانداری کو

لہ

صرصر حادثہ بر خاست پئے خواریِ ما	داد بر باد سر و برگ جہان داریِ ما
آفتاب فلکِ رفعتِ شاہی بودیم	بود در شام زوال آہ سیہ کاریِ ما
چشمِ ما کندہ شد از دستِ فلک بہتر شد	تا نہ بینم کہ کند غیر جہان داریِ ما
داد افغان بچہ شوکتِ شاہی بر باد	کیست جز ذاتِ مبرّا کہ کند یاریِ ما
بود جانکاہ زر و مالِ جہاں ہمچوں مرض	رفع از فضلِ الٰہی شدہ بیماریِ ما
کردہ بودیم گناہے کہ سزایش دیدیم	ہست مصروف کہ بخشند گنہگاریِ ما
کودنِ سی سال نظارت کہ براو داد بباد	زود تر یافتہ پاداشِ ستمگاریِ ما
عہد و پیماں بہ میاں داد و نمودند دغا	مخلصاں خوب نمودند وفا داریِ ما
شیر را دم افعی بچہ را پروردم	عاقبت گشت بجز بہ گرفتاریِ ما
حق طفلاں کہ بہ سی سال فراہم کردیم	کردہ تاراج و نمودند سبک باریِ ما
قومِ مغلیہ و افغاں ہمہ بازی دادند	بسکہ گشتند مجتہد بہ گرفتاریِ ما
ایں گدا زادۂ ہمداں کہ بہ دوزخ برود	بانیٔ جور و ستم شد بہ دل افگاریِ ما
گل محمد کہ نہ مرواں بہ شرارت کم نیست	چہ قدر کرد و کالت پئے آزاریِ ما
نامراد و سلیمان و بدل بیگ لعیں	ہر سہ بستند کمر بہرِ گرفتاریِ ما

بس کہ خورشید کو لازم ہے طلوع اور غروب / شام یوں پھولی غرض میری سیہ کاری کو

آنکھیں نکلیں تو ہوا خوب کہ دیکھونگا میں / غیر کے قبضے میں اورنگ جہانداری کو

مملکت کا بھی خیال ایک مرض تھا جانگاہ / گردش چرخ نے کھویا مری بیماری کو

کی اس افغاں بچے نے شوکت شاہی برباد / کون پہنچے گا خدا چھوٹے[١] مری اب یاری کو

ہوگئے تھے گنہ اُن سب کی سزا کھینچی ہیں / شاید اب پوچھیں نہ وہاں میری گنہگاری کو

جو تھا انتیس برس سے مرے گھر کا ناظر / پہلے حکم اُس نے دیا میری دل آزاری کو

بے گناہی نے مری اُس ستم ایجاد کے تئیں / جلد پہنچایا مکافات ستمگاری کو

حق طفلاں جو ہوا تیس برس میں نما حج / مار کر لے گئے یاں چھوڑ سبک باری[٢] کو

قوم افغان و مغل سب نے مجھے باتیں دی / رکھا ہر اک نے روا میری گرفتاری کو

عہد و پیمان کئے اس میں، بھلا حق نمک / ان سے سیکھے کوئی آئینِ وفاداری کو

تھا جس افغاں بچے کو دودھ پلا کر پالا / بدلے اس حق کے وہ آیا میری خونخواری کو

نازنینیں میری ہمدم جو تھیں یاں ایک نہیں / جز مبارک محل اس میری پرستاری کو

آصف الدولہ اور انگریز ہیں میرے دل سوز / کیا عجب آویں اگر میری مددگاری کو

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند کے تئیں / ہوگی بے رونقی اس طرز جفاکاری کو

نتیجہ

شاہ تیمور کہ دارد سر نسبت با من / زود باشد کہ بیاید بہ مددگاری ما

مادھوجی سیندھیا فرزند جگر بند من ست / ہست مصروف تلافی ستمگاری ما

آصف الدولہ و انگریز کہ دستور من اند / چہ عجب گر بنمایند مددگاری ما

راجہ و راؤ و زمیندار امیر و چہ خفیف / حیف باشد کہ نہ سازند بہ غمخواری ما

نازنینان پری چہرہ کہ ہمدم بودند / نیست جز محل مبارک بہ پرستاری ما

گرچہ ما از فلک امروز حوادث دیدیم / باز فردا دہد ایزد سر سرداری ما

[١] یعنی سوائے خدا کے ١٢ [٢] یعنی یہاں صرف سبکساری اور تہیدستی چھوٹ گئے ١٢

کوئی پہنچا دو خبر حال کی میرے، کہ نظام — شاید آ نکلے محبت سے خبرداری کو
شاہِ تیمور سے ہے اک سرِ نسبت مجھ کو — دور کیا ہے جو کرے دور دل آزاری کو
راجہ و راؤ زمیندار امیر او فقیر — چاہیئے سب کے سعادت میری غمخواری کو
آفتاب آج فلک نے کیا گر بے سروپا — بخشے گا کل تجھے حق پھر تری سرداری کو

حضرت جہاں پناہ کے مزاج مبارک کو نہایت نظم کی طرف التفات ہے، اور بیشتر شغل اشعار میں کٹتی اوقات ہے۔ ان شعروں کو اُس جناب کی طرف منسوب کرتے ہیں +

کیجیے ہمدم بھلا کیوں کر نہ شکوہ یار کا — ہم تو بندے اُس کے ہوں، وہ یار ہوا غیار کا
خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اُس نے آہ — ہو جیو یا رب بھلا اس چشمِ آتشبار کا
صاف کل آنکھیں تری کہتی تھیں عاشق سے پکا — کر سکے عیسیٰ مداوا اپنے کب بیمار کا
خون ہووے گا گلوں کا دیکھنا ہرگز صبا — نام مت لینا چمن میں اُس بت خونخوار کا
زلف تیری دیکھ کے زاہد رگِ جاں سے بنا — جانتا ہیگا سعادت باندھنا زنّار کا ۔
کب ترے عشاق بیٹھیں حشر میں طوبیٰ تلے — یاد آوے دل میں جب سایہ تری دیوار کا
دیکھ کر کل نبض میری یوں لگا کہنے طبیب — کوئی بھی جانبر ہوا بیمار اس آزار کا
صرف کعبہ میں نہ کر اوقات کو ضائع تو شیخ — ڈھونڈھ جا کر ہر طرف نقشِ قدم دلدار کا

اس قدر افسردہ دل کیوں ان دنوں ہے آفتاب
دیکھ کر ہوتا ہے تجھ کو تنگ دل گلزار کا ۔

ولہ

صبح اٹھ جام سے گذرتی ہے — شب دل آرام سے گذرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے — اب تو آرام سے گذرتی ہے

۲ - آصف

آصف تخلص، نورِ کوکبِ ہمت اور شجاعت کا، خورشید آسمان مروّت اور سخاوت

کا، نواب آصف الدولہ وزیر الممالک آصف جاہ یحییٰ خاں بہادر ہزبر جنگ، خلف نواب
شجاع الدولہ مغفور کا ہے، اور پوتا نواب ابو منصور خاں صفدر جنگ کا۔ بعد وفات شجاع الدولہ
کے کہ گیارہ سو اٹھاسی ۱۱۸۸ہجری تھے، اور شاہ جہاں پناہ شاہ عالم بادشاہ غازی کے
عہد سلطنت کو پندرھواں سنہ تھا، بلدۂ فیض آباد میں، کہ قدیم نام اس کا بنگلا ہے، مسند
وزارت کو زینت اس عالی تبار نے بخشی ہے۔ ازبسکہ رسم کہن ہے کہ بادشاہ اور وزیر
واسطے نام کے، عہد حکومت اپنے میں، نئے شہر کے آباد کرنے کی تلاش کرتے ہیں، اور
وہاں مقر بود و باش کرتے ہیں۔ بعد چندے ہی اس آب و رنگ گلشن وزارت نے بنگلے
سے کوچ کر کے خارستان لکھنؤ کو بہار قدوم سے اپنے رشک شگوفہ زار کشمیر کا کیا۔ لکھنؤ
کے تن بے جان میں گویا جان آئی، اور چشم بے نور نے بصارت پائی۔ پھر تو آبادی پر شہر
کے عرصہ زمین کا تنگ تھا، اور معموری کو اس خراب آباد کی تشبیہ سے ہفت اقلیم کی ننگ
تھا۔ بسکہ اس بلند نظر کا اہل کمال کی طرف میلانِ خاطر تھا، ایک ایک کمال کا ہزار ہا
آدمی وہاں حاضر تھا۔ عمارت کی تعمیر پر طبیعت نہایت مصروف تھی، اور خواہش شکار
کی مزاج سے بشدت مالوف تھی۔ ہر روز لازم تھا ایک عمارتِ تازہ کی بنا کا دھرنا، اور ہر
سال عین واجب تھا واسطے شکار کے دو مرتبے سفر کرنا۔ بے مبالغہ ہے کہ ہزاروں شیر مانند
بکریوں کے مارنے میں آئے، یہاں تک کہ اُن کی کھالوں کے منعدد خیمے عالی شان بنوائے
پہلی ہی گولی اس کے ہاتھ کی گینڈے اور ارنے کو تھا پیغام اجل کا، اور بڑے دانت ہونے
ہاتھی کے بس یہی اُس کے واسطے تھا دام اجل کا، مستک پر فیل مست کی جب اس کا تیر
بیٹھا، سوفار کا باہر نام نہ تھا۔ پہاڑ کو تنکے سے ٹالنا اس کے آگے کچھ کام نہ تھا۔ جنگلی ہاتھی
و تیلے اتنے مارے کہ آج دولت خانہ میں ایک عمارت عالی شان ہاتھی دانت کی موجود ہے
جس کے ستون اور کڑیوں میں نام کو کہیں لکڑی کا نہیں وجود ہے۔ شجاعت کے سوائے
سخاوت پر جب طبیعت آئی تو ہمت حاتم کی دل سے خلائق کے بھلائی۔ ایک دن میں

لاکھ روپیہ سے شریف مکہ کی خدمتگذاری کی، اور پانچ لاکھ روپے خرچ کرکے نجف اشرف میں نہر آصفی جاری کی۔ فیاض ایسا کہ جو کوئی سامنے کبھی گیا خالی نہیں پھرا ہے۔ بے مبالغہ ہے کہ خاک کی مُٹھی کو اکثر اکسیر کی قیمت میں لیا ہے۔ اس میں کوئی گستاخ اگر اس کی قباحت زبان پر لایا، تو وہیں بے مزہ ہوکر اس سے فرمایا کہ "اتنی مروت کرنی اس شخص سے ہم نے مدت سے اپنے دل میں ٹھہرائی، یہ چٹکی خاک کی جو اس سے لی یہ مفت میں پائی" غرض جو کچھ چاہیئے سب کمالوں کی جامعیت تھی۔ افسوس یہ ہے کہ فوج اور ملک کی طرف سے غفلت تھی۔ نائبوں کے ہاتھ میں اصالتاً ملک کا سرانجام رکھا، آپ فقط سیر اور شکار سے کام رکھا، مشیر کوئی لایق اور کام کا نہ پایا، اس واسطے ساتھ عزم کے رتبہ نام کا نہ پایا چھبیس[26] برس کُل اس مربع نشین مسندِ وزارت نے حکمرانی کی، اور چمن گیتی میں مانند گُل خورشید کے محتاجوں پر زرفشانی کی۔ آخرالامر ازبسکہ بیچ گلشن دنیا کے بہار اور خزاں آپس میں دست و گریباں ہیں، بیماری سے استسقی کی ۱۲۱۲ھ بارہ سو بارہ ہجری میں، کہ سلطنت کو شاہ عالم بادشاہ غازی کے چالیسواں سنہ تھا، اٹھائیسویں تاریخ ربیع الاول کی، پہر ڈیڑھ ایک دن رہے، حکومت عارضی کو ملک فنا کی چھوڑکر کار فرمائی اقلیم بقا کی اختیار کی۔ راقم آثم صغرسن سے ملازموں میں اس آستانۂ دولت کے مع رسالہ سرفراز تھا، اور افراط عنایت اور الطاف سے اس کے ہم چشموں میں اپنے مہر و امتیاز تھا۔ اس شمع شبستان وزارت کی تاریخ وفات کا شعلہ اس جگر کباب کے گلخن طبع سے یوں آتش فشاں ہوا ہے **قطعہ**

آصف الدولہ جب جہاں سے گیا	اک جہاں بے دل و دماغ ہوا
جام عمر اس کا بھرتے ہی لبریز	خلق کا[1] عیش کا ایاغ ہوا
دشمنوں کا دل آتش غم سے	دوستوں سے زیادہ داغ ہوا
سال تاریخ کا خیال کیسے	خشک شعر و سخن کا باغ ہوا

[1] یعنی خلق کے عیش کا ایاغ لبریز ہوا ۱۲

بولے یوں دور کرکے پائے عناد
آج گل ہند کا چراغ ہوا
۱۲ ۱۲

یہ اشعار اُس عالی جناب کے مشہور ہیں +

جس گھڑی تیرے آستاں سے گئے
ہم نے جانا کہ دو جہاں سے گئے
تیرے کوچہ میں نقش پا کی طرح
ایسے بیٹھے کہ پھر نہ وہاں سے گئے
شمع کی طرح رفتہ رفتہ ہم
سنیو اک دن کہ جسم وجاں سے گئے
عشق! ہاتوں سے تیرے کیا کہئے
نام سے گذرے اور نشاں سے گئے
ایک دن ہم نے یار سے جو کہا
اب تو ہم طاقت و تواں سے گئے

ہنس کے بولا کہ سنتا ہے آصف
یوں ہی کہہ کہہ کے لاکھوں یاں سے گئے

دل ہمارا خانہ اللہ گر مشہور تھا
ولہ سو بتوں کے عشق میں اب وہ بھی بتخانہ ہوا
آباد ملک دل وہ یارو کہاں رہے گا
ولہ جس جا یہ درد و غم کا نت کارواں رہیگا
آصف نہ چھپے عشق بتاں دل ہمارے
ولہ سو بار اگر پھر بھی بنا دیں اسے گھڑ کر
شوخی چشم کی شہرت کو تری سن سن کر
ولہ شرم سے باغ میں نرگس نے چھپائیں آنکھیں
مرے دل کو زلفوں میں زنجیر کیجو
ولہ یہ دیوانہ اپنا ہے تدبیر کیجو
مرے دل نے زلفوں میں مسکن کیا ہے
یہ مہماں ہے اے شانہ، توقیر کیجو
جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے
ولہ آب سے آتش ہوئی کیوں کر ہم کیا جانئے
پوچھتے کیا ہو شب ہجر کی حالت یارو
ولہ میں ہوں، اور رات ہے، اور بستر تنہائی ہے
آصف نہ چھوڑ دست سخاوت کو زینہار
ولہ لایا ہے کچھ نہ ساتھ نہ جائے گا تو لئے
یاں تلک داغ محبت دل نے کھائے ہیں کہ بس
ولہ سر سے پا تک ایک گویا صورت طاؤس ہے
ہزاروں مرتے جیتے دیکھے تیر بات کرنے سے
ولہ لب معجز بیاں میں تیرے شاید آب حیواں ہے

۳۔ انجام

انجام تخلص، عمدۃ الملک خطاب، نواب امیر خاں نام، والد ماجد ان کے عمدۃ الملک نواب امیر خاں ہیں، کہ جو عالمگیر خلد مکان کے عہد سلطنت میں زینت بخش مسند امارت کے تھے۔ سلسلہ نسب شریف کا اس عالی خاندان کے میر میراں نعمت الٰہی کو، کہ سلاطین صفویہ کے ساتھ نسبت ہو رناتا رکھتے تھے، پہنچتا ہے۔ بزرگ ان کے ہمیشہ ایران میں صدر نشین تھے محفل عز و وقار کے، اور ہندوستان میں بھی ہمیشہ انیس و جلیس رہے ہیں سلاطین نامدار کے۔ اس عالی دودمان کو شاہ عالم پناہ محمد شاہ سے ایسی صحبت برآر ہوئی تھی، کہ رشک تھا ان کا سب ارکان دولت کو، اور اعیان مملکت کو، حسد تھا۔ لطیفہ گوئی کی طرف طبیعت ان کی نہایت مصروف تھی، اور خوش طبعی سے مزاج بہ شدت مالوف۔ گردش چشم کے بھنے میں زمانے کے اُستاد تھے، اور شیریں کلامی میں اپنے وقت کے فرہاد۔ موجد تازہ اندازی کی تہ داریوں کے اور اختراع کرنے والے چتون کی جادو کاریوں کے۔ گانے میں دخل ایسا تھا، کہ اُستاد اس فن کے دم شاگردی کا مارتے تھے، اور نادیدہ کی باتوں میں بڑے بڑے گیانی ان کے آگے جی ہارتے تھے۔ بادشاہ کو ایسا اپنی طرف مصروف کر لیا تھا، کہ ایک دم کی جدائی ان کی جہاں پناہ کو شاق تھی، اور آٹھ پہر طبیعت ان کی طرف مشتاق تھی لیکن موافقت وراندازی سے بدگویوں کی آخر آخر مبدل بہ غبار خاطر ہوئی، اور خواہان جان نہ بباطن بلکہ بظاہر ہوئی چنانچہ ۱۱۶۹ سنہ گیارہ سو انہتر ہجری میں ایک نمک حرام نے اُن ہی نوکروں میں سے انہیں کے صحن دولت خانہ میں بادشاہ کے قہر کیا، کہ اس روشن زبان کی زندگی کے چراغ کو ایک ہی جھوکے میں کٹاری کے بجھا دیا، اگرچہ اس نااہل کا بھی اُسی جگہ لگ گیا ٹھکانا لیکن افسوس ہے نواب امیر خاں کا مارے جانا۔ اکثر ارباب فہم کو گمان تھا کہ یہ اشارہ بادشاہ کا ہے اور امر جہاں پناہ کا ہے۔ جب اس نمک حرام کی لاش کو اُٹھوانے میں بادشاہ نے نہایت کرم

فرمایا، پھر تو عوام کو بھی اس گمان کا بے تامل یقین آیا۔

اس عالی طبیعت کو پہیلی اور کہ مکرنی کے کہنے میں مشق حد سے زیادہ تھی، اور اشعار فارسی اور ہندی میں بھی چنگی استعداد تھی۔ یہ اشعار اس ستودہ اطوار کے آویزۂ گوش صغار و کبار ہیں۔

کیوں بلایا بھیڑ میں کیا مجھ سے نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی

کل محیطِ عشق کے صدموں سے پائی تھی نجات
کشتیِ دل بے طرح کچھ آج طوفانی ہوئی

ہر پری تمثال جوں آئینہ رکھتا تھا عزیز
ٹوٹتے ہی دل کے مجھ کو سخت حیرانی ہوئی

کیا کہوں انجام میں اس عشق کے آغاز کو
دوستداروں کی محبت دشمنِ جانی ہوئی

نعش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے
"کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی"

ولہ

ٹک تو فرصت دے کہ رولیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم

منہ ترا تکتے ہیں سب اے سلیمِ حسن و عشق کے
تو ہی بتلا دے کریں کس سے تری فریاد ہم

دل تو ہے داغِ غلامی سے تری طاؤس وار
سامنے قمری کے گو ہیں سرو ساں آزاد ہم

اب کسی نے دل جلایا مہربانی سے تو کیا
عمر مانندِ شرر جب کر چلے برباد ہم

ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاسِ مکنت
شکر ہے، تڑپے نہ زیرِ خنجرِ جلاد ہم

۴- اُمید

اُمید تخلص، نام اصلی اس معدنِ کمالات کا مرزا محمد رضا ہے، رہنے والا ہمدان کا، ایام شباب میں وطن سے غربت اختیار کر کے وارد اصفہان کا ہوا ہے، اور میرزا طاہر سے کہ وحید جن کا تخلص تھا، نسبت شاگردی کی درست کر کے کسب کمالوں کا کیا ہے۔ سلطنت میں خلد مکان کے ہندوستان میں آیا، اور اول بادشاہت میں بہادر شاہ

کے خطاب قزلباش خاں کے ساتھ رتبۂ منصب ہزاری کا پایا، لیکن اس پائے سے ہمیشہ اس ایام میں شکوہ مند رہا ہے، اور منصب ہزاری کے مضمون کو ایک بیت میں اس طرح سے موزون بھی کیا ہے[۵۱]:

مثل بلبل کے ہوں سدا نالاں　　　یہ مرا منصب ہزاری ہے

محمد معز الدین کے وقت میں کسی خدمت کی تقریب سے برہان پور کو گیا۔ وہ صوبہ داری میں امیر الامرا سید حسین علی خاں کی اس خدمت سے تغیر ہو کر خجستہ بنیاد میں حاضر ہوا۔

اس جگہ تھوڑا سا احوال مجمل سید حسین علی خاں کی امیر الامرائی کا، اور صوبہ داری دکن کی جلوہ فرمائی کا، بیان کرنا ضرور ہے، کس واسطے کہ تغیر ہونا قزلباش خاں کا بخوبی معلوم ہوگا۔ جب کہ سنہ ۱۱۲۴ گیارہ سو چوبیس ہجری میں محمد فرخ سیر اور محمد معز الدین سے لڑائی ہوئی، تو سادات بارہ نے کمال جانفشانی کی، چنانچہ سید عبد اللہ خاں اور سید حسین علی خاں نے، مع اپنے بھانجے بھتیجوں اور رفیقوں کے، حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں، بہادر خاں کے بیٹے کو، مع اُن کے رفیقوں کے، شریک کر کے بلا جو کیا، تو زنجیر سے توپخانے کے گھوڑوں کو کدا کدا کے مقابل ذوالفقار خاں کے، کہ بیٹا اسد خاں وزیر کا تھا، جا پہنچے، اور کود کود کے گھوڑوں پر سے جیسی چاہئے تھی جاں نثاری کی، اور داد مردانگی اور شجاعت کی دی۔ اس میں توپیں بند ہوگئیں تھیں، باقی فوج سے بھی تن دہی ہوئی۔ حسن بیگ خاں صف شکن اور زین الدین خاں، بیٹا بہادر خاں کا، یہ دونوں سردار مع اپنے رفیقوں کے بہادری کا حق ادا کر کے، کام آئے، اور سید حسین علی خاں چور ہو کر کھیت میں بیٹھ گئے۔ اتنے زخم اٹھائے، بارے سادات کے سر لڑانے سے پانوں طرف ثانی کے اٹھ گئے۔ جو مرے سو مرے، اور باقی بھاگ کھڑے ہوئے۔ محمد معز الدین نے اپنی صورت بدل کر راہ دلی کی لی، اور محمد فرخ سیر کو اللہ تعالیٰ نے سادات کی نمک حلالی سے سلطنت عطا کی۔

---

[۵۱] مثل بلبل ہمیشہ نالانم ۔ ایں بود منصب ہزاری ما۔

سید عبداللہ خاں، بھائی کو زخمی کھیت میں چھوڑ کر، فوج کا تعاقب کیے چلے گئے ہیں، اور بادشاہ بعد ایک ہفتہ کے داخل دلی میں ہوئے ہیں۔ اس جانبازی کے عوض میں بادشاہ نے سید عبداللہ خاں کو وزیر اعظم کیا، اور قطب الملک یار وفادار سید عبداللہ خاں بہادر ظفر جنگ خطاب دیا۔ اور سید حسین علی خاں کو میر بخشی ہونے کے سوا منصب ہفت ہزاری عنایت ہوا، اور امیر الامرا سید حسین علی خاں بہادر فیروز جنگ خطاب ملا۔ بعد اس فتح کے جو خدمتیں کہ ان سے ہوئی ہیں، اور جو نمک حلالیاں کہ انہوں نے کیں ہیں مفصل بیان اس کا موجب طول کلام کا ہے، اور کچھ متعلق بھی نہیں اس مقام کا ہے۔ غرض توجہ بادشاہ کی ازبسکہ ان پر حد سے زیادہ تھی، حاسدوں کو بس یہی عداوت کی بنیاد تھی۔ تھوڑے ہی سے دنوں میں بدگویوں نے ان کی طرف سے بادشاہ کے دل میں سیکڑوں شبہے ڈال دیئے، غضب تو یہ ہے کہ اس عقل مجسم نے حاسدوں کے کہنے سے بے تامل مان لئے پھر تو دشمنوں نے تدبیر ان کے توڑنے کی یہ ٹھیرائی، کہ پہلے لازم دونوں بھائیوں میں ڈالنی جدائی۔ اس تقریب سے امیر الامرا سید حسین علی خاں کے واسطے تجویز صوبہ داری دکھن کی ہوئی، اور رخصت حضور سے ۱۱۲۷ھ گیارہ سو ستائیس ہجری میں اس مروت کے معدن کی ہوئی۔ ابھی دس کوس بھی دکن کی سمت کو نہیں گئی تھی سواری گئی، کہ ساری دلی پکارتی تھی "جنگ چوٹا اور نرد ماری گئی"۔ قصہ مختصر بعد کتنے دنوں کے، اور طے کرنے منزلوں کے، جب نربدا سے عبور ہوا تو ایک فوج عالی شان لے کر واسطے لڑائی کے سامنے داؤد خاں ناظم برہان پور ہوا، کیونکہ فرمان بادشاہی معرفت خان دوراں خاں کے اس کو آگے ہی پہنچ چکا ہے، کہ دفعیہ بیس امیر الامرا سید حسین علی خاں کے اگر تجھ سے قصور ہوگا، تو گنہگار حضور کا ہے۔ سبحان اللہ! یہ داؤد خاں وہی ہے، کہ اوائل سلطنت میں محمد فرخ سیر کے امیر الامرا نے اس کی جان بخشی کروائی ہے، اور احمد آباد گجرات سے اس کو باہر بھجوا کے سند صوبہ داری برہان پور کی حضور سے اس کے نام بھجوائی ہے۔ وہ حق احسان فراموش کر کے جان بخشی کے عوض میں خواہان جان ہوا۔

چنانچہ ۱۱۲۷ھ گیارہ سو ستائیس ہجری میں، گیارھویں تاریخ رمضان کی، لڑائی کا آراستہ میدان ہوا۔ بعد بہت سی خونریزی اور کشاکشی کے داؤد خاں نے بندوق کی گولی کھائی، بساط ہستی کی گنوائی، اور امیر الامرا فیروز جنگ نے ساتھ فتح اور فیروزی کے اورنگ آباد میں داخل ہو کر مسند حکومت کی آرایش فرمائی۔ اس حرکت سے کہ برہان پور کے ناظم سے ہوئی تھی، آئے ہی اہل خدمت برہان پور کے سب تغیر کئے۔ اس تقریب سے قزلباش خاں بھی معزول ہو کر حضور میں حاضر ہوئے۔ ازبسکہ سلیقہ علم مجلس کا اس مجموعۂ کمالات کو بہت بڑا تھا، اور مزاج دانی میں امرا کے بہ شدت دخل رکھتا تھا، طرز خدمت اس کی امیر الامرا کو نہایت پسند آئی، اور داروغگی حکومت کرناٹک کی واسطے قزلباش خاں کے قرار پائی۔ اس تقریب سے ارکاٹ کو گیا، اور ایک مدت بھر وہیں رہا۔ بعد زوال دولت سادات کے، کہ وہ قصہ مشہور ہے، اور یہاں کچھ بیان اس کا نہیں ضرور ہے، قزلباش خاں نے رفاقت مبارز خاں کی، کہ ناظم حیدر آباد کا تھا، اختیار کی۔

چنانچہ ۱۱۳۷ھ گیارہ سو سینتیس ہجری میں، جب نواب نظام الملک آصف جاہ سے اور مبارز خاں سے میدان میں شکر کھیڑی کے، کہ سات کوس اورنگ آباد سے ہے لڑائی ہوئی، تو قزلباش خاں بھی ساتھ تھا۔ مبارز خاں تو صیاد اجل کا نخچیر ہوا، اور قزلباش خاں دام ہستی میں پھنس کر دستگیر ہوئے۔ بعد کئی دن کے ایک غزل نواب کی تعریف میں، اور اپنے عذر تقصیر میں لکھ کر بھجوائی۔ بندش اس غزل کی نواب آصف جاہ کو پسند آئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں پھر تو ایسی موافقت آئی، اسی وقت بموجب حکم قید سے نجات ملی، اور جاگیر قدیم بدستور سابق بحال ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر تو ایسی موافقت آئی کہ قلعہ داری منی مرگ کی نواب نے عنایت فرمائی۔ یہ قلعہ ہے علاقہ میں کرناٹک کے، وہاں ہیرے کی کھان تھی۔ چنانچہ کشنا ندی سے ہے، اس کے کنارے سے ہیرا نکال کے وہاں تراشتے ہیں۔ چند مدت اس معدن معانی نے ہیرے کی کھان کی داروغگی میں اوقات نہایت

آب و تاب سے بسر کی، اور اسی عرصہ میں رخصت حج و زیارت کی لی۔ بعد حاصل کرنے سعادت
زیارت کے جو آیا، تو نواب آصف جاہ کو ویسا ہی توجہ اور عنایت کے ساتھ پایا۔ جب کہ
سنہ ۱۱۵۰ گیارہ سو پچاس ہجری میں نواب آصف جاہ حضور طلب ہوئے، اور شاہ جہان آباد
آئے، تو قزلباش خاں بھی ہمراہ رکاب تھے۔ اس میں کچھ شورش مرہٹوں کی تنبیہ کے لئے
مامور ہوئے، اور قزلباش خاں اس سفر میں فقط پاس رفاقت کر کے جدا دلی سے مجبور ہوئے

میر غلام علی آزاد تخلص، سرو آزاد جو اُن کا تذکرہ ہے، اُس میں لکھتے ہیں، کہ ان ایام
میں نواب آصف جاہ کو بھوپال کے سفر کا اتفاق ہوا، تو فقیر بھی عازم حج کا تھا۔ اس قافلے
کے پہنچنے کو عنایاتِ الٰہی سے سمجھ کر چلنا راہ کا اور اُترنا منزلوں کا باہم اختیار کیا۔ چنانچہ
قزلباش خاں سے مکرر اور متواتر ملاقاتیں اس سفر میں ہوئیں۔ عجیب مجمع کمالات نظر آیا۔
باوصف ولایت زائی کے ہندی راگوں کے گانے اور سمجھنے میں نہایت طبع چست اور
فہم درست رکھتا تھا، اور خوش اختلاطی اور رنگین مزاجی میں بھی کوئی مقام اس سے نہیں
چھوٹتا تھا۔ یہ لطیفہ اس کی زبانی ہے کہ "ایک دن میں نے کچھ شکایت زمانے کی نواب ذوالفقار خاں
بیٹے نواب اسد خاں، وزیر جو تھے، اُن کے سامنے کی، سُن کر فرمانے لگے کہ "سچ ہے دنیا کو
اُمید کے ساتھ بسر کرتے ہیں"، میں نے عرض کی کہ "اگر دنیا کو اُمید کے ساتھ بسر کرتے ہیں تو
افسوس ہے آپ مجھ بغیر دنیا کو بسر کرتے ہیں، کہ میرا تخلص "اُمید" ہے۔" غرض جب نواب آصف جاہ
بھوپال میں پہنچے، تو فوج نے مرہٹے کی شدتیں کیں، اور لڑائیاں مکرر ہوئیں۔ اس میں نادر شاہ
کے آنے کا غلغلہ ہندوستان کی طرف ہوا۔ نواب آصف جاہ نے اس ایام میں لڑائی کا طول
دینا مناسب نہ سمجھ کے، ساتھ دار و مدار کے مصلحتاً صلح کی، اور مع قزلباش خاں کے داخل
شاہ جہان آباد میں ہوئے۔ آگے نادر شاہ کا آنا، اور دلی کا لوٹے جانا، مشہور ہے یہاں کچھ
بیان اس کا نہیں ضرور ہے۔ غرض جب والی ایران کا ایران کو گیا، اور شہر میں امن و امان
ہوا، تو آصف جاہ حضور سے رخصت ہو کر پھر دکن کو سدھارے، اور قزلباش خاں نوکری

چھوڑ کر کمر کھول کر بیٹھ رہے، دلّی کی محبت کے مارے چندروز اور بھی ساتھ عیش و نشاط کے دیکھا جلوہ دم اور قدم کا، آخر سنہ ۱۱۰۹ھ گیارہ سو انسٹھ ہجری میں سکتے کی بیماری سے لاچار کیا سفر ملک عدم کا تقریب آٹھ ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس بلند طبع نے فکر کی ہے، اور ہندی میں گاہ گاہ بطور اختلاط کے کبھی کوئی غزل کہی ہے۔ یہ اشعار اُس ستودہ اطوار کے ہیں +

بانازِ حور و حُسنِ ملک، جلوۂ پری -
رفتم بپیش و گفتم جانم فدائے تست"
ایسی نہ سیتا، اور نہ بھوانی نہ رادھکا
گفتم کہ تیرے پانوں پڑم اُو بلائیم"

باہمن (برہمن) کی بیٹی ایک مری آنکھ میں کھڑی[1]
غصّہ کیا ہو گالی دیا، اور دگر (یعنی پھر) لڑی
کرتا[2] نے نہ ایسی کوئی دوسری گھڑی
گفتا کہ ڈاڑھی[3] جار مُغل تجھ کو کیا پڑی"

گفتم اُمید وصل پہ ہم تیرے جیتا ہوں"
گفتا کہ چل پرے دئی مارے تجھے مری"

یار بن گھر میں عجب صحبت ہے
دل ہمارا سے کرتا ہے رات
درد دل اس سے جو ہم نے نہ کہا
دہر میں پاسِ نفس لازم ہے

ولہ

در و دیوار سے اب صحبت ہے
غیر کے جو سر شب صحبت ہے
ایسی حاصل ہوئی کب صحبت ہے
شیشہ و سنگ یہ سب صحبت ہے

دستِ اغیار ہے زیرِ سرِ یار
آج اُمید کو ڈھب[4] صحبت ہے

[1] اور تذکروں میں کھڑی کی بجائے "پڑی" ہے جو "در نظرم افتاد" کا ترجمہ ہے ۱۲
[2] کرتا یعنی خدا ۱۲
[3] یعنی ریش سوختہ ۱۲
[4] یعنی کڈھب ۱۲

۵۔ آرزو

آرزو تخلص ہے، سراج الدین علی خاں نام، متوطن اکبرآباد کے۔ باپ کی طرف سے سلسلہ اس بزرگوار کا شیخ کمال الدین، بھانجے سے شیخ نصیرالدین کے، کہ چراغ دہلوی جنکا لقب تھا، ملتا ہے، اور ماں کی طرف سے شیخ فریدالدین عطار نیشاپوری کو پہنچتا ہے۔ چھوٹی عمر سے طبیعت اس بزرگ زادے کی پڑھنے لکھنے کی طرف مصروف تھی۔ چنانچہ چودھویں برس شعر کہنا شروع کیا، اور چوبیس برس کی عمر تک جتنی کتابیں درسی اور ضروری تھیں پڑھ چکا، فاضلوں سے عصر کے جس قدر کہ فائدہ چاہیے تھا اُٹھایا اور مرتبہ کو استعداد کے نہایت بلندی کو پہنچایا۔ بعد تحصیل علم کے بادشاہی منصب داروں میں داخل ہوکر وطن سے دور ہوا، یعنی اوائلِ سلطنت میں محمد فرخ سیر کی کوالیہ کی خدمتوں میں سے ایک خدمت کے ساتھ مامور ہوا۔ سنہ ۱۱۳۲ھ گیارہ سو بتیس ہجری تھی کہ دارالخلافہ ہندوستان میں آیا، اور زورِ شور شاعری کا زباں دانوں کو وہاں کے دکھایا۔ چنانچہ سنہ ۱۱۴۷ھ گیارہ سو سینتالیس ہجری میں، کہ شیخ محمد علی حزیں علیہ الرحمۃ ایران سے شاہ جہان آباد میں تشریف لائے۔ تو اس یگانۂ روزگار کی ملاقات کو شاہ و گدا سب آئے۔ سراج الدین علی خاں سے جس قدر اخلاق کہ مناسب اُن کے حال کے پایا شیخ نے ادا فرمایا۔ لیکن اس بزرگ زادے نے نسبت غرور کی شیخ کی طرف منسوب کی، اور ناحق اپنی طبیعت اُن سے محجوب کی۔ آزردہ خاطر وہاں سے گھر آئے اور دیوان شیخ کا دیکھ کر بہت سے شعر سقیم ٹھہرائے۔ چنانچہ وہ سب اعتراض جمع کرکے ایک رسالہ لکھا ہے، اور نام اُس کا "تنبیہ الغافلین" رکھا ہے[۱]۔ عوام کی طبیعت تو ان اعتراضوں سے البتہ تشویش میں پڑتی ہے، نہیں تو صاف نزاع معلوم

---

[۱] مولوی امام بخش صہبائی نے ایک رسالہ قولِ فیصل نام لکھا ہے، جس میں خان آرزو کے اکثر اعتراضات کے جواب دئے ہیں ۱۲

ہوتی ہے، جب باریک بینوں کی نگاہ اُس سے جا لڑتی ہے۔ غرض شاعر زبردست اور صاحب استعداد تھا، اکثر مضمون میں سے مضمون کو کرتا ایجاد تھا۔ لطیفہ گوئی اور ظرافت میں بہ شدت مشاق، خوش طبعی اور رنگین مزاجی میں شہرۂ آفاق تھا۔ اگرچہ سررشتہ ملاقات کا ان کو ایک جہان سے تھا، لیکن توسّل امورات دنیا میں نواب اسحٰق خاں سے تھا۔ بعد خرابی کے شاہجہان آباد کے نواب سالار جنگ کے ایما سے لکھنؤ میں آئے، لیکن فلک نیرنگ باز نے بیرنگی ہی کے رنگ دکھائے۔ چنانچہ لکھنؤ میں وصال ہوا ہے، اور لاش کو اُن کی، بموجب اُن کی وصیت کے، نواب سالار جنگ نے بعد سپردگی شاہجہان آباد کو بھجوا دیا ہے۔ بہت سی کتابیں اس ماہر فنون نے تالیف کی ہیں۔ اتنی تو نگاہ سے راقم عاصی کے بھی گزرے ہیں:۔ فن معانی میں ایک رسالہ لکھا ہے کہ نام اُس کا "موہبتِ عظمیٰ"[1] ہے۔ اور فن بیان میں ایک رسالہ اس کی تصنیف سے مشہور "عطیہ کبریٰ" ہے۔ اور ایک فرہنگ لکھی ہے، کہ نام اُس کا "سراج اللغت" ہے، بطور برہان قاطع کے۔ اور سوائے اس کے حال کی اصطلاحات میں ایک نسخہ تالیف کیا ہے، کہ مشہور ہے "چراغ ہدایت" کر کے۔ شرح اسکندر نامہ کی اور قصائد عرفی کی لکھی ہے۔ اور گلستاں کی شرح، کہ نام اُس کا "خیابان" ہے، تالیف کی ہے۔ ایک تذکرہ[2] فارسی گویوں کا نہایت لطیفوں کے ساتھ لکھا ہے۔ سوائے اس کے اور بھی بہت کچھ تحریر کیا ہے۔ ۱۱۶۹ھ گیارہ سو انہتّر ہجری میں اس فراغ پڑھنے والے مدرسہ زندگی کے نے کتاب ہستی کو گردان کے اُستاد اجل سے درس فنا کا پڑھا۔ قریب تیس ہزار بیت کے زبان فارسی میں اس کو کہنے کا اتفاق ہوا ہے، اور ریختہ کا قصد گاہ گاہ بطریق تفنن کے کیا ہے۔ یہ اشعار ہندی طبع زاد اُس کے مشہور ہیں ❖

میخانہ بیچ جا کر شیشے تمام توڑے		نا صحا نے آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے	
جان کچھ تجھ پر اعتماد نہیں	ملہ	زندگانی کا کیا بھروسا ہے	

[1] یہ رسالہ چھپ گیا ہے ۱۲ [2] اس تذکرے کا نام مجمع النفائس ہے ۱۲

آتا ہے صبح اُٹھ کے تیری برابری کو ـ کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
(ولہ)
دل مارنے کا نسخہ پہنچا ہے عاشقوں تک ـ کیا کوئی جانتا ہے اس کیمیاگری کو
اس تندخو صنم سے ملنے لگا ہے جب سے ـ ہر کوئی مانتا ہے میری دلاوری کو
اپنی فسوں گری سے اب ہم تو ہار بیٹھے ـ بادِ صبا یہ کہنا اس دل ربا پری کو
اب خواب میں ہم اُس کی صورت کو ہیں ترستے ـ اے آرزو ہوا کیا بختوں کی یاوری کو"

فلک نے رنج تیر آہ سے میرے زبس کھینچا ـ لبوں تک دل سے شب تا کو میں نیم رس کھینچا
(ولہ)
مرے شوخِ خراباتی کی کیفیت نہ کچھ پوچھو ـ بہارِ حُسن کو دی آب اُس نے جب چرس کھینچا
رہا جوشِ بہار اس فصل گریوں ہی تو بُلبُل نے ـ چمن میں دستِ گلچیں سے عجب رنج اس برس کھینچا
کہا یوں صاحب محمل نے سُن کر سوز مجنوں کا ـ تکلف کیا جو نالہ بے اثر مثلِ جرس کھینچا
نزاکت رشتۂ اُلفت کی دیکھو سانس دشمن کی ـ خبردار آرزو تک گرم کرتا نفس کھینچا

۶- آبرو

آبرو تخلص، شاہ نجم الدین نام، ساکن شاہ جہان آباد۔ اولاد میں شیخ محمد غوث گوالیری کے تھے۔ سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ داران قریب میں۔ اور صاحب دیوان تھے زبان ریختہ کے۔ ترکیب میں بیشتر اشعار اُنھوں نے ایہام کے کہے ہیں، یعنی اکثر وہ الفاظ شعر میں لائے ہیں، کہ جن لفظوں کے دو معنی ہیں، اگرچہ بامعنی یا لایعنی۔ محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے عہد سلطنت میں اُنھوں نے جہان فانی سے رحلت کی ہے۔ ان شعروں نے آبروان کے دیوان کو دی ہے ٭

خوبرویوں کے ہواخواہ میں یہ تب کرنا دوا ـ تیر کی بات رہی چھپ کے کی اور ابھی صفا

کیا سبب تیرے بدن کے گرم ہونے کا سجن	عاشقوں میں کون جلتا تھا گلے کس کے لگا
تو گلے کس کے لگی لیکن کسی بے رحم نے	گرم دیکھا ہوگا تجھ کو بیچ میں آنکھوں کے لا
آوِ سرد اور چشمِ تر عاشق کی سے دسواس کر	بد بہت ہے مختلف جس وقت ہو آب و ہوا
دل مرا تعویذ کر تو لے کے اپنے پاس رکھ	تو طفیلِ حضرتِ عاشق تجھے ہووے شفا
ترش روئی چھوڑ دے اور تلخ گوئی ترک کر	اور کھانا جو کہ ہو خوش کا تری[۵۱] سو کر غذا

بو علی ہے نبض دانی میں بتاں کے آبرو
کیوں نہ ہووے عاشقی میں اس کا نسخہ کیمیا

بوسہ لبوں کا دینے کہا کہہ کے پھر گیا	ولہ	پیالہ بھرا شراب کا افسوس گر گیا

قول آبرو کا تھا کہ "نہ جاؤں گا اس گلی"
ہو کر کے بے قرار دیکھو[۵۲] آج پھر گیا

وعدے تھے سب خلاف جو اس لب سے ہم تلک	ولہ	کیا لعل قیمتی دیکھو جھوٹا نکل گیا
یہ سبزہ اور یہ آب رواں اور ابر یہ گہرا	ولہ	دوانا نہیں[۵۳] کہ میں گھر میں رہوں گا چھوڑ کر صحرا
چوپڑ کے کھیلنے[۵۴] کا سارا یہ ہے خلاصہ	ولہ	شاید کبھو وہ سر کا بیٹھے ہمارے پاس آ۔
تم اور گلرخوں سے اب آنکھ جو لگا سے		بادام کو پیارے پھولوں کے بیچ باسا
پی کر شراب جو تم ہم کو ڈراوتے ہو		کیا شوق کو ہمارے جانا ہے اور کا سا
جھپٹ آیا میں رقیبوں کو گویا ماردیا	ولہ	یار نے اپنے گلے کا مجھے جب ہار دیا
رستے کوئی[۵۵] اس طرح کے لالچی کو کب تلک بہلا	ولہ	چلی جاتی ہے فرمایش کبھی یہ لا کبھی وہ لا
میرے پیارے سے قاصد اپنے دل کی بات مت کہنا	ولہ	کہ جانے سے تمہارے جان کو مشکل ہے اب رہنا

۵۱ "خوش کا تری" یعنی "تیری مرضی کا" "خشکہ" کا ابہام بھی مقصود ہے ۱۲ ۵۲ "دیکھو" کو "دکھو" پڑھنا چاہئے، ورنہ مصرع ناموزوں ہوگا ۱۲ ۵۳ "نہیں" کو "نہ" کے وزن میں پڑھنا چاہئے ۱۲ ۵۴ یعنی چوپڑ کھیلنے سے سارا مقصد یہ ہے ۱۲ ۵۵ قدما "کوئی" کو "کُئی" کے لہجہ میں ادا کرتے تھے۔ یہاں بھی اسی طرح پڑھنا چاہئے ورنہ مصرعہ ناموزوں ہوگا۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے	ولہ	کہ اس کو بدنما لگتا ہے جیسے چاند کو گہنا
سیج اوپر غیر کی رہتا ہے اب لوٹا ہوا	ولہ	زر کے لالچ اس قدر وہ سیم تن کھوٹا ہوا
جو لونڈا[۱] نام سُن امردپرستی کا چڑھے چو سنکے	ولہ	میں اس کو پیچ دے باتوں میں لگ جاتا ہوں جوں لاسا
عاشقوں میں جس کسی کا یار ہو راضی مرا	ولہ	وہ مرا دشمن ہے لیکن چاہتا ہے جی مرا
جس طرح سے اے نامہ بر آیا ہے چلا جا	ولہ	جا کر کے یہ کہہ کل نہیں آیا ہے تو آ جا
فرہاد کا دل کوہ کنے کا بھرا پیالا ہوا	ولہ	مستی سے جس کی شوق کی بہہ نکلے متوالا ہوا
کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوگی	ولہ	اس دلِ بے قرار کی صورت

میر

زندگی ہے ۔ اِب کی سی طرح	ولہ	باؤ بندی حباب کی سی طرح
کون چاہے گا گھر بسے تجھ کو		مجھ سے خانہ خراب کی سی طرح
آبرو کے قتل کو حاضر ہوا کس کر کمر	ولہ	خون کرنے کو چلا عاشق پہ تہمت باندھ کر
جس وقت زخم تیر الگتا ہے غیر کے تئیں	ولہ	اُس وقت جان سیتی جاتے ہیں جان ہم
دھمکاتے ہیں ہم کو کمر باندھ باندھ کر	ولہ	کھولے ابھی تو جادے میاں کاکل بھرم
کن نے آ باغ میں حیران کیا نرگس کو	ولہ	نہیں معلوم کہ یہ دیکھ رہی ہے کس کو
کہتا ہوں میں پکار، سنو کان دھر سجن	ولہ	جو اَور سے ملوگے تو دیکھوگے ہم نہیں
ہرگز ترے لبوں کی سرخی کے تئیں نہ پہنچیں	ولہ	ہر چند سعی کر کر یاقوت و لعل مر جائیں
اک عمر سے چھپ کر کرنی ہے ہم کو تم سے		راضی ہو گر کہو تو خلوت میں آ کے کر جائیں
اٹک چلنا سجن کا بھولتا مجھ کو نہیں اب تک	ولہ	طرح وہ پانوں رکھنے کی مری آنکھوں میں پھرتی ہے
زلف کے عقدے کھلے اب تو بھی مشکل ہوئی	ولہ	دل کے اوپر یہ نئے سر سے بلا نازل ہوئی
میاں[۲] کے لوگ کہتے ہیں کمر ہے	ولہ	کہاں ہے کس طرح کی ہے کدھر ہے
دل کب آوارگی کو بھولا ہے		خاک گر ہو گیا بگولا ہے

۱ اس شعر سے اُس زمانے کی اخلاقی حالت ظاہر ہوتی ہے ۲ یہی شعر بہ ادنیٰ تغیر جرأت کی طرف منسوب ہے، ۲

پھرتے تھے پھرتے دشت دیوانے کدھر گئے ولہ وے عاشقی کے ہائے زمانے کدھر گئے
مژگاں تو تیز تر ہے ولیکن جگر کہاں ترکش تو ہیں بھرے پہ نشانے کدھر گئے
نازک تنی پہ اتنے مغرور ہو رہے ہو ولہ موسی کمر نہیں تو فرعون کر رکھا ہے
اُٹھ صحبت کہیں جنوں سی خاطر نخچنت کی ولہ اے کچھ بہار تجھ کو خبر ہے بسنت کی

یعنی ہو رہو

۷-احسن

احسن تخلص، میرزا احسن نام، جوان نیک خصلت ہے۔ ابتدا میں میر رضا سے اتفاق اصلاح کا ان کو ہوا ہے۔ بعد اس کے میرزا محمد رفیع السودا سے مشورہ سخن کا کیا ہے ریختہ ان کا خالی کیفیت سے نہیں ہے، اور بندش شعر کی صاف اور شیریں ہے۔ فی الجملہ خبرت بھی رکھتے ہیں، اور نستعلیق وغیرہ اکثر اقسام خطوط بھلے چنگے لکھتے ہیں۔ ابتدا میں وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کی سرکار میں سر رشتہ ملازمت کا رکھتے تھے، بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں ایک مدت سے نواب سرفراز الدولہ میرزا احسن رضا خاں بہادر کی رفاقت میں ایام زندگانی کے بسر کرتے ہیں۔ لکھنؤ میں بود و باش ہے۔ اور یہ ان کا منتخب تلاش ہے +

ہجر میں کیوں کر نہ ہووے آہ و زاری بیشتر ہے قرار اس دل میں کم و بیقراری بیشتر
کیوں تغافل دین و دنیا دل ہمارا بھول جائے یاد رہتی ہے ہمیں پیارے تمہاری بیشتر
پیشتر تھی ہم کو اُس سے دوستی اک طرح کی اب تو بتلا دے ہے تلوار و کٹاری بیشتر
روز ہجراں ہی میں تنہا کچھ نہیں روتے ہیں ہم وصل کی راتیں کٹیں یوں ہی ہماری بیشتر

بن کے خاک اب اُس کے کوچے سے بھلا کیونکر اُٹھوں
ہے مزاج اپنے میں احسن خاکساری بیشتر

نہ نالہ ہے دل میں، نہ آہ حزیں ہے کوئی دم ہے یاں، سو دم واپسیں ہے
گئے دن جو آنکھوں سے بہتے تھے دریا ادھر دیکھ لو، خشک اب آستیں ہے

گیا دل جو کوچہ میں چین جبیں کے
قدم رکھ نہ اپنا مرے دل سے باہر
نہ پھر وہاں سے نکلا عجب سرزمیں ہے
کہا مان میرا، یہ گھر دل نشین ہے

نہ کھینچ آسماں پر سر اپنا تو احسن
سمجھ آخرش سب کا مدفن زمیں ہے

یارو وہ صنم کیوں نہ کرے کام خدا کا
ولہ
رام اُس کا خدا ہے وہ نہیں رام خدا کا

سر اپنے کو جیوں لے گئے ہم اُس کے قدم تک
ولہ
پہنچا دیا ٹھوکریں وہیں ملک عدم تک

سجدہ گہ ہے خاک احسن اب تو سارے خلق کی
ولہ
جان دی تھی اُس نے کس کی حسرت پابوس میں

دل ہو دیدار سے مایوس تو مسرور نہ ہو
ولہ
چشم میں روشنی طور سے بھی نور نہ ہو

بزم میں اُس کی جو ہوتی ہے کبھی سرگوشی
دل دھڑکتا ہے کہ میرا کہیں مذکور نہ ہو

ہے مجھ میں رمق، دیدہ تجھے تا نگراں ہے
ولہ
جیوں شمع مرا تار نگہ رشتۂ جاں ہے

محرم ہم ہوں، محرم اسرار ہو کوئی
ولہ
خلوت میں ہو کوئی، پس دیوار ہو کوئی

راتوں کو اُس کے کوچہ میں جاتا تو ہوں ولے
دھڑکے ہے دل پڑا کہ نہ بیدار ہو کوئی

پہنچی جس وقت مجھے اس کی خبر آنے کی
ولہ
سدھ رہی مجھ کو نہ اپنے کی نہ بیگانے کی

تم تو دل مانگو ہو، یاں جان تلک حاضر ہے
بات یہ بھی ہے کوئی آپ کے فرمانے کی

۸-الہام

الہام تخلص، شیخ شرف الدین نام، لکھنؤ کے شیخ زادوں میں سے ہیں۔ صغر سن ہے دیکھتا ہوں ان کو، اسباب دنیا سے قانع بہ یک چادر ہیں، اور سر و پا برہنہ بیٹھے رہتے خاک پر ہیں۔ زود گوئی کی مشق اس مرد کو حد سے افزوں ہے، یہاں تلک کہ ایک مصرع نہیں لکھا جاچکتا کہ دوسرا موجود ہے۔ اسی طرح سو سو بیت تک ایک دریا جوش مارتا چلا جاتا ہے، لیکن اس زود گوئی کے باعث سے اکثر کلام ان کا گفتگو میں بھی آتا ہے۔ وہ دیوان فارسی زبان میں

رکھتے ہیں، اور ہندی میں بھی اکثر کچھ کچھ کہتے ہیں۔ آگے ملول تخلص کرتے تھے، اب تخلص الہام ہے۔ بیشتر اہل لکھنؤ کو، شاگردی کے سوائے، ان سے اعتقاد تمام ہے۔ یہ غزل ان کی جو لکھی جاتی ہے، البتہ ایک عالم کو اضطرارِ دل کا دکھاتی ہے ◆

دیکھا نہ ہو جس نے کبھو سیماب کا عالم ۔۔۔ آ دیکھے وہ میرے دلِ بیتاب کا عالم
اے ابر تِرہ ناصحوں کی ضد سے تو یکبار ۔۔۔ سب ارض و سما آوے نظر آب کا عالم
یاقوت کی رنگت پہ کبھی آنکھ نہ جاوے ۔۔۔ دکھلاؤں اگر چشم کے خوناب کا عالم
گل پرتوِ حسنِ رخِ دلدار کے آگے ۔۔۔ پھیکا نظر آیا ہمیں مہتاب کا عالم

مانی ترا و اللہ [1] ہو بندا
کھینچے تو اگر دل کے تب و تاب کا عالم

اری بیکسی تیرے قربان ہوں ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ برے وقت میں ایک تو رہ گئی

٩۔ اثر

اثر تخلص، میر محمد نام، شاہجہان آبادی۔ چھوٹے بھائی تھے خواجہ میر درد مرحوم کے، واقف تھے فن تصوف سے، اور آگاہ تھے علمِ معرفت سے۔ بطور درویشان صاحب معنی کے گوشہ نشینی اختیار کی تھی، اور درد و اثر کے ساتھ نہایت طبیعت ہموار کی تھی۔ بھائی سے اپنے اُنہوں نے کسب کمالوں کا کیا ہے، سچ تو یہ ہے کلام ان کا چاشنی سے درد و اثر کی آشنا ہے۔ ایک مثنوی بہت طولانی بیانِ عشق میں ان کی تصنیف سے ہے، اگرچہ انتخاب اس کا لکھا گیا بہت تخفیف سے ہے ◆

آہ کے ساتھ جی نکل نہ گیا ۔۔۔ آہ اے آہ یہ خلل نہ گیا

میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہو گیا

[1] اصل نسخہ میں سادہ جگہ چھوڑ دی ہے غالباً "یہ الہام" کا لفظ تھا ١٢

بس ہو یارب یہ امتحاں کہیں — ولہ — یا نکل جائے اب یہ جان کہیں
وائے غفلت! کہ ایک ہی دم میں — میں کہیں، اور کاروان کہیں

بے وفا تجھ سے اب گلا ہی نہیں — ولہ — تو تو گویا کہ آشنا ہی نہیں
یا خدا پاس، یا بتاں کے پاس — دل کبھی اپنا یاں رہا ہی نہیں
دل سے جو چاہئے سو باندھئے بات — میں نے واللہ کچھ کہا ہی نہیں

تجھ سوا کوئی جلوہ گر ہی نہیں — ولہ — پر ہمیں آہ کچھ خبر ہی نہیں
دردِ دل چھوڑ جائیے، سو کہاں؟ — اپنے باہر تو یہاں گذر ہی نہیں
حال میرا نہ پوچھئے مجھ سے — بات میری تو معتبر ہی نہیں

کردیا کچھ سے کچھ ترے غم نے
اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

کیا کیجے اختیار نہیں دل کی چاہ میں — ولہ — ہیں سب وگرنہ یہ تری باتیں نگاہ میں

ہم ہیں بیدل، دل اپنے پاس نہیں — ولہ — آہ اس کا بھی تجھ کو پاس نہیں
پوچھ مت حالِ دل مرا مجھ سے — مضطرب ہوں مجھے حواس نہیں
بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر — مجھ کو میری وفا ہی راس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے
پر اثر کی تو ہم کو آس نہیں

میں کہاں تو کہاں، یہ کہتے ہیں — ولہ — کہ یہ آپس میں دونوں رہتے ہیں

جو سزا دیجے، ہے بجا، مجھ کو — ولہ — تم سے کرنی نہ تھی وفا مجھ کو

وہی میں ہوں اثر وہی دل ہے
اب خدا جانے کیا ہوا مجھ کو

ایک تنہا خاطرِ محزوں، جسے آزار سو — ولہ — ایک مجھ بیمار سے وابستہ ہیں آزار سو

کچھ ان روزوں دل اپنا سخت بے آرام رہتا ہے ولہ اسی حالت میں لیکر صبح سے تا شام رہتا ہے
بیاں میں کیا کروں اب اس سے آگے اپنی ناکامی ترے یہ طور، اور مجھ کو تجھی سے کام رہتا ہے

اثر کیجئے کیا، کدھر جائیے ولہ مگر آپ ہی سے گندھ جائیے
کبھو دوستی اور کبھو دشمنی تری کون سی بات پر جائیے

صرفِ غم ہم نے زندگانی کی ولہ واہ کیا خوب زندگانی کی!

ناک تیری عجب چھبیلی ہے ولہ پتلی اور اونچی اور نکیلی ہے

ناک ہے، یا کہ ایک توتا ہے ولہ چونچ اب شہد میں ڈبوتا ہے
تجھ ایسے ترے پھڑکتے ہیں جانور وحشی جیوں پھڑکتے ہیں
ذائقہ میں تو جیسے یہ لب ہیں شہد و شربت جو کچھ کہو سب ہیں
دانت جب مجھکو یاد آتے ہیں دل کلیجا سبھی چباتے ہیں
دیکھ کر آنکھیں آبدار کو یہاں لوٹ جاتا ہے گوہرِ غلطاں
گر کبھو اس کے جی میں آوے ہے مسی دو انگلیاں لگاوے ہے
دانت پھر یوں چمکتے ہیں سارے رات اندھیری میں جیسے ہوں تارے
جب خیال آ بندھے ہے گردن کا یہاں ڈھلک جائے ہے مرا منکا
گو کہ شفاف ہے تنِ مینا یہاں تو جھکتی ہے گردنِ مینا
کیوں نہ کھینچے وہ سب سے آپ کو دور جس میں ایسا بھرا ہوا ہو غرور
دھیان میں جب وہ بازو آتے ہیں ہاتھ پاؤں اپنے پھول جاتے ہیں

کیا خوش ترندیہ کلائی ہے
اس کو دل لینے کی کل آئی ہے

ملہ مولوی حالی صاحب نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں لکھنؤ کی شاعری میں صرف نواب مرزا شوقؔ کی مثنویوں کا اعتراف کیا ہے، لیکن چونکہ ان کے نزدیک شعرائے لکھنؤ سے ایسی فصاحت اور سلاست کی توقع نہیں ہوسکتی، اس لئے اس کی وجہ قرار دی کہ نواب مرزا نے خواجہ میر اثرؔ کی مثنوی دیکھی تھی، اور اس کا طرز اڑایا تھا۔ یہ اشعار اسی مثنوی کے ہیں۔ اس کا فیصلہ خود ناظرین کرسکتے ہیں کہ یہ مثنوی نواب مرزا کا ماخذ اور نمونہ ہوسکتی ہے ۱۲

۱۰- الم

الم تخلص، صاحب میر نام، شاہجہان آبادی۔ خلف الصدق خواجہ میر درد مرحوم کے۔ درویش صاحبِ حقیقت اور پہچاننے والے رموز معرفت کے ہیں۔ سنہ ۱۱۹۴ھ گیارہ سو چورانوے ہجری میں رونق بخش بلدۂ مرشد آباد کے ہوئے تھے، اور دوستی سے راجہ دولت رام کی چند مدت اس شہر میں رہے تھے۔ بالفعل کہ سنہ ۱۲۱۵ھ ہجری ہیں، شاہجہان آباد میں توکل اور قناعت کے ساتھ اوقات شریف کو بسر کرتے ہیں۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں۔

دھمکاتے ہیں بس مجھ کو فقط آپ اکڑ کر　　بانکے ہو تو مونڈھا چلو مونڈھے سے رگڑ کر
ہنگامِ فغاں تھا خس و پنبۂ قفس و دام　　تارِ رگِ گل نے ہے رکھا ہم کو جکڑ کر
جب نام خدا دور سے وہ جلوہ نما ہو　　مرجائیں صفوں کی صفیں حیرت سے بچھڑ کر
مندیل کا تو پیچ اٹھا بیٹھے گا اے شیخ　　چھٹ اس کے نہ کچھ پاویگا رندوں سے جھگڑ کر

آجاتا ہے ذکر درد بھلانے کو الم یہاں
کیا اس سے مزا تم ہو اٹھاتے بھلا لڑ کر

رباعی

نہ دل کو قرار بے قراری کے سبب　　نہ چشم کو خواب اشک باری کے سبب
واقف نہ تھے ہم تو ان بلاؤں سے کبھو　　جو کچھ دیکھا سو تیری یاری کے سبب

۱۱- اشتیاق

اشتیاق تخلص، شاہ ولی اللہ نام، متوطن سرہند کے۔ اس رونق بخشِ دینِ احمدی کا سلسلۂ ارادت شیخ احمد کو، کہ مجدد الف ثانی جن کا لقب تھا، پہنچتا ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاہ محمد گل کو مرید ان کا لکھا ہے، لیکن راقم حقیر کے گوش زد یہ مضمون نہیں ہوا ہے۔ فی الحقیقت مرتبہ علم کا اس عالی جناب کے نہایت بلند تھا خصوص علم حدیث اور تفسیر میں بہت

بڑی دستگاہ رکھتے تھے، یہاں تک کہ اسم گرامی اس برگزیدۂ روزگار کا زبانِ خلائق پہ آج کے دن تک شاہ ولی اللہ محدث کرکے جاری ہے۔ اکثر کتابیں تصنیف اس بحر علم کی مشہور ہیں۔ چنانچہ دو نسخے کہ ایک کا نام "قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسین" ہے، اور دوسرے کا نام "جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ"[1] کہتے ہیں تصنیفات سے اس ہمی ملیدین کی یادگار صفحہ روزگار پر ہیں۔ والد ماجد ہیں یہ اُس رونق بخش کشور قناعت کے، کہ جس کا نام نامی مولوی عبدالعزیز ہے۔ آج کے دن تک قدم توکل گاڑے ہوئے شاہجہان آباد میں بیٹھے ہیں، باوصفیکہ[2] تفضل حسین خاں مرحوم نے بموجب ایما صاحبان عالی شان کے مدرسہ قدیم کی مدرسی کے واسطے تحریک اس مرکز دائرۂ قناعت کی چاہی، لیکن اس قطب آسمانِ ملت و دین نے مطلقاً حرکت جگہ سے نہ فرمائی۔ اس فاروق زماں کی بھی تالیف سے ایک کتاب ہے، کہ نام اس کا "تحفۂ اثنیٰ عشریہ" ہے، اور دوسرا نام "رد روافض" شاید کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے دیکھنے سے اس کتاب کے استعداد اس بزرگ زادے کی معلوم ہوتی ہے، کہ کیا دریا فصاحت کا بہایا ہے۔ کیوں نہ ہو آخر کیسے باپ کا بیٹا ہے۔ فی الواقعہ کہ عالی مقداروں کے عالی مقدار ہوتے ہیں، اور نابکاروں کے نابکار، بقول ایک شاعر کے؛

شیر کے بچے میں غرش شیر سے افزود ہے	بھونکنے میں کتے کی پلی کی سگی موجود ہے

الغرض وہ جامع جمیع علوم یعنی شاہ ولی اللہ مرحوم حین حیات میں اپنی کوٹلہ میں فیروزشاہ کے تشریف رکھتے تھے۔ اوقات شریف کو بطور درویشان اہل معنی کے بسر کرتے تھے۔ اشعار فارسی کے فرمانے کا اتفاق کمتر ہوتا تھا، اور زبان ریختہ کا مشغلہ اکثر۔ یہ اشعار خلاصۂ افکار اُس حقیقت آگاہ کے ہیں؛

---

[1] دونوں نام غلط ہیں۔ پہلی کتاب تفضیل شیخین میں ہے۔ شہادت امام حسین علیہ السلام کی ابطال سے خدانخواستہ اس کو کوئی تعلق نہیں۔ اور دوسری کتاب تو بالکل فرضی ہے۔ معاویہ کے مناقب میں ان کی کوئی کتاب نہیں ۱۲

[2] شاہ ولی اللہ صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب دونوں کی مصنف نے ہجو ملیح کی ہے۔ اور اس شعر نے تو صاف پردہ اُٹھا دیا ہے ۱۲

خیال دل کو ہے اس گل سے آشنائی کا
نہیں صبا کو ہے دعویٰ جہاں رسائی کا

کہیں وہ کثرتِ عشاق سے گھمنڈ میں آ
ذروں ہوں میں کہ نہ دعویٰ کرے خدائی کا

مجھے تو دھوکے[لہ] کے تھا زاہد پر اک نگاہ سے آج
غرور کیا ہوا وہ تیری پارسائی کا

جہاں میں دل نہ لگانے کا لیوے پھر کوئی نام
بیان کروں میں اگر تیری بے وفائی کا

نہ چھوڑا یار بھی کھا کر گذر گلی کا تری -
رقیب کو مرے دعویٰ ہے بے حیائی کا

نہیں خیال میں لاتے وہ سلطنت جم کی
غرور ہے جنہیں در کی تری گدائی کا

جفائے یار سے مت اشتیاق پھیر کے مُنہ
خیال کیجو کہیں اور جبہ سائی کا

لڑکوں کے پتھروں سے لگے کیونکہ اسکو چوٹ
پر ایک سکر دیا ہے یہ مجنوں کو ڈھول کوٹ

ولہ
چھوڑ کر تجھ کو ہمیں غیر سے جو لاگ لگی
نہیں مہندی یہ ترے تلوؤں سے ہے آگ لگی

ولہ
وہ بالا ہو کے مخموری عبث آنکھوں کو ملتا ہے
پیالہ اور بھی پی پی سجن یہ دور چلتا ہے

۱۲- انشا

انشا تخلص، میر انشاء اللہ خاں نام، بیٹے ہیں حکیم میر ماشاء اللہ خاں کے، مصدر جن کا تخلص تھا۔ عجب شخص خوش اختلاط اور صاحب استعداد ہے۔ سوائے قصیدوں کے مثنویاں زبان عربی میں انہوں نے نظم کی ہیں، اور ترکی کی غزلیں بھی ان کی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ زبان فارسی میں صاحب دیوان ہیں۔ کشمیری اور مارواڑی کے سوائے اور بھی بہت سی بولیوں کے زبان دان ہیں۔ سال گذشتہ انہوں نے ایک قصیدہ زبان ریختہ میں غیر منقوط، یعنی جن کے اشعار میں کوئی حرف صاحب نقطہ نہیں ہے، نواب عماد الملک کی مدح میں لکھ کر کاپی بھجوایا۔ وہ صلے میں اس کے انعام تحسین اور آفرین کا بہت

[لہ] یعنی منہ دیتا تھا ۱۲

سا پایا۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ ہجری ہیں، مرشدزادۂ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کے سایۂ عاطفت میں لکھنؤ کے اندر اوقات ساتھ قناعت اور شکستہ پائی کے بسر کرتے ہیں۔ دیوان انکا زبان ریختہ میں مشہور ہے، اور کلام ان کا ظرافت اور خوش اختلاطی سے معمور۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں +

تم جو کہتے ہو، "مجھے تو نے بہت رسوا کیا"
کیا گنہ، کیا جرم، کیا تقصیر میں نے کیا کیا

واسطہ، باعث، سبب، موجب، باعث، کچھ بات بھی
راز وہ کم بخت آیا تھا، میں نے جو افشا کیا

کیا کہا؟ کن نے کہا؟ کس سے کہا؟ کب؟ کس گھڑی؟
کس جگہ؟ کس وقت؟ کس دم؟ آپ کا چرچا کیا

کچھ پتا بھی؟ نام اس کا؟ شکل کیسی؟ وضع کیا؟
جس کسی نے آن کر مذکور اس ڈھب کا کیا

گبر ہے وہ؟ یا مسلمان؟ یا نصارا؟ یا جہود؟
اس طرح کا تذکرہ جس شخص نے میرا کیا

شیخ ہے وہ؟ یا مغل ہے؟ یا کہ سید؟ یا پٹھان؟
موچھ ڈاڑھی ہے؟ کہ مولا نے اسے تم سا کیا؟

ہے جواں سا؟ یا وہ امرد؟ یا کہ بوڑھا؟ یا ادھیڑ؟
مرد ہے؟ یا حق تعالیٰ نے اسے خنثا کیا؟

نوکری پیشوں میں ہے؟ یا اہل حرفہ وہ عزیز؟
کون ہے جس نے ابھی آ کے تمہیں یہ جا کیا؟

کس محلہ میں رہے ہے؟ ہے کہاں کا وہ خبیث؟
کوئی شیطاں ہے کہ جس نے یہ دنگا کیا

کذب، بہتاں، افترا، طوفاں، غلط، بالکل دروغ
میں تمہارا نام لے کب بھلا رویا کیا

مرحبا، شاباش، اے رحمت خدا کی، آفریں
میرے حق میں تم نے باہر، اور کا کہنا کیا

چودھویں تاریخ اک ابرِ تُنک سا تھا جو رات
صحنِ گلشن میں سحاب سیر میں دیکھا کیا

جھلملی سی چادرِ مہتاب، اوپر برق کا
وہ دوپٹا بادلے کا سا جو لہرایا کیا

یوں لگا معلوم ہونے، ہیں یہ دو پریاں ہم
ایک نے گویا کہ سایا دوسری پر آ گیا

ہوئے گل بولی کہ آج آپس میں بدلی اوڑھنی
چاندنی بالی نے بی خیلا سے بہناپا کیا"

تو بدولت تو نہ آئے، اور انشا رات بھر
آپ بن رو دیا کیا، لوٹا کیا، تڑپا کیا

گالی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی	ولہ	یہ سب سہی، پر ایک نہیں کی نہیں سہی
گر نازنیں کے کہنے سے مانا ہو کچھ بُرا		میری طرف کو دیکھئے! میں نازنیں سہی
آگے بڑھے جو جاتے ہو کیوں کون ہے یہاں		جو بات تجھ کو کہنی ہے مجھ سے یہیں سہی

منظور دوستی جو تمہیں ہے ہر ایک سے
اچھا تو کیا مضائقہ انشاؔ سے کیں سہی

بندہ اُسے جب نظر پڑا ہے	ولہ	بولا ہے "چل اُٹھ ادھر پڑا ہے"

ہوئے ہیں خاک سرِ راہ اُس کے ہم انشاؔ
بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

۱۳- امانیؔ

امانیؔ تخلص، میر امانی نام، خلف ہیں یہ خواجہ آثمؔ کے، جن کا مذکور اوپر ہوا ہے۔ ۱۱۸۱ھ گیارہ سو اکاسی ہجری میں وارد مرشد آباد کے ہوئے تھے، اور جناب سید الشہدا کی تعزیہ داری کا شغل ہمیشہ رکھتے تھے۔ مرثیۂ ہندی اپنے کہے ہوئے اکثر ممبر پر کھڑے ہو کر پڑھتے، اور مومنین کے تئیں سعادت گریہ کی دولت سے داخل ثواب کرتے۔ ایک شب جناب سید الشہدا علیہ السلام کی عین تعزیہ داری میں، کہ ۱۱۸۷ھ گیارہ سو ستاسی ہجری تھے، بیہوش ہو کر سیر کرنے والے روضۂ رضوان کے ہوئے۔ حق سبحانہ تعالیٰ مغفرت کرے عجب مرد خوش اعتقاد اور دیندار تھا۔ نشۂ محبت میں اہل بیت نبوی کے سرشار تھا۔ یہ اشعار یادگار اُس کے لکھے جاتے ہیں:

اُس کے کوچہ سے تیری غبار اُٹھا	کون ساواں سے خاکسار اُٹھا
عندلیبو بساؤ اب صحرا	باغ سے موسم بہار اُٹھا
ہچکیاں لے گلابیاں روئیں	بزم سے جب وہ مے گسار اُٹھا

عزم رخصت ہوا جب ہی اُس کا — میرے دل سے وہیں تو اِک اُٹھا
نہیں جو قدرِ اشک، عالم سے — موتیوں کا گر وقار اُٹھا
شمع سے سوز امانی پوچھا تیرا — اک دھواں اسکے دل سے یار اُٹھا

ولہ
راہ تکتے تکتے آخر جیسے آیا تنگ دل — آنکھیں تو پتھرا گئیں، پر وہ نہ آیا سنگدل
ہو چکا ہے غم سے خوں، اب جلد بہہ جائیں نہیں — خوف ہے یارب! نہ بدلے اور بھی کچھ رنگ دل
قدر جان اس کی کہ اک عالم سے یہ بیگانہ ہو — کر رہا ہے تیر قدر پر کھوکے نام و ننگ دل
فندقِ پا کس کی دیکھی آہ اجکے غم سے آج — قطرۂ خوں ہو بنا رشکِ گلِ اورنگ دل
اپنی آنکھوں آگے کو اس کی گلی میں ہے پڑا — پر امانی آپ سے ہے سیکڑوں فرسنگ دل

ولہ
گھیرا ہے مجھے غم نے عجب حال ہے جی کا — اے نالۂ دل! وقت ہے فریاد رسی کا
سینہ میں جدھر رو ہو ترا پھونک دے اے آہ — ٹک دل سے خبردار! کہ یہ گھر ہے کسی کا

ولہ
اُس کے کوچے سے صبا آج اس طرف آئی نہیں — دیر ہوئی وہاں مقیموں کی خبر پائی نہیں
وائے اپنی اس بصارت پر، کہ ہر ذرہ میں آہ! — جلوہ گر ہے آفتاب، اور تاب بینائی نہیں

ولہ
کونسا دن ہے کہ مجھ کو یاد تو آتا نہیں — کونسا دم ہے، کہ آنکھوں بیچ پھر جاتا نہیں
عشق میں کس کے امانی مبتلا ہے، جس بغیر — تجھ کو نظارہ گلوں کا ان دنوں بھاتا نہیں

ولہ
چمن سب لٹتے ہیں پڑے، بادل برستے ہیں — شتاب آ ساقیا! ہم بادہ نوشی کو ترستے ہیں
نہ جائے عبرت ہے، چمن کا حال چل دیکھو — تجمل جن گلوں کا کل تھا سو وے آج جھڑتے ہیں
مساوی جانیو خوش طالعی و کو نصیبی کو — امانی منعم و مفلوک سب کے دن گذرتے ہیں

ولہ
امانی تو ہوا تیغ تغافل ہی ستی بسمل — بھلا بتلائے کس پر کر اب آپ کستے ہیں

ولہ
ہم ترا نزع تلک جور سہے جاتے ہیں — یاد آویں گے بہت اتنا کہے جاتے ہیں
لے گیا کون مری تاب و تواں کو یک لخت — کہ سب ہی عضو میرے آج ڈھے جاتے ہیں
وائے واماندگی اپنی کہ یہ آنکھوں آگے — کارواں رو میں ہے، ہم پیچھے رہے جاتے ہیں

اثر ہو سنگ میں کیا، کیوں کہاں کو رام کریں | ولہ | بتوں کے دل ہو، تو یارب یہ آہیں کام کریں
وہ ایک بار بھی تیری نظر پڑے زاہد | | صلاح و زہد رہے یہ، تو ہم سلام کریں
کس کے یہ خار مژگاں دل میں کھٹک رہے ہیں | ولہ | جو چشم سے لہو کے قطرے ٹپک رہے ہیں
دیکھ تو کیا ہی وہ بت سنگ دلی پہ نازاں | ولہ | تجھ میں اے نالۂ جانکاہ! اثر ہے کہ نہیں
یارو گرو دار پہ منصور نہیں دیکھا ہے - | ولہ | نوک مژگاں پہ مرے لخت جگر کو دیکھو
صف مژگان آہو چشم کا ہوں کشتہ، اے یارب | ولہ | سر تربت یہ چن دیجو مرے خار بیاباں کو
زباں پر راز عاشق کا نہ لانا سر کٹا دینا | | سر رشتہ کس سے ہاتھ آیا ہے یہ شمع شبستاں کو
میں نے پہلو سے گم کیا تجھ کو | ولہ | آہ دل! ان نے لے لیا تجھ کو
اشک، آوارگی سے تو نہ تھا | | میں نے آنکھوں میں گھر دیا تجھ کو
نالوں سے دل پھپھولو کیا سوختہ کر رہے ہو | ولہ | پھوٹو کہیں، کہاں کی آتش میں بھر رہے ہو
اور میان خال شکر لب پہ تمہارے | ولہ | بوسہ میں بھی شاید مزۂ تل شکری ہو
اللہ رے صنم! یہ تری خود نمائیاں | ولہ | اس حسن چند روزہ پہ اتنا غرور ہے -
دم بدم اس کی خلش سے اسے آزار ہے | ولہ | دوستاں یہ دل نہیں، پہلو میں میرے خار ہے

چاہ میں کس کی دل ڈبو بیٹھے | ولہ | آہ! ہم کیسے دل کو رو بیٹھے
کیوں امانی گیا نہ آخر دل | | کف افسوس اب ملو بیٹھے
آہ اب میرے دم کے ساتھ ہوئی | ولہ | پاؤں پر عمر کے برات ہوئی
ہم سا جو ناتواں عقب کارواں رہے | ولہ | جوں نقش پا وہیں کے ہوئے پھر جہاں رہے
صدمے جو پڑے ہیں دل پہ غم کے | ولہ | آنسو نہیں تھمتے چشم نم کے
خوش خواب میں ہیں، مگر جواب تک | | جاگے نہیں خفتگاں عدم کے
ہے صبح کو عزم رفتن یار | | تک نکلیو آفتاب تھم کے

آنکھیں نہیں مندتی ہیں عجب جی پہ تعب ہے | ولہ | یارب دل حیراں کو مرے کس کی طلب ہے

دم لینے نہیں دیتے ہیں ہم کے بینالے	ولہ	کیا جانئے کیا دل کو مرے درد کہ ڈھب ہے
ہمراں کے شب و روز کا مت پوچھو گذرنا		دن کٹ گیا جوں توں کے، تو پھر رات غضب ہے
مت سے سروکار غم ہجر ستی ہے		کچھ عیش سے تو کام نہ آگے تھا نہ اب ہے
نامہ بر کبھیو زمانے کی تڑپ تھی تجھ بن	ولہ	شمع شب دیکھ مجھے صبح تلک روئی ہے
بارہا منع کیا چھوڑ دے بے رحم کی چاہ	ولہ	باز نہیں آتا، امانی بھی عجب کوئی ہے
سیر گلشن کو میں جاتا تھا جو صیاد مجھے	ولہ	دیکھ کر دور سے بولا کہ "شکار آتا ہے"

۱۴- امین

امین تخلص، خواجہ امین الدین نام، عظیم آبادی۔ عالم دوستی اور اتحاد میں باقرینہ ہیں۔ علی ابراہیم خاں مرحوم کے یار دیرینہ ہیں۔ شعر فہمی اور سخن رسی میں زمانے کے یادگار ہیں۔ مضمون تراشی اور ادا بندی میں نادر روزگار ہیں۔ ذہن کو ان کے بندش کی صفائی میں نہایت ارجمندی ہے۔ اور طبیعت کو ان کی تلاش معانی میں اپنے ہمعصروں سے بلندی ہے۔ چند مدت نواب میر محمد رضا خاں مظفر جنگ بہادر کی رفاقت میں اوقات اُنہوں نے بہ کیفیت کاٹی ہے۔ بعد اس روزگار کے قناعت اور جواں مردی کے ساتھ خانہ نشینی میں زندگی بسر کی ہے۔ ایک دیوان چھوٹا سا زبان ریختہ میں ان کی تصنیف سے ہے۔ منتخب اس کا یہاں لکھا گیا بہت تخفیف سے ہے۔

دنیا میں جو آکر نہ کرے عشق بتاں کا		نزدیک ہمارے ہے یہاں کا نہ وہاں کا
مانند نگیں آپ کے کاوش میں پڑا ہے		مشتاق جو کوئی ہے یہاں نام و نشاں کا
کرتا ہوں امیں میں تو تمنا اُس کی و لیکن		مُنہ لال ہوا جاتا ہے خجلت سے زباں کا
پردے سے جو وہ شہرۂ آفاق نکلتا	ولہ	تب دیکھتے خورشید کا یہ نام نکلتا
تھا کچھ بھی مناسب کہ نکلوا دیا تو نے		گر صبح نہ نکلا تھا امیں شام نکلتا

بیشک رنج مکافات کے واسطے مامن ہے - یہ اشعار یادگار جریدۂ روزگار کے لکھے جاتے ہیں، اور یہ اوراق پریشان اس سے زینت پاتے ہیں +

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغائے مسلمانی
نہ ٹوٹے شیخ سے زنار تسبیح سلیمانی

ہنر پیدا کر اول، ترک کیجو تب لباس اپنا
کہ ہو جو تیغ بے جوہر اُسے ہے ننگ عریانی

خوشامد کب کریں عالی طبیعت اہل دولت کی
نہ جھاڑے آستین کہکشاں شاہوں کی پیشانی

کہے ہے کلفت ایام ضائع قدر مردوں کی
ہوئی جب تیغ زنگ آلود کب جاتی ہے پہچانی

یہ روشن ہے برنگ شمع ربط باد و آتش سے
موافق گر نہ ہووے دوست، ہے وہ دشمن جانی

ولہ

ہے پرورش سخن کی مجھے اپنی جاں تلک
جوں شمع زندگانی مری ہے زباں تلک

بے ماتم اس چمن میں نہیں خندۂ طرب
ہے کسوت کبود گل زعفراں تلک

لاف سپہ گری نہ سبکے مرد راست باز
پاوے نہ راہ حرف زبانِ سناں تلک

سختی سے گذری اہل سعادت کی یاں معاش
ہے منحصر غذائے ہما استخواں تلک

قطعہ تاریخ

جس کی بہار پہنچی نہ آخر خزاں تلک
آیا نہ ایک گل کبھی اس بوستاں تلک

وہ مرغ ناتواں ہوں کہ صحن چمن سے میں
بے نردبان پہنچ نہ سکوں آشیاں تلک

روضہ میں جن کے حلقۂ چشم ملک سوا
پہنچا نہ پائے شمع کبھو شمعداں تلک

ہنگام طوف بسکہ ملائک ہمیشہ واں
لیتے ہیں خاک آن کے اس آستاں تلک

خادم کھڑے ہیں وہاں کے یہ آپس میں دیکھ کر
پہنچے ہے کوئی دن کو زمیں آسماں تلک

رہنے کو جگ میں صورت افسوس کے تئیں
احکام خود می نے کیا منع یہاں تلک

انگشت چوسنے کے لئے طفل شیرخوار
ممکن نہیں کہ لاسکے اپنے دہاں تلک

اس چرخ دوں پرست تلے بہر مشت جو
مانند آسیا کے پھروں میں کہاں تلک

قصیدہ

ہے سخن سنج اک جوان متیں
فخر صائب جو وہ کرے تحسیں

رات جا کر میں اُس کی خدمت میں
اُسے دیکھا تو تھا نپٹ غمگیں

میں جو پوچھا؟ کہا سبب مت پوچھ
خبث کرنا کسی کا خوب نہیں

لیکن اے یار تجھ سے کہتا ہوں
ل کے گو مجھ پہ سب کریں نفریں

داغ ہوں اُن سے ابتدائیں
بزم شعراء سے ہیں جو صدر نشیں

یعنی سودا و میر و قائم و درد
لے ہدایت سے تا کلیم و یقیں

کیا غرور و دماغ و کیا نخوت
کون سا کبر ہے جو اُن میں نہیں

شاں شیر [illegible] کتاب [illegible]
سمجھے ہہ ایک اپنی ہی چین جبیں

تنگ جانیں جو بزم کا اُن کی
بوعلی ہو وصف نعال نشیں

اور جو احمق ان کے سامع ہیں
دم بدم اُن کی کیا کریں تحسیں

جیسے بیٹھا ن مَن ترانی پر
لڑکے مکتب کے کہتے ہیں آمین

شعر و تقطیع ان کے دیواں کی
جمع ہووے تو جیسے نقش نگیں

اُس میں جو دیکھئے تو آخر کار
یا توارد ہوا ہے یا تضمیں

اتنی کچھ شاعری پہ کرتے ہیں
ہیچ در کون آسمان و زمیں

غرض اس خبث کے تئیں تحریر
ہو سکے ہے اختیار دیں و دہیں

کہا سودا کو ان بزرگوں میں
مت گنو اُس کا ہی کرے آئیں

اور جو ہووے بھی تو لائق ہے
فخر کرنا چھبے ہے اُسکے تئیں

ہے وہ مداح ایک ایسے کا
مسند جاہ جس کی عرش بریں

یعنی نواب سیف دولہ سدا
جس کی شمشیر و فرق دشمن میں

رفعتِ دستِ جود وے جس کے
دامنِ خلق کا ہے یہ آئیں
پنجۂ آفتاب کی سی طرح
بہرہ ور ہے ہمیشہ روئے زمیں
غنچہ کی بھی گرہ میں بند کیا
تیری بخشش نے مشتِ زر کی تمکیں
دست و پا اپنے گم کرے ہی عدو
یاد کر تیری تیغ و خنجرِ کیں
پوچھتا ہے ہر ایک سے بچ کہ
سر مرا ٹنگڑیوں میں ہی کہ نہیں
فکر میں قہر کے ترے ہر شب
حالتِ نزع سے زبس ہی قریں
نیند اُس کو نہ آوے تا نہ پڑھیں
جاے افسانہ سورۂ یٰسیں

احکام پر ترے نہ کرے کیونکہ کام تیر
ہے یہ کمان حلقہ بگوش و غلام تیر
اُتنا ہی چُست بیٹھے ہے جتنی کماں ہو چُست
خوبی کا حق کرے ہے ادا یہاں تمام تیر
ہمسر ہے کس کا تیر ترے تیر سے کہ یہ
انگشت ہے قضا کی کہیں ہیں بنام تیر

شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جوان ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے مُنہ میں زباں ہے
کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانے تئیں کی شکل
ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے
گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی
تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ مکاں ہے
ثابت ہے، جو ڈھکلا تو نہیں موزوں میں کچھ جان
تیر دوں میں ہی پگڑی تو بغچہ کہاں ہے
کہتا ہے نفر غرہ کو صراف سے جا کر
بی بی نے تو کھایا ہے یہ فاقہ سی میاں آج
یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ
شوال بھی چہرہ ماہِ مبارک رمضاں ہے
اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے
تنخواہ کے پھر ملنے کی یہ شکل کہاں ہے
لیتے ہیں بایں سعی سہی وہ تو دو ماہہ
ٹک حرص دمڑے کی جنہیں تاب و تواں ہے
قاضی کی جو مسجد ہے کہ علا نہ کے اُس میں
بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جواں ہے

ملا جو اذاں دیوے تو منہ موند کر اس کا
کہتے ہیں کہ خانہ وش مسلمانی کہاں ہے

بولا جو خطیب اس میں تو مارے اسی اک دھول
ہاتھ آگیا واعظ تو تھپیڑا بہ دہاں ہے

رینگے ہو گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے
نہ ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذاں ہے

اور وہ جو ہیں کمزور سو وہاں آن کے بیٹھو
رستے کے جو آگے کو یہ ہر ایک دکاں ہے

اُٹھ اُٹھ کے دکھانے ہیں انہیں حال وہ اپنا
دربار رَوُ اس عہد میں جو خورد و کلاں ہے

پور بھی نہ ملا کچھ تو ہر اک پال کے آگے
اس سج سے رسالہ کا رسالہ ہی رواں ہے

کوئی سر پہ کئے خاک گریباں کسی کا چاک
کوئی دے ہے منہ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے

ہندو و مسلماں کو پھر اس پال کے اوپر
از بس کہ تو ہم ہے خسارے کا گماں ہے

یہ مسخرگی دیکھ کے وہ صاحب اچھی
کرتا ہے جو وہاں عرض تو نہ یہاں ہی نہ وہاں ہے

گو ہوجئے جا کر کسی عہدے کے صاحب
اس کی تو اذیت بڑی ہی آفتِ جاں ہے

وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دو زانو
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے

خمیازہ پہ خمیازہ ہی اور حیرت اوپر حیرت
منہ صورتِ سوفار کمر شکلِ کماں ہے

صیغہ پہ طلب ابت کے بھلا آدمی نوکر
سو دو سو روپے کا جو کسی عمدہ کے ہاں ہے

صحبت ہے یہ اس سے اگر آقا کی تئیں چھینک
آوے تو وہ اس کو بہ خشونت نگراں ہے

دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اس کے
ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اس وقت گماں ہے

سوداگری کیجے تو ہے اس میں یہ مشقت
دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے

قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ یہ دندی کا گماں ہے

گر خان و خوانین کی کرے کوئی وکالت
اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ پر کہ عیاں ہے

ہر گھر میں وہ چاہے کہ میں قلعہ سا چھوڑوں
ہر کوچہ میں جوں آب چکاں بادر و اں ہے

شاعر ہوئے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
دیکھے جو کوئی فکر و تردد تو یہاں ہے

گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانا
بیت قطعۂ تہنیت خلق زباں ہے

تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر — گر رحم میں بیگم کے سنے نطفۂ خاں ہے
اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ اُس کا — پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے
مُلّانی اگر کیجے تو مُلّا کی ہے یہ قصد — ہوں دو روپے اُس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے
دن کو تو وہ بیچارہ پڑھایا کرے لڑکے — سب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے
تس پر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اُس کے — لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے
چاہے جو کوئی شیخ بنے بہرِ فراغت — چھٹتے ہی تو شعرا کے وہ مطعونِ زباں ہے
دیتا ہے دُمِ خرس سے کوئی شملہ کو نسبت — گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے
پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اُٹھ کر — ہے آج کدھر عرس کی شب سنو کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس تو کر ڈاڑھی کو کنگھی — لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے

در ہجو اسپ

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار — رکھتا نہیں ہے دستِ عناں کا بیک قرار
جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے — ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے — موچی سے کفش پا کو گنٹھاتے ہیں وہ ادھار
تنہا دلے نہ دہر سے عالم خراب ہے — خستے لئے اکثروں میں اُٹھا یہی ننگ و عار
ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں — پاوے سزا جو ان کا کوئی نام لے نہار
نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے — گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو ایسا خراب و خوار
نے دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نے سئیس — رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار
مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا — ہرگز نہ اُٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
نا طاقتی سے اس کی کہاں تک بیاں کروں — فاقوں کا اُس کے ہائے کہاں تک کروں شمار
اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال — کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گذار

قصاب پوچھتا ہے مجھ کو کب کروگے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

جس دن سے اس قصائی کے کھونٹی بندھا ہے
گذری ہے اس نمط اسے ہر لیل و ہر نہار

بہرات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بیقرار

خط شعاع کو سمجھے ہے وہ دستہ گیاہ
ہر دم زمیں پہ آپ کو پٹکے ہے بار بار

تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھانس کا
چرکے کو آنکھیں موند کے دیتا ہے وہ پسار

دیکھے ہے جب وہ توبرۂ ٹھاں کی طرف
کھاتا ہے دانہ گھاس کی جا گہ سدا بچار

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑے کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار

بے استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے اپنی دم کو کہ جوں کھال کو لہار

پیدا ہوئی ہے پشت پہ اگن پاؤ اس قدر
ہرگز دروغ اس کو تو مت جان زینہار

گذرے وہ جس طرف سے کبھو اس طرف ستی
باد سموم ہووے صبا گر کرے گذار

سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار

ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی بہ اعتبار

یہ حال اس کا دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق
چنگل سے موذی کی تو چھڑا اس کو کردگار

یا مر رہے یا چور لے جاوے یا ہووے گم
اس تین بات سے کوئی بھی ہووے آشکار

تنہا نہ اس کے غم سے ہے دل تنگ تنگ زیں
خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے فگار

القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے گھر کے پاس قضا را وہ آشنا
مشہور تھا جنہوں کنے وہ اسپ نابکار

خدمت میں ان کے میں نے کیا جا کے التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار

فرمایا تب انہوں نے کہ اے میری جان من
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم اوپر نثار

لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو گے انکسار

صورت کا جس کی دیکھنا ہے گا گدھو کو ننگ
سیرت سے جس کی نفرت ہے سگ خشمگیں کو عار

بدرنگ جیسے لید ہی بدرنگ جوں پشاب
بدتمیز اس قدر کہ کرے اصطبل اجاڑ

مانند میخ چوکی لکڑ ن سے ہے تھان پر
لاجنب لے جگہ نہیں جوں میخ استوار

حشری ہے اس قدر کہ قیامت کہیں اوپر
دجال منہ کو اپنے سیہ کرکے ہو سوار

اتنا ہی سرنگوں ہے کہ سب اڑگئی ہیں دانت
جبڑے پہ بسکہ ٹھوکروں کی نت پڑی ہے مار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلا دے اسکا سن
پہلے وہ لے کے ریگِ بیاباں کرے شمار

لیکن مجھ زمرے تو اریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

کم رو ہے اس قدر کہ اگر اس کی نعل کا
لوہا منگا کے تیغ بنا دے کبھی لہار

ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روزِ جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقتِ کارزار

مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پاؤں
جز دست غیر کے نہیں چلتا وہ زینہار

مٹھا تو اس قدر ہے کہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں سنو یار

دلی میں آن پہنچے تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقتِ کار

مدت سے کوڑیوں کو اڑاتے ہو گھر میں بیٹھ
ہو کر سوار اب کرو میداں میں کارزار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زین
ہتیار باندھ کر میں ہوا اس اوپر سوار

جس شکل سی سوار تھا اس دن میں اس اوپر
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھی نو نو ہاتھ میں پکڑی تھا میں باگ
اکیل میخ کے پاشنوں سے مرے پاؤں تھے فگار

آگے سے تو برا اسے دکھلائے تھا نفر
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ہرگز وہ اس طرح بھی نہ آتا تھا رو براہ
ہلتا نہ تھا جگہ سے تی جوں میخ استوار

اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبر ان میں سے کہتے تھے یوں پکار

پیچھے اسے لگا کے کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھ پونکے دو اختیار

کہتا تھا کوئی ہے بڑھوی نہیں ہے یہ سب
کہتا تھا کوئی ہیکلہ لایت کا یہ حمار

پوچھے تھا کوئی مجھ سے ہوا مجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ کیا کیوں تجھے سوار

گھر مرے آنا اگر منظور تھا | ولہ | آئے ہوتے لطف سے کیا دور تھا
گالیاں جو دیں سو دیں ہلبس کیجئے | | سُن چکے ہم جب تلک مقدور تھا
یہ دل خالی نہیں کوئی دم رہے گا | ولہ | تو جاوے گا تری غم رہے گا
جس کا دل آپ نے لیا ہوگا | ولہ | خاک میں لے ملا دیا ہوگا
ہم کو کیا، گر بہار آتی ہے | | دل وہ غنچہ نہیں کہ وا ہوگا
گالیاں غیر سے سُناتے ہو | | ہاں میاں! تم سے اور کیا ہوگا
مل گیا ہوگا خاک میں جوں اشک | | تیری آنکھوں سے جو گرا ہوگا
بتاں کے واسطے گھر بار کو اپنے بہا نکلا | ولہ | یہ طفلِ اشک میرا عاشقی میں بے بہا نکلا
وہی مقصودِ دل ہے، اور وہی منظورِ آنکھوں کا | ولہ | سرورِ سینہ میں اس کو کہوں، یا نورِ آنکھوں کا
کیا ایک مجھ کو بھاتی ہے برسات کی ہوا | ولہ | کس کو نہیں خوش آتی ہے برسات کی ہوا
جب آہ سرد بھرتا ہوں کانپے ہے تن امیں | | جوں شاخ کو ہلاتی ہے برسات کی ہوا
خورشید ترا دیکھ کے منہ کانپ کے نکلا | ولہ | مہ چادرِ مہتاب میں مُنہ ڈھانپ کے نکلا
شور ہے عالم میں تیرے حُسنِ عالم گیر کا | ولہ | تو ہی ہوگا گر کوئی ہوگا تری تصویر کا۔
عشق کی دولت سراپا میں طلا کے رنگ ہے | | اے ہوس دیکھ لے نسخہ ہے یہ اکسیر کا
چوستا ہے جوں سرِ پستاں کو طفلِ شیرخوار | | چابتا رہتا ہے دل پیکان اُس کے تیر کا
گر ارادہ نہیں ہے آنے کا | ولہ | فائدہ اس قدر بہانے کا؟
خط نے مارا ہے حسن پر شب خوں | | کیا ہی جھگڑا ہے سوا ٹیکا
سخت کاوش میں ہوں بہ ننگ نگیں | ولہ | ایسی نام آوری کا منہ کالا
دل مرا سینہ سے یوں لیتی ہے وہ زلف دوتا | ولہ | اپنے دیوانوں سے کیا رکھتی ہیں یہ زنجیر کھینچ
دیکھتی ہے جب مری صورت کو بل کھاتی ہے زلف | | جس طرح مجمر سے لے اخگر کو آتش گیر کھینچ
جس طرح شاخ کو ہوتا ہے ثمر سے پیوند | ولہ | کاش نالے کو مرے ہوئے اثر سے پیوند

کہنے لگا یہ آ کے اُس اجماع میں ایک شخص
گھوڑا نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہ گار

بھولا ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈائن چلے ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار

اس مخمصے میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک اور
فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے دو چار

دھوبی کمہار کی گدھی اُس دن ہوئی تھی گم
اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے تو وہاں گذر

ہر اک نے اُس کو اپنی گدھی کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دُم کمہار

دریائے کشمکش ہوا اُس آن موج زن
تھا عنقریب ڈوبے خفت کے یک کنار

بد پشمی اُس کی دیکھ کے کر خرس کا خیال
لڑکے بھی وہاں تھے جمع تماشے کو بیشمار

کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چڑھا
دوں گا ٹکا میں تجھ کو بھی تو چندے ایتوار

بکتا کوئی تھا لا کے سپاہی کو منہ کی بیچ
لیتا تھا کوئی دوڑ کے موتن سستی اُتار

کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اُس کے گرد و پیش
ساتھ اُس سمند خرس نما کے ہو چشم چار

جھگڑوں میں دھوبیوں کے کہ لڑکوں کو دوں جواب
کتوں کو ماروں یا کہ مروں اپنا پیٹ مار

پہلی ہی گولی چھوٹتے اُس گھوڑی کو لگی
ایسا لگے نہ تیر کہ ہو وے تن سے پار

بارے دعا مری ہوئی اُس وقت مستجاب
وہاں سے بہر نمط کیا خجگاہ تک گذار

یہ کہ کے حق ستی میں ہوا مستعد بہ جنگ
اتنے میں مرہٹہ تھی ہوا مجھ سے بھی دوچار

گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقت کارزار

جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اُس کو حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پاؤں ہو بغل میں سوار

جب میں نے دیکھا جنگ کی یہاں تو بند تھی کل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

مقدور نہیں اُس کی تجلی کے بیاں کا
جوں شمع سراپا ہو اگر صرف زباں کا

پردے کو تعین کے در دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمع حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا

یا الٰہی کسی ظالم کے پڑے پنجہ میں ۔۔۔ بے طرح پشکہ کو ہے اُس کی کمر سے پیوند
دیکھ بھال اس دل صد چاک کو لیتے ہیں جاں ۔۔۔ میں نے یہ شیشہ کیا کیا ہے ہنر سے پیوند

مرتے ہیں ہم تو اُس کے لب آبدار پر ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ گر آبِ[1] زندگی ہو تو مارے ہیں دھار پر
بوسہ دیا تھا، جی میں جو آوے تو پھیر لو ۔۔۔ اتنا خفا ہو کس لئے اس خاکسار پر
اس شمع رو کے سامنے آتا ہے تو پتنگ ۔۔۔ بھاری ہوئے ہیں کیا تجھے اپنے دو چار پر

دب نکلتا ہے اگرچہ سب سے ہے بالا پہاڑ ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ دیکھتا ہے جب ہماری آہ کا کالا پہاڑ
کھودیا کوہ کن نے جاں شیریں کے لئے ۔۔۔ اس کی فرمایش کا اپنے سر سے ٹوٹا لا پہاڑ

آ دیکھے تری زلف گرہ گیر ہوا پر ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ جن نے نہ کبھی دیکھی ہو زنجیر ہوا پر
ڈرتے ترے نالہ بھی نکلتا نہیں لب سے ۔۔۔ ظالم ہے ترے ظلم کی تاثیر ہوا پر

اُڑتا ہے ہو کے مضطرب اس کے بام و در پر ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ نامہ مرا کہاں سے ہے کاغذی کبوتر

ہے نہیں جوہر نمایاں تیغ تیز یار پر ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ لکھ رہا ہے نام مقتولوں کا اس تروار پر
یار کے مژگاں سے لڑ جاتی ہے یوں تیر نگہ ۔۔۔ جس طرح تروار کوئی آ لگے تروار پر
دل خیال زلف میں بے خواب و بے آرام ہے ۔۔۔ رات ہوتی ہے ایس بھاری ہر اک بیمار کو

آئی بہار ہو گئے ہر خار راہ سبز ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ لیکن ہوئے نہ آہ یہ بخت سیاہ سبز
شاداب ہے خط اس کے لب آبدار پر ۔۔۔ رہتا ہے گرد جادہ کے اکثر گیاہ سبز
دل میں ترے خیال ہے کس نونہال کا ۔۔۔ لب سے ایس نکلتی ہے ہر ایک آہ سبز
یار آیا ہے اب نہ یہ اے چشم ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ دیکھنے دے ذرا تو رہ اے چشم

کیا کہوں یار سے اپنی سی کئے جاتا ہوں ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ گالیاں کھاتا ہوں غصہ کو پئے جاتا ہوں
جی نکلتا ہے۔ یہ لب یاد میں ہلتے ہیں تری ۔۔۔ مرتے مرتے بھی ترا نام لئے جاتا ہوں
چاک سینہ کا مرے لوگ عبث سیتے ہیں ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ ہم تو زخمی ہیں نگاہوں کے، کوئی جیتے ہیں

[1] آب زندگی سے "آب حیات" مراد ہے جس پر خضر کا قبضہ کہا جاتا ہے ۱۲

سیل آتی ہے تو آنے دو مرا کیا لے گی
فائدہ کیا ہے بھلا ہم جو کریں فکرِ معاش
گھر میں ایک میں ہوں پڑا، اور کئی بستے ہیں
غم کو کھاتے ہیں امیںؔ خون جگر پیتے ہیں

ولہ

سر پہ خوباں جو بال رکھتے ہیں
مو بمو جی کا کال رکھتے ہیں
سرو پر اتنا بھول مت قمری
ہم بھی اک نونہال رکھتے ہیں
دل تو کیا ہے، امیںؔ جو آوے یار
جان آگے نکال رکھتے ہیں

ولہ

بتاں مجھ سے کہتے تھے کیا کچھ نہیں
ولیکن جو دیکھا، تو تھا کچھ نہیں
میں بوسہ جو مانگا، جو جھنجلا کے وہ
لگا کہنے کیا ہے، کہا کچھ نہیں

ولہ

مجھے بے چین رکھتا ہے دل افگار پہلو میں
وہ سوئے کس طرح جس کے رہے بیمار پہلو میں
گرفتاروں کو تیری زلف کے کس طرح خواب آوے
بسان شانہ رہتا ہے انہوں کے خار پہلو میں

ولہ

مجھے تو کبھی عمر بھر غم نہ ہو
ملاقات تیری اگر کم نہ ہو
میں در گذرا صاحب سلامت بھی
خدا کے لئے اتنا برہم نہ ہو
ہم آنے کو مانع نہیں غیر کو
پر اتنا بھی خلوت میں ہر دم نہ ہو
امیںؔ کی غذا آرہی ہے یہی
الٰہی یہ خونِ جگر کم نہ ہو

ولہ

ہوئی ہے آشنائی جب سے اس مے نوش سے مجھ کو
جو صاحب عقل ہیں کہتے ہیں اہل ہوش سے مجھکو
بھلا تو ہی کہہ اے دل کسی کو یہ توقع تھی
نکالے گا وہ صبح عیدیوں آغوش سے مجھ کو
جدائی سے سراپا رنگ میرا زعفرانی ہے
کوئی لے کر ملادے اس بسنتی پوش سے مجھ کو
بھڑکتا ہے جگر میرا دل پر داغ کے دولت
امیںؔ جلنا پڑا اس آتشِ خاموش سے مجھ کو

ولہ

کیا کہیں دودِ آہ کی تاثیر
گھر کا گھر ہے سیاہ، مت پوچھو
مفت مارا گیا ہزار افسوس
تھا امیںؔ بے گناہ مت پوچھو

ولہ

جب دکھاتا ہے وہ شرابی آنکھ
وہ نہیں جاتی ہے گلابی آنکھ
لختِ دل گتھ رہیں ہیں مژگاں سے
ہے مگر خانۂ کبابی آنکھ

روشن ہیں شب ہجر میں یہ دیدۂ بیدار
دھڑکے ہے مرا دل کہ کہیں کچھ نہ لگا دیں

وله

جوں زلفیں چھکنے میں ترے کان کے موتی
لگتے ہیں ترے کان سے جب آن کے موتی

دن کٹا فریاد میں اور رات زاری میں کٹی
صبح گر صبح قیامت نہو، تو کچھ پروا نہیں
تیری آنکھوں کی پرستاری میں دل گھبرا گیا
اس زمانہ میں الٰہی مت کرکسی سے عشق

وله

عمر کٹنے کو کٹی، پر کیا ہی خواری میں کٹی
ہجر کی جب رات ایسی بیقراری میں کٹی
ہائے اس بیمار کی بیمار داری میں کٹی
شمع کی گردن، نہ دیکھی دوست داری میں کٹی

دل باندھئے تو یار کے کاکل سے باندھئے
دھڑکے ہے دل کمر کو جو کستے ہوا سے میاں

وله

بلبل کو باندھئے تو رگ گل سے باندھئے
باریک بال سے ہے، تامل سے باندھئے

جلوہ ترے حسن کا کہاں ہے

وله

یوں کہنے کو آفتاب ہاں ہے

ہم رہیں دیکھتے اور تیری یہ اوقات کٹے
ایک دم ہوگئی گر اُس سے ملاقات تو کیا

وله

اور تو کیا کہوں اے شانہ ترا ہاتھ کٹے
زندگی کا ہے مزا یہ کہ مساوات کٹے

رنگ چہرے کا زعفرانی ہے
کس سے تشبیہ دیں بھلا تجھ کو
شمع رویاں سے اتنا گرم نہ مل
رات دن جھینکتے ہی جاتا ہے

وله

عاشقی کی یہی نشانی ہے
دیکھا یوسف تو تیرا ثانی ہے
ان کی جو بات ہے زبانی ہے
کیا الٰہی ایسی زندگانی ہے

خضر نے ایک دم پیا تھا لے کے آب زندگی
کیا بھلا اس میکدے میں جی کسی کا شاد ہو
معنیٔ آرام کیا ہے، تو نہ کچھ سمجھا الٰہی

وله

مانگتے ہیں اب تلک اُس سے حساب زندگی
مرگیا آخر کو پی جن نے شراب زندگی
ہم تو مدت سے اُلٹتے ہیں کتاب زندگی

غیر سے کیوں کہ وہ چھوڑے ملنا

وله

چھوڑتا ہے کوئی اپنے بانے

ہم کھڑے تھے سامنے، اور اغیاروں میں تھے
جتنے تھے محفل میں، تھا سب سے تپاک و اختلاط

وله

ہم تو منصف ہو جئے، ہم کبھی یاروں میں تھے
ایک ہم کم بخت گویا واں گنہگاروں میں تھے

ہاتھ اٹھانا جان سے پیارے نپٹ دشوار ہے — کیوں نہ دیکھا کل سب ہی تو ناز برداروں میں تجھے

ولہ

بھر عمر گدائی میں بھی کرتے رہے شاہی — دنیا میں جو ٹھاٹھ نے تھے یہاں ہم نے نباہی

خط کو جو تراشے ہے بھلا فائدہ کیا ہے — اب چڑھ چکی اے یار سپیدی پہ سیاہی

کیا دین سے غافل ہیں ایسی مردم دنیا — سکہ کو سمجھتے ہیں سدا اپنا الٰہی

ولہ

تمہاری آنکھیں جو دیکھتے ہیں نپٹ ہی لگتی ہیں پیاری پیاری — پر اس قدر ہیں جو خوں کی پیاسی یہ کیا تو آنکھیں ہیں یا کٹاری

تری نگہ کے جو ہوں گے مارے، نہ مانگا ہوگا انہوں نے پانی — نہ ایسی دیکھی ہے تیغ ہم نے، نہ ایسی دیکھی ہے آبداری

رباعی

اظہار نہیں اگرچہ سر کا — پر بوجھ اتاروں ہوں میں اپنے سر کا

سائل کو جواب ترش ہرگز مت دے — بھوکا ہے، کیا کرے گا لے کر سر کا

رباعی

یہ جور و جفا یہ بے وفائی کب تک — بس کیجئے، پاس آشنائی کب تک

کرتا ہے کوئی حسن پر اتنا بھی غرور — دیکھیں تو رہے ہے یہ خدائی کب تک

رباعی

کیا شہر میں آج مجھ پر ہے ہولی - — پھرتے ہیں لئے عبیر بھر بھر جھولی

وعدے سے کیا کروگے دل خوش کب تک — ہولی کا قرار تھا سو یہ بھی ہو لی

مثنوی

ایک ہیں آشنا مرے غم خوار — پوچ گو بیوقوف بد اطوار

ان کی تعریف کیا کروں میں بیاں — کہتے شرماتی ہے گی منہ میں زباں

دل ہے ان کا کہیں دماغ کہیں — گھر میں ڈھونڈو تو بھونے بھانگ نہیں

منہ کو ان کے خدا نہ دکھلاوے — گر کوئی دیکھے خاک کیا کھاوے

چار پیسے کا سیر بھر ٹھرّا — پی کے رکھتے ہیں جی میں یہ غرّا

آج دنیا میں ہیں جو کچھ ہم ہیں — مالکِ چار دانگ عالم ہیں

دیکھتا ہوں جو ان کی میں صورت — یاد آتی ہے چین کی مورت

گال جبڑے سے یوں رہے ہیں لپٹ — لگ رہے ہوں کواڑ کے جوں پٹ

تس پہ چیچک نے یوں ہے ماری میخ — جوں جڑی ہوں کواڑ میں گل میخ

میں تو کرتا نہیں سخن چینی — ناک ہے جوں کواڑ کی بینی
آنکھ گر ہے تو گھر سے باہر ہے — حلقۂ چشم حلقۂ در ہے
کان ایسے پڑے ہیں دونوں طرف — جوں ڈفالی کا ہوئے پھوٹا دف
منہ ہے سنڈاس کی طرح بدبو — لوگ کرتے ہیں دیکھتے اخ تھو
ان کے دھامے کو دیکھ کر فی الحال — جن کے دیکھے نہ ہوویں کالے بال
دیکھ نقاش اس کی پیشانی — کھینچتا دل میں ہے پشیمانی
کھوپڑی سر سے ہے گی یوں انکی — جوں کہ چوٹھے پہ اوندھی ہو مٹکی
توند لٹکے ہے پیٹ سے ایسی — پیٹ سے ہووے پیٹ سے جیسی
صاف کہتا ہوں میں بہ مجبوری — ناف ہے جا ضرور کی موری
کیا کہوں اس کی اور بد حالی — منہ ہے چکنا تو پیٹ ہے خالی

دل لیکے زلف اس کی یوں حلقہ زن ہے مجھ پہ — ولہ — بیٹھا چمن میں ہووے جوں سانپ من کے آگے

بتاں اٹھاتے نہیں ہاتھ میرے کینہ سے — ولہ — رہے ہے سنگ کتیں لاگ آبگینہ سے
ضرور کیا ہے کہ ہوتا ہے تو تجمل ناصح — ہماری جیب کو ہے کیا لگاؤ رہنے سے
نہ اٹھ سکے گا مرے لب سے حرف بوسہ کا — مٹا سکے ہے کوئی نام کو نگینہ سے
ایں ضعیف میں اتنا ہوا بقول فغاں — اٹک کے آہ نکلتی ہے میرے سینہ سے

کیا برا وقت تھا اس شوخ سے جب آنکھ لگی — ولہ — جب تلک جیتے رہے روز نہ شب آنکھ لگی
بزم رنداں میں اسے دیکھ کے چھپ جاتے ہیں — کیا مگر شیخ کی ہے بنت عنب آنکھ لگی

میں گندا یار کے ملنے سے جاو جس کا جی چاہے — ولہ — غرض اشتیاق سے عاشق کہاو جس کا جی چاہے
حیات جاوداں بخشے ہے تیغ آبدار اس کی — اگر با ور نہ آوے جا کے کھاو جس کا جی چاہے

یار بھی اب گلہ لگا کرنے — ولہ — یہ بھی اپنے نصیب کی خوبی
ہاتھ میں اپنا سر لئے رہنا — عشق کی پہلی یہ سلامی ہے

دل گرفتار کیوں نہ ہو میرا		بریں جامہ ترے دو دامی ہے
زاہد کبھو تو گرد نہ پھر تو شراب کے	ولہ	یہاں آگ ہے چھپی ہوئی پردے میں آب کے
کیا چشم منعماں سے رکھیں مفلسانِ دہر		دریا نے تو بھرے نہیں کاسے حباب کے
پھرتا ہے کیوں بھٹکتا اے شیخ ہر طرف تو	ولہ	کہتا ہے جس کو کعبہ وہ یار کی گلی ہے
کہا کرتے ہو مجھ کو قابل جور و جفا یہ ہے	ولہ	جو کوئی چاہے کسی کو اسے میاں اس کی سزا یہ ہے
برہمن دیر کو پوجے ہے اور کعبے کے تئیں زاہد		پرستش ہم جسے کرتے ہیں، وہ نام خدا یہ ہے
رشک گلزار ہوا داغ سے سینہ میرا	ولہ	یار کے بھا دیں تماشا ہے، تماشا یہ ہے
اس ماہ رو کے سامنے آتی ہے چاندنی	ولہ	اپنے تئیں اب آپ ہنساتی ہے چاندنی
منہ دیکھو تیرے سامنے آ کر سفید ہو		پانی میں آبرو کو ملاتی ہے چاندنی
ہو دو دن کی چاندنی ہے پھر آخر اندھیری رات		ساقی پلا شراب کہ جاتی ہے چاندنی
گر آمد آمد اس مہ تاباں کے تئیں ہے		کیوں چاندنی کا فرش بچھاتی ہے چاندنی
غیروں سے اختلاط ہماری بلا کرے	ولہ	گر آشنا کرے تو تجھی سے خدا کرے
دنیا میں کہنے کو سب ہی کہلاتے ہیں بھلے		پر ہے وہی بھلا، جو کسی کا بھلا کرے

۱۵ ا۔ افسوس

افسوس تخلص، میر شیر علی نام، والد ماجد ان کے سید مظفر علی خاں، داروغۂ توپ خانۂ نواب میر قاسم خاں عالیجاہ کے تھے۔ سلسلہ سیادت کا ان کی حضرت اسمٰعیل اعرج کو، کہ بڑے بیٹے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے تھے، پہنچتا ہے۔ وطن بزرگوں کا خاف ایک مکان ہے علاقے میں عرب کے۔ بزرگوں نے ان کے ہندوستان میں آ کے نارنول میں سکونت اختیار کی۔ اس سبب سے وطن ان کا نارنول مشہور ہے۔ میر مذکور کے باپ اور چچا کو، کہ سید مظفر علی خاں اور سید غلام علی خاں نام رکھتے تھے، نواب عمدۃ الملک امیر خاں مرحوم

گیارہ برس ان کے متعینہ رہے۔ بعد برہم ہونے اس سررشتہ کے، صاحب عالم و عالمیان میرزا جواں بخت جہاں دار شاہ کی عنایت اعتقاد ذاتی از بسکہ حد سے زیادہ تھی، سعادت توسل کی انہوں نے ملازموں میں اس عالی جناب کے حاصل کی۔ جس ایام میں اس نیر اوج شہریاری کا خیمہ مغرب کی سمت نکلا، اور کوچ شاہ جہان آباد کو ہوا، تو میر مذکور بہ سبب بعضے بعضے عوارض کے رہ گئے، اور ساتھ نہ جا سکے۔ ایک مدت سے بتوکل و قناعت ہمراہی میں نواب سرفراز الدولہ بہادر کے دن زندگی کے بسر کرتے تھے، کہ صاحبان والامناقب عالی شان بارلو صاحب نے، مشورے سے عالی قدر سخن آفرین مسٹر گلکرسٹ صاحب، زباندان ریختہ لکھنؤ سے طلب کیے۔ بڑے صاحب نے لکھنؤ کے، کہ نامی اس معدن رافت کا ہر صاحب ہے، بہ عزت تمام ان کو بلوا کے، اور مشاہرہ دو سو روپے کا ٹھہرا کے، پانچ سو روپیہ خرچ راہ دیا، اور کلکتے کی طرف روانہ کیا۔ چنانچہ جب مرشد آباد میں یہ آئے، تو وفور محبت سے اسی دن غریب خانہ میں تشریف لائے، کس واسطے کہ ان کے نکلنے کی تقریب سے دو مہینے آگے راقم حقیر لکھنؤ سے نکلا تھا، اور وارد مرشد آباد کا تھا، دیدار سے اپنے انہوں نے نہایت خوش و خرم کیا، اور چلتے ہوئے وعدا کلکتے کی سیر کا اس عاصی سے لیا۔ غرض بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، بلدہ کلکتے میں، صاحبان عالی شان کے ساتھ میر مذکور ملاقاتیں بہ عزت تمام رکھتے ہیں۔ اور گلستاں کے ترجمہ کا کمپنی کی سرکار سے کام رکھتے ہیں۔ راقم آثم سے ملاقات ایام شباب سے ہے۔ فی الحقیقت کہ ذات ان کی زمانے کے اعجاب سے ہے عجیب جوان خلیق اور اہل دل ہیں۔ فروتنی اور انکساری میں فرد کامل ہیں۔ منطق و معانی کے بیان میں صاحب استعداد ہیں۔ کلیات اور معالجات فن طبابت کے بھی بخوبی یاد ہیں۔ شعر عاشقانہ بہت مزے سے کہتے ہیں۔ اقسام نظم ہیں +

کیوں نہ ہو گھمنڈ اس بتِ پُر غرور کو	صبر کسی طرح نہیں اس دل ناصبور کو
اُس بتِ بے حجاب کا دیویں ابھی اُٹھا نقاب	دیکھ سکے گا پھر اسے تاب ہے اتنی طور کو
باقی نہیں فقط ہمیں ڈوبی ہے سب کی کشتی زمیں	دیکھنا آج ہمنشیں آنسوؤں کے وفور کو
سچ ہے یہ خود نمائیاں، حق ہیں یہ لن ترانیاں	شعلۂ طور بجھ گیا دیکھ کے اس کے نور کو

کی رفاقت میں سررشتۂ ملازمت کا نہایت اقتدار، اور عز و وقار کے ساتھ توپ خانے کی داروغگی کے ساتھ سرفراز تھے، اور رسالۂ معقول سے حضور میں مختار تھے۔ بعد شہید ہونے نواب عمدۃ الملک کے سید غلام علی خاں کو نیابت صوبہ الہ آباد کی بالذات بھی تھوڑے دنوں رہی آخر فالج بیماری سے انہوں نے سیر روضۂ رضوان کی کی۔ ان کی وفات کے بعد سید مظفر علی خاں خانہ نشین ہوئے، اور بارہ برس بے روزگار بیٹھے رہے۔ آخر نواب خان خان عالم بقاجنگ خاں مرحوم نے لکھنؤ میں انہیں بلوایا، اور سرکار وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ مرحوم کے شاگرد پیشہ میں تین سو روپے کا واسطے ان کے درماہہ ٹھہرایا۔ ان ایام میں میر شیر علی افسوس کا سن گیارہ برس کا یا کچھ کم زیادہ ہے، لیکن مولد ان کا دار الخلافہ شاہ جہان آباد ہے۔ یہ بھی ہمراہ اپنے والد ماجد کے لکھنؤ میں آئے، اور طور بود و باش کا یہیں ٹھہرائے۔ بعد کئی برس کے حسب الامر نواب صادق علی خاں کے، کہ بڑے بیٹے نواب میر محمد جعفر خاں صوبہ دار بنگالہ کے تھے، سید مظفر علی خاں وارد مرشد آباد ہوئے، اور داروغگی توپ خانہ وغیرہ کے ساتھ مورد عنایت و امداد ہوئے۔ آگے بیان ساتھ تفصیل کے بموجب طول کلام کا ہے۔ غرض جب وزیر الممالک نواب شجاع الدولہ بہادر معہ صوبہ دار بنگالہ صاحبان عالی شان سے معرکہ آرا ہیں، تو سید مظفر علی خاں بھی ہمراہ رکاب کے تھے۔ بعد میر محمد جعفر خاں کی وفات کے روزگار نواب سیف الدولہ کا انہوں نے نہیں کیا، بلکہ لکھنؤ چلے آئے، اور بعد کئی برس کے حیدر آباد کی طرف گئے، وہیں وصال ان کا ہوا۔ اس ایام میں میر شیر علی افسوس کا سن انیس ۱۹ برس کا تھا۔ شعر و سخن کے ساتھ موانست ان کو بشدت تھی، اور طبیعت کو مناسبت نہایت۔ چنانچہ صغر سن سے شعر کہتے ہیں، اور اکثر اس شغل میں رہتے ہیں۔ اصلاح کا اتفاق ان کو میر حیدر علی حیران تخلص سے ہوا ہے، اور علی ابراہیم خاں مرحوم نے شاگرد ان کو میر حسن حسن تخلص کا لکھا ہے۔ اس کی سند اپنے تئیں نہیں پہنچی، اور یہ خبر اپنے گوش زد نہیں ہوئی۔ ابتدا میں یہ سررشتہ روزگار کا نواب سالار جنگ مرحوم کے ملازموں میں رکھتے تھے۔ اور میرزا نوازش علی خاں، جو نواب مذکور کے بڑے بیٹے ہیں،

تازہ پھر اوہ منہ ، گر دیکھے جو اک نظر تو پھر		منہ پہ نہ لائے زاہدا بھولے سے ذکرِ حور کو
دو کسو نہ طعنہ زن مجھے ناکسوں کی خوشامدیں		میں نے نہی کی نہیں فقط ، کرتے ہیں سب ضرور کو
تو نے افسوس کیا کیا ، دشمنِ جاں کو دل دیا		یہ تیری عقل جل بجھے ، آگ لگے شعور کو
سمند گرم جو یہاں اس سوار کا پہنچا	ولہ	غبار تا فلک اس خاکسار کا پہنچا
تو سچ بتا کہ تجھے اتنی کیوں ہے بےچینی		مگر پیام کسی بےقرار کا پہنچا
ملے ہے پانو سے اپنے وہ لالہ ہر دم		یہ مرتبہ تو دلِ داغدار کا پہنچا
ہے یہاں تلک تو نزاکت گلوں کے گھر سے		لچکنے لگتا ہے اس گلعذار کا پہنچا
قفس سے چھٹنے کی امید ہی نہیں افسوس		حصول کیا ہے جو مژدہ بہار کا پہنچا
جب تلک عشق یارو ، نہ دل ناکام تھا	ولہ	اپنے میں کیا چین تھا ، اور دل کو کیا آرام تھا
بخشیو ہم کو تمہے ٹوکا ہے ہم نے بھول کر		دردِ دل تیری بلا ہو ، وہ ترا ہمنام تھا
اس کے اٹھتے ہی جی پہ آن بنی	ولہ	دیکھئے آگے آگے کیا ہوگا
صبح نت کرتا ہے یہ دل اشکباری بیشتر	ولہ	ہو سحر کو خانۂ ماتم میں زاری بیش تر
دل کے تئیں بھی آشنائی کا نہیں کچھ اعتبار		بے وفاؤں سے رہی ہے تجھ کو یاری بیشتر
ہنس کر کسی سے میں نے نہ کی بات تجھ بغیر	ولہ	روتے ہی آہ کٹ گئی یہ رات تجھ بغیر
غیروں سے تو ملے تو ملا کر ، وے مجھے		کرنی نہیں کسی سے ملاقات تجھ بغیر
بزم میں اس کی نہ ہنستے ہیں نہ رو سکتے ہیں	ولہ	چپکے بیٹھے ہوئے ہر ایک کا منہ تکتے ہیں
کہا میرا مطلق نہیں مانتا ہے	ولہ	تو جیسا ستاتا ہے جی جانتا ہے
کوئی دل سے مرے پوچھے جیسا کہ وہ آئے ناصح	ولہ	تجھ کو خوش آئے یہ ، پر مجھ کو تو بھاتا ہے

۱۶- آشفتہ

آشفتہ تخلص ، حکیم رضا قلی خاں نام ، والد ماجد ان کے حکیم محمد شفیع محمد خاں مرحوم تھے ،

متوطن اکبرآباد کے ۔ بڑے بھائی ان کے میرزا جو صاحب ، خدا مغفرت کرے ، ذرہ تخلص کرتے تھے عجب دلولے اور ذوق شوق کے ساتھ کربلائے معلّٰے گئے ، اور وہیں خاک ہوئے ، روضۂ ضریح مقدس کے دفن ہیں ۔ حق سبحانہ تعالےٰ حشر بھی ان کا ، اور جمیع مومنین کا ، جناب سید الشہدا علیہ السلام کے ساتھ کرے ۔ دوسرے بھائی ان کے ، میرزا رضی صاحب ، وہ بھی ان سے بڑے ہیں ، بالفعل لکھنؤ میں داد طبابت اور معالجے کی دے رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ جو جو اختراعات فن طبابت میں انہوں نے کئے ، دیکھنے کا کیا دخل ہے ، کسی نے نہیں سنے ۔ حذاقت اور لیاقت ان کے خاندان کی نہیں ہے محتاج تشریح اور بیان کی ۔ ہمیشہ بزرگ ان کے معالج سلاطین نامدار کے رہے ہیں ، اور امیروں سے بلکہ وزیروں سے سدا نازو اعزاز کیا کئے ہیں ۔ غرض حکیم رضا قلی خاں آشفتہ تخلص راقم آثم کے دوستان قدیم سے ہیں ۔ جوان آزاد وضع ، اور خوش اختلاط وارستہ مزاج ، اور مایۂ ارتباط میں محبت ، اور یکرنگی میں خلاصے ، اور آشنائیوں کے بہت خاصے ، حسن پرستی میں خود لیلی وشیریں کی تصویر ، اور عشق بازی میں قیس و فرہاد کے پیر ہیں ۔ مشورۂ سخن کا انہوں نے میر سوز صاحب سے کیا ہے ، لیکن شاگردوں میں ان کے اتنا کوئی منہیں ہوا ہے ۔ میر صاحب مذکور کے طرز ادائیہ میں انہوں نے رنگینی کچھ اور بھی زیادہ کی تھی ، سچ تو یہ ہے کہ رنگین ادائی کی داد دی تھی ۔ چندے انہوں نے رفاقت میرزا محمد تقی خاں کی کی ، جو کہ پوتے میرزا یوسف کور کے تھے ، اس سبب سے دو اڑھائی برس بود و باش ان کی فیض آباد میں ہوئی تھی ، وگرنہ پرورش انہوں نے لکھنؤ میں پائی ہے ، اور کیفیت زندگی کی وہیں اٹھائی ہے ۔ ۱۲۰۸ھ بارہ سو آٹھ ہجری میں لکھنؤ سے مرشد آباد میں آئے ، نواب مبارک الدولہ ناظم صوبہ بنگالہ مرض الموت میں گرفتار تھے ، اگرچہ معالجہ میں انہوں نے رنگ مسیحائی کے دکھائے ، لیکن قضا و قدر سے لاچار تھے ۔ بعد نواب مبارک الدولہ کی وفات کے ، خلف الصدق سے ان کے ، یعنی نواب عضدولہ ناصر الملک سید بابر علی خاں بہادر دلیر جنگ سے ، نہایت موافقت آئی ، اور صحبت نے بہ شدت یکرنگی پائی ۔ چنانچہ سات برس کامل ان کی خدمت میں رہے ،

اور قریب لاکھ روپے کے بنگالہ میں پیدا کئے، لیکن خرچ کرنے والے بھی ایسے ہی بلائے روزگار تھے، کہ جس دن مرشدآباد سے نکلے تو قرض دار تھے۔ غرہ ذی حجہ کو ۱۲۱۴ھ بارہ سو چودہ ہجری میں اپنے ہی مزاج نازک سے، ناحق روزگار چھوڑ کلکتے میں چلے آئے، اور زمانے کی بے رنگی کو مطلق خیال میں نہ لائے، بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، بہ عزت تمام کلکتے میں اوقات بسر کرتے ہیں، اور اک رنگ کی صحبتوں میں دن رات بسر کرتے ہیں۔ طبیعت ان کی موسیقی کی طرف لڑکپن سے ہے، اور ایک مناسبت بھی بھلی چنگی ان کو اس فن سے ہے۔ اپنی آشفتہ مزاجی میں غزلوں کو انتظام نہیں دیا ہے، ورنہ مدت سے ایک دیوان کا سرانجام ہو چکا ہے۔ یہ اشعار ان کے نتائج افکار سے ہیں ◆

جی تھا آنکھوں میں یار تھا دل میں / یہاں تلک انتظار تھا دل میں
آبلہ ہوکے دم میں پھوٹ بہا / یہ کہاں کا بخار تھا دل میں
مر گئے پر بھی ہم کو خاک ندی / آج تک یہ غبار تھا دل میں
کھینچنے ہی تک اے کمان ابر / تیر مژگاں دو سار تھا دل میں
دم آخر جو ہچکی آتی تھی / وہ فراموش گار تھا دل میں
دست و لب نزع میں جو ہلتے تھے / شوق بوس و کنار تھا دل میں
دم شماری تلک بھی آشفتہ / قدموں کا شمار تھا دل میں

ولہ

فقط نہ اپنی ہی تم آن دیکھتے جاؤ / ادھر ادھر بھی مری جان دیکھتے جاؤ
نہ پیچ و تاب کو بالوں کے طول دو اتنا / ہمارا دل ہے پریشان، دیکھتے جاؤ
بجائے اشک نکلتے ہیں پارہائے جگر / تمہارے جی میں تھا ارمان، دیکھتے جاؤ
دکھانے آئے تھے دامن کے چاک کی خوبی / ہمارا چاک گریبان، دیکھتے جاؤ
کیا خرید زلیخا نے مصر میں یوسف / جناب عشق کی تم شان دیکھتے جاؤ
اگرچہ ہووے گی تصدیع لیکن آشفتہ / کوئی گھڑی کا مہمان، دیکھتے جاؤ

ولہ

وصل اس کا خدا قریب کرے | دیکھیں، تب ہم سے کیا رقیب کرے
ہجر سے قتل، وصل سے احیاء | حسب میں جو آوے، سو طبیب کرے
گل کا دیکھا چٹک کے چپ ہونا | شور کیوں کر نہ عندلیب کرے
مر گیا ایک صنم پر آشفتہ | موت ایسی خدا نصیب کرے!

ولہ

یہ خرابی تو پڑی مجھ پہ ترے جانے سے | چند بھی ڈسنے لگے اب مرے ویرانے سے
کس طرح قید کروں، یہ تو ٹھہرتا ہی نہیں | کون بر آوے بھلا، اس دل دیوانے سے؟
میں سمجھتا ہوں کہ تم جا کے نہیں آنے کے | فائدہ کیا ہے بھلا جھوٹ قسم کھانے سے
شعلہ خو! آگے تو اتنا نہ جلاتا تھا مجھے | آج تو آگ ہوا غیروں کے بھڑکانے سے
دیکھتے ہی اُسے کل میرے یہ اوسان گئے | اپنے بیگانے وہاں جتنے تھے سب جان گئے
اپنے کے ہوتے بھلا غیر کو صدقے تو نہ کر | ہم بھی جی رکھتے ہیں پیارے، ترے قربان گئے

ولہ

مجھ کو کہتا ہے صنم، تجھ کو بھی اب لاگ لگے | آنکھ سے آنکھ ملاتا ہے، تجھے آگ لگے
بوسہ کے واسطے چٹا، تو لگا کہنے مجھے | بس کہیں دور بھی ہو، منہ کو ترے آگ لگے

باب الیا

۱۔ بیدل

بیدل تخلص، میرزا عبدالقادر نام، قوم چغتا، لیکن نشو و نما انہوں نے ہندوستان میں پائی ہے، جودتِ ذہنِ سلیم، اور ذکائے طبع مستقیم، کے باعث تصویر نازک خیالی کی بہت نکتہ سنجی کی کھینچ کر باریک بینوں کو دکھائی ہے۔ بیشتر اختراعات انہوں نے زبان فارسی میں کئے ہیں لیکن اہلِ محاورہ کے مقبول نہیں ہوئے ہیں۔ آسماں جاہ محمد اعظم شاہ کے ساتھ توسل رکھتے تھے، اور موردِ الطاف و عنایت شاہزادۂ عالم و عالمیان کے رہتے تھے۔ قوت جسمانی اور طاقت بدنی قادر قوی نے اتنی انہیں عنایت فرمائی تھی، کہ اوران کے معاصرین کے حصہ میں کم آئی تھی

چناں چہ اک روز رکاب میں شاہزادے کی عین سواری کے دوادوش میں ایک شیر نکل آیا، اور کئی بیچاروں اجل کے ماروں کو ذائقۂ مرگ کا اس نے چکھایا۔ آخر میرزائے مذکور کے ہاتھ سے بکری کی طرح مارا گیا، اور اپنی جان سے بیچارہ گیا۔ دفعتاً ایسے ردی خلائق سے یہ بیزار ہوئے، کہ روزگار پاکشیدہ، اور دنیاداری سے دست بردار ہوئے۔ طریقہ فقر اور گوشہ نشینی کا اختیار کیا، دل کو فراغ یاس اور خونِ تمنا سے رشکِ گلزار کیا، لیکن دروازہ ان کا کثرت اعتقاد سے مسجودِ خاص و عام تھا، اور بوسہ گاہ امیرانِ عظام تھا۔ نواب نظام الملک صوبہ دار دکھن کا خط مکرر اور متواتر اس مرکزِ دائرۂ قناعت کی تحریک میں آیا، لیکن قطب آسمانِ توکل نے حرکت کو قبول نہ فرمایا۔ ایک بیتِ فارسی نظام الملک کے جواب خط میں لکھی ہے، اس سے قناعت اور جواں مردی اس شیر بیشۂ استغنا کی معلوم ہوتی ہے +

اس بیت کو بہ سبب زبان فارسی کے حاشیہ[لہ] پر لکھا ہے، اور ترجمہ اس کا اس طرح داخل کتاب کیا ہے +

کہ عوض دنیا کے سرکوں، جا کے چھوڑوں ٹھاؤں کو — باندھی ہے مہندی قناعت کی میں اپنے پانو کو

کلیات ان کا از روئے نظم و نثر کے قریب لاکھ بیت کے مشہور ہے، لیکن اہل دنیا کی تعریف کہیں ایک مصرع میں نہیں مذکور ہے۔ بحر متدارک اور کامل وغیرہ پانچوں وزن، جن کے ناظم مخصوص شعرائے عرب ہیں، اور عجم ان سے احتیاط کرتے سب کے سب ہیں، اکثر میرزا نے غزل ان اوزان میں کہی ہے، اور داد نازک خیالی کی دی ہے۔ از بس کہ مدار دنیائے دو روزہ کا فنا پر ہے، ۱۱۳۳ھ گیارہ سو تینتیس ہجری میں بلدہ شاہ جہان آباد کے اندر اس سرائے فانی سے عالم باقی کی طرف توجہ فرمائی۔ ان دو بیتوں نے، زبان ریختہ میں اس قادر سخن کے نام سے شہرت ہے پائی +

مت پوچھ دل کی باتیں، وہ دل کہاں ہے، ہم ہیں	اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے، ہم ہیں
لہ دنیا اگر دہند، نہ جنبم ز جائے خویش	من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا — پردے سے یار بولا، بیدل کہاں ہے ہم میں

۲- بیان

بیان تخلص، احسن اللہ خاں نام، شاگردوں میں سے میرزا مظہر جان جاناں کے تھا۔ سکونت دلی میں اختیار کی لیکن متوطن اکبر آباد کا تھا۔ شاگردوں میں سے میرزائے مذکور کے عاشق مزاج اور شیریں زبان تھا۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان تھا۔ یہ اشعار منتخب دیوان اس سخنور خوش بیان کے ہیں ✦

وہ بھی کیا دن تھا کہ ہم آغوش ہم سے یار تھا — در کے باہر مدعی جوں صورت دیوار تھا
اس تجاہل پر پڑا میں یہ سمجھتا ہوں گور میں — وہ کہ جن کی چشم کا میں عمر بھر بیمار تھا
دیکھ کر تابوت کو، بیمارداروں سے مرے — پوچھنے لاگا کہ اس مردے کو کیا آزار تھا
ولہ
کوئی کسی کا بیان، آشنا نہیں دیکھا — سوائے اس کے ان آنکھوں نے کیا کہیں دیکھا
ولہ
آکر جوں ہی قاصد نے لیا نام کسی کا — اس نام کے سنتے ہی ہوا کام کسی کا
کیوں آج سماتا نہیں اپنے میں خوشی سے — کیا تجھ کو بیاں پہنچا ہے پیغام کسی کا
ولہ
عالم کو تاج و گوہر و تخت دلوا دیا — اے آسمان بنا تو، مجھے تو نے کیا دیا
نے دین سے اطلاع ہے، نہ دنیا کی کچھ خبر — اس عشق نے غرض ہمیں سب کچھ بھلا دیا
ایسے ہی میرے بخت جو ماتے تھے نیند کے — خواب عدم سے کاہے کو مجھ کو جگا دیا
ولہ
کب تلک اس کی شکایت ہو نہ لب سے آشنا — ایک بیگانہ ہے مجھ سے، اور سب سے آشنا
غیر کے کہنے پہ مت بیگانہ ہو یکبارگی — دیکھ تو اے شوخ! میں تیرا ہوں کب سے آشنا
ولہ
ہمدم نہ فکر کر، کہ مرا کام ہو چکا — گر دل مرا یہی ہے، تو آرام ہو چکا
آتا ہے تجھ کو ننگ، مرے نام سے عبث — اے شوخ! اب تو شہر میں بدنام ہو چکا
ولہ
اگر اک صبح دم آتا وہ اٹھ کر خواب شیریں سے — ہمارا کیا گریباں، ناصحوں کا پیرہن پھٹتا

جگایا مجھ کو کس کم بخت نے ہائے !	ولہ	مری آنکھوں کے آگے وہ ابھی تھا
تو تو ساقی جام ترسا کر پلاتا تھا مجھے	ولہ	یار کی آنکھوں نے مجھ کو کر دیا یکبار مست
روکر اس سے میں کہا، مرتا ہے یہ بیمار آج	ولہ	مسکرا کر وہ لگا کہنے، کہ اس کا کیا علاج
یہ آرزو ہے کہ وہ نامہ بر سے لے کاغذ	ولہ	بلا سے پھاڑ کے پھر ہاتھ میں ملے کاغذ
وہ کون دن ہے کہ غیروں کو خط نہیں لکھتا		قلم کے بن کو لگے آگ ! اور جلے کاغذ
عرش تک جاتی تھی، اب لب تک بھی جا سکتی نہیں	ولہ	رحم آتا ہے بیاں اب مجھ کو اپنی آہ پر
اک بار فوج عشق پڑے مجھ پہ ٹوٹ کر -	ولہ	لے کے قرار و دین و دل و ہوش لوٹ کر
لینا اگر ہے دل کو، تو لے بھی اسے کہیں		سینہ میں اب تلک تو رکھا مار کوٹ کر
ہم سرگذشت کیا کہیں اپنی . کہ مثلِ خار		پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر
کیا ایسے سے دردِ دل کو کہئے	ولہ	ادھر تو سُنا، اُدھر فراموش
میں بس کہ خاک میں ترے کوچے کی مل گیا	ولہ	تس پر بھی تیرے دل میں ہے مجھ سے غبار حیف
تمنا بادشاہی کی کسی سفلہ کو ہووے گی	ولہ	مرے دل میں خدائی کا بھی خطرہ ہو، تو کافر ہوں
کافر ہو، جس کے دل میں کچھ اور آرزو ہو	ولہ	اک مختصر سی جا ہو، میں ہوں، اور تو ہو
مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی	ولہ	جس طرح کٹا روز، گذر جائے گی شب بھی
آخر تو شکایت سے مجھے منع کرے ہے		سی دیکھیو ٹک ہاتھ سے اپنے مرے لب بھی
جہاں روؤں تمنا میں تری اے شمع رو پیارے		اوگے اس گل زمیں سے حشر تک جوں لالہ انگارے
قمارِ عشق کی بازی بھی کچھ دنیا سے باہر ہے	ولہ	اُسے کہتے ہیں عاشق جو کوئی یہاں نقد جاں ہارے
آنسوؤں تک پونچھنے کی غیر کے تدبیر ہے	ولہ	مجھ سے اتنا بھی نہیں کہتا، کہ کیوں دلگیر ہے
چرخ کی برہم زنی سے یہ تعجب ہے بیاں		لیلیٰ و مجنوں کی یک جا اب تلک تصویر ہے
شب فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے	ولہ	یہی ہے صبح سے دھڑکا، کہ رات آتی ہے
جا کہو کوئے یار میں کوئی . .	ولہ	مر گیا انتظار میں کوئی

وہ بھی کیا رات تھی کہ سوتا تھا
سر رکھے اس کنار میں کوئی

ولہ
جادو تھا، کہ سحر تھی، بلا تھی،
ظالم یہ تری نگاہ کیا تھی
کیدھر ہے، کہاں ہے، اے خوشدلی تو
ہم سے کبھو تو آشنا تھی

ولہ
رسوا ابھی سے کرتی ہوای چشم تر مجھے
آتا ہے اس کی بزم میں بارِ دگر مجھے
آیا ہوں اس گلی سے ابھی، دم نہیں لیا
پھر لے چلا ہے یہ دل وحشی اُدھر مجھے
کُنج قفس سوا مری قسمت میں جا نہ تھی
تو کیوں دیئے فلک نے نمایاں بال و پر مجھے

ولہ
جھگڑتے تجھ سے پیارے حجاب آتا ہے
وگرنہ بات کا تیری جواب آتا ہے
پیوں شراب جوانو کہ موسم گل ہے
ہمیں بھی یاد وہ عہد شباب آتا ہے

اپنے دل سے بھی عداوت ہو گئی ہے اب مجھے
دشمن جانی ہو میرا، جو کوئی چاہے مجھے

کوئی مجنوں قیس نہ دیوانہ ہوا لیلی کا
میں ترے عہد میں دیکھوں ہوں جسے مجنوں ہے

ولہ
کیا زلف میں اُس شوخ کے تھی دیکھی صبح
یا شام سے پھولی تھی کسی شب کی صبح
ٹک زلف کو میں ہاتھ لگایا، کہ اودھر
ہمسایہ پکارا، کہ ہوئی کب کی صبح

رباعی
جس وقت کہ بیدار وہ ہوتا ہیں گا
عالم کی غضب سے جان کھوتا ہیں گا
غنچوں کو صبا کہیو، کہ آہستہ کھلیں
زانو پہ مرے وہ شوخ سوتا ہیں گا

رباعی
مت کہیو بیاں جام اجل پیتا ہے
یا اُس کے لئے کوئی کفن سیتا ہے
یارو جو مرے حال کو پوچھے وہ شوخ
اتنا کہیو، کہ اب تلک جیتا ہے

رباعی
سو طرح سے یہ عشق لُبھاتا ہے مجھے
ہر چیز میں یک جلوہ دکھاتا ہے مجھے
کس ماہ کا یہ عکس پڑا ہے یارب!
ہر چاہ میں یوسف نظر آتا ہے مجھے

رباعی
کہتا ہوں جناب حق میں ڈرتے ڈرتے
مدت گذری دعا ہی کرتے کرتے
ہے اُس کو یہ قدرت کہ بیاں سا مردم
منہ یار کا دیکھ لیوے، مرتے مرتے

۳۔ بقا

بقا تخلص، محمد بقا نام، بیٹا حافظ لطف اللہ کا، شاگردوں میں سے میرزا فاخر مکین تخلص کے، بقا فی الحقیقت عزیز نکتہ سنج، و باریک بین، و معنی بند، و سخن آفرین تھا، میرزا رفیع سودا تخلص کے منہ اکثر چڑھتا، اور اس نہنگ بحر معانی کے ہجو میں کچھ کچھ واہیات بکر بکا، لیکن میرزا مرحوم نے مطلق اعتنا نہ کی، اور یہ بات کہی کہ میں نے جس کی ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور ہے، سو تیری ہجو نہ کروں گا، کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے۔ غرض اس عزیز سے زمانے نے موافقت کبھی نہ کی، اور صورت روزگار کی بیچارے نے آئینے میں خیال کے بھی نہ دیکھی۔ افلاس سے تنگ آکر کسی کے کہے سے کچھ اعمال تسخیر کواکب کے شروع کئے تھے۔ خیال میں اس سودا ئے خام کے مجنون ہوئے، اور جیتک جئے سودائی رہے سلنلا بارہ سو چھ ہجری تھی، کہ حالت میں سودائی کے یہ بات سوجھی، کہ تحصیل دولت حقیقی کی کیجئے، اور خاک راہ سے کربلاء معلا اور نجف اشرف کے دیدۂ دل میں سرمۂ حق نما دیجئے یہ عزم کرکے جہاز پر سوار ہوئے، اور منزل مقصود کی طرف قدم گذار ہوئے۔ اثنائے راہ میں اس دار فنا سے، موافق نام اپنے کے، سفر ملک بقا کا کیا۔ خوشا یہ حال کہ انجام تو بہ خیر ہوا۔

یہ چند شعر اس راہ رو جادۂ بقا کے گوشۂ خاطر میں تھے، سو لکھے جاتے ہیں۔

یاد میں تڑپے ہے دل اس ابروئے خمدار کی — آج کچھ ناخن بل ہے آہ! اس بیمار کی

وله

دیکھئے ہیں منصب مجنوں پہ یہ لیلی صفتاں — خاک میں ہم کو ملا، کس کو سرفراز کریں

وله

کیا خط لکھوں اُس کو حرکت ہاتھ سے گم ہے — خامہ مرے اب ہاتھ میں انگشت شم ہے

وله

کس نے چمن میں رنجہ کیا عندلیب کو — غنچے رہے ہیں دانتوں میں داب اپنی جیب کو

وله

اس لب سے کچھ نہ چہ سے قدح، اور قدح سے ہم — تو کیوں ملے سبو سے قدح، او قدح سے ہم

پاتے ہیں میکدے میں بقا روز فیض سے — نہت سبو، سبو سے قدح اور قدح سے ہم

۴-بیدار

بیدار تخلص میر محمدی نام، شاہجہان آبادی، دوستوں میں سے خواجہ میر درد تخلص کے تھے۔ نزاکت سے معنی کے بخوبی آشنا، اور زباندان دلّی سے ہمیشہ ہم نوا رہے ہیں کہتے ہیں کہ کلام اپنا انہوں نے اصلاح کی تقریب سے خواجہ میر درد کو دکھایا ہے۔ اور اُس نقادِ بازارِ معانی سے فایدہ بہت سا اُٹھایا ہے۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں۔ کچھ اشعار منتخب اُن کے دیوان کے لکھے گئے یہاں ہیں ✦

تو نے جو مدتوں میں اِدھر کو گذر کیا — نالے نے آج کچھ تو ہمارے اثر کیا
غیرت نہ آوے تجھ کو ستمگر ہزار حیف — جس دل میں تو مقیم تھا وہاں غم نے گھر کیا
ہم غافلوں کی آہ نہ او دھر نظر گئی — اُس نے ہزار اپنے تئیں جلوہ گر کیا
اس کھیل سے کہ اپنی مژہ کو کہ بار ہٹے — عالم کو نیزہ بازی سے زیر و زبر کیا
دیوانے کو پری سے پھر اب کر دیا دو چار — اے آنکھوں کیا کیا مرے جی کا ضرر کیا
کیدھر ہے تو کہاں ہے اجابت کہ بارہا — میں نے بلند دست دعا سحر کیا
بیدار ایسے رونے سے امان بارہا — دامان و آستیں کو تو لوہو سے تر کیا

ولہ
آنکھوں میں چھا رہا ہے ازبسکہ نور تیرا — ہر گل میں دیکھتا ہوں رنگِ ظہور تیرا
بیدار وہ تو ہر دم سو سو کرے ہے جلوے — اُس کو جو تو نہ دیکھے ہیگا قصور تیرا

ولہ
جب کہا میں نے کہ اے سروِ ریاضِ خوبی — کس کا تو آفتِ جاں ہے تو کہا تجھ کو کیا
کہنے لگا دل گم گشتہ ہے ترا مجھ پاس — جب کہا میں نے کہاں ہے تو کہا تجھ کو کیا

ولہ
یہ کون ہے شکار نکلا — ہر دل ہوا امیدوار نکلا
جینے کی نہیں ہے اس کو — تیر اس کا جگر کے پار نکلا
ہم خاک بھی ہوگئے پر اب تک — دل سے نہ ترے غبار نکلا

جب بام پہ بے نقاب ہوکر   وہ صبح کو ایک بار نکلا
اُس روز مقابل اُس کے خورشید   نکلا بھی تو شرمسار نکلا

ولہ
نالہ ہرچند ہم نے کر دیکھا   آہ اب تک نہ کچھ اثر دیکھا
آج کیا جی میں آگیا تیرے   مُتبسّم ہو جو ادھر دیکھا

ولہ
بہے بیدار کی آنکھوں سے ساقی اشک سُرخ ایسے   مے گلگوں کا کوچہ میں گویا تیرے سبو ٹوٹا

ولہ
سبزۂ خط ترے عارض پہ نمودار ہوا   حیف اس آئینۂ صاف پہ زنگار ہوا
آج آتا ہے نظر دن مری آنکھوں میں سیاہ   رات اس زلف میں دل کہ گرفتار ہوا

ولہ
کھینچ کر زلف کی تصویر کو خط میں بھیجا   تاکہ معلوم کرے حال پریشان مرا

ولہ
اے شانہ کھولیو گرہ زلف سوچ کر   دل سیکڑوں ہیں اس میں گرفتار دیکھنا

ولہ
ہم چشم ابر دیدۂ تر گرچہ ہو سکا۔   لیکن غبارِ غم مرے دل سے نہ دھو سکا

ولہ
جو اب کے چھوڑے مجھو غم تری جدائی کا   تمام عمر نہ لوں نام آشنائی کا
آگے ہے پنجۂ مرجاں مزا سے اُس کے   شہید ہو جو کوئی اس کفِ حنائی کا
مرے قدم سے ہے سرسبز بوستان جنوں   ہر ایک آبلہ گل ہے برہنہ پائی کا

ولہ
کہو تو کس سے میں پوچھوں نشان خانۂ دوست   کہ آشیانۂ عنقا ہے آستانۂ دوست

ولہ
حال سُن سن کے ہنس دیا میرا   کچھ تو آیا ہے مہربانی پر

ولہ
آج ساقی دیکھ تو کیا ہے عجب رنگیں ہوا   سرخ ہے کالی گھٹا اور سبز ہے مینا کا رنگ

ولہ
اس سے دو چار ہو گئے مصحف   سو جی سے نثار ہو گئے ہم
فتراک میں باندھ خواہ مت باندھ   اب تیرے شکار ہو گئے ہم

ولہ
آ تیری گلی میں مر گئے ہم   جی تھا سو نثار ہو گئے ہم

ولہ
خاکِ عاشق ہے جو ہوتی ہے نثارِ دامن   اے مری جان تو مت جھاڑ غبارِ دامن
خلشِ خارِ رہِ عشق سے اب اے ناصح   نہ رہا ایک بھی ثابت مرا تارِ دامن

ہم ترے اس دلِ نازک سے خطر کرتے ہیں ۔ ولہ ۔ ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں
شب ہجراں میں نہ پوچھو کہ میں کیا کرتا ہوں ۔ ولہ ۔ صبح تک شمع کی مانند جلا کرتا ہوں

صورت اس کی سما گئی دل میں ۔ ولہ ۔ آہ کیا آن بھا گئی دل میں

ہم کو کہتے ہیں کہ عاشق کا فغاں سنتے ہیں ۔ ولہ ۔ یہ تو کہتے ہیں کہ باتیں ہیں کہاں سنتے ہیں

اٹھ گیا ہم سے گو مکدر ہو ۔ ولہ ۔ خوش رہے وہ جہاں ہو جیدھر ہو
اس سے بیدار بات تو معلوم ۔ دیکھنا بھی کہیں میسر ہو
تعجب ہے کیا ناتوانی سے میری ۔ ولہ ۔ کہ فصاد سے شرمندۂ نیشتر ہو
دل کو کرتا ہے نگاہوں میں شکار ۔ ولہ ۔ واہ وا رے تری صیادی کو
دیکھ آکر مری آنکھوں کی بہار ۔ کر دیا باغ ہر اک وادی کو
تری مجلس میں اگر ہو گذر پروانہ ۔ ولہ ۔ نہ پڑے شمع پہ ہرگز نظرِ پروانہ
ہے زمانہ سے جدا روز و شبِ عشاق ۔ شام کہتے ہیں جسے ہے سحرِ پروانہ
بوسۂ شمع کو جلنے کے بہانے آیا ۔ دیکھو اے بزم نشیناں ہنرِ پروانہ
قید سے شمع کی ممکن نہیں چھوٹے بیدار ۔ رشتۂ شمع سے باندھا ہے پرِ پروانہ
دیکھ تجھ کاکلِ مشکیں کی ادائیں شانہ ۔ ولہ ۔ دونوں ہاتھوں سیتی لیتا ہے بلائیں شانہ
اس کے بھر آئے ترے مرہم کاکل سے زخم ۔ ہاتھ اٹھا کیوں نہ کرے تجھ کو دعائیں شانہ
ایک دن گر نہ ملی تجھ سے تو آشفتگی ہو ۔ دیکھ لے کاکلِ مشکیں کی وفائیں شانہ

تھم گیا اشک شب ہجر میں روتے روتے ۔ ولہ ۔ سحرِ وصل کو مدت ہوئی ہوتے ہوتے
مردمِ چشم سے پوچھ اے مہ تاباں تجھ بن ۔ کون سی شب کہ نہ گذری مجھے روتے روتے
کیوں کر عاشق سے بھلا کوچۂ جاناں چھوٹے ۔ ولہ ۔ بلبل زار سے کیوں کر کہ گلستاں چھوٹے
کس کے آگے میں کروں چاک گریباں کہہ تو ۔ جو ترے ہاتھ سے ناصح مرا داماں چھوٹے

عاشق کا اگر دیدۂ خونبار نہ ہووے ۔ ولہ ۔ تو رشکِ چمن کوچۂ دلدار نہ ہووے

بخشی ہے جسے تجھ نگہ چشم نے مستی — وہ مست قیامت کو بھی ہشیار نہ ہوگی
بیجا ہے شکایت ستم یار کی بیدا — ممکن ہے کہ معشوق دل آزار نہ ہوگی

ولہ
نہ وفا ہے نہ مہر و اُلفت ہے — اے ستمگر یہ کیا قیامت ہے
گلِ صد برگ دیکھو اس کے ہاتھ — دلِ صد چاک کی کنایت ہے

ولہ
جس دن تم آ کے ہم سے ہم آغوش ہو گئے — شکوے جو دل میں تھے سو فراموش ہو گئے

ولہ
کہاں ہے تو کہ میں کھینچوں ہوں راہ میں تیری — برنگِ نقشِ قدم انتظار آنکھوں سے

ولہ
ابتک مرے احوال سے وہاں بیخبری ہے — اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے

ولہ
فولاد دلاں چھوڑیو زنہار نہ مجھ کو — چھاتی مری جوں سنگ شرر لعل سے بھری ہے
کس باغ سے آتی ہے بتا مجھ کو کہ یہ آج — کچھ اور ہی بو تجھ میں نسیم سحری ہے

ولہ
لبِ نگیں ہیں ترے رشکِ عقیقِ یمنی — زیب دیتی ہے تجھے نامِ خدا کم سخنی
ہار پہرے تھے جو پھولوں کے نشاں ہوا ابتک — ختم ہے گلبدنوں میں تری نازک بدنی

ولہ
نشہ میں جی چاہتا ہے بوسہ بازی کیجئے — اتنی رخصت دیجئے بندہ نوازی کیجئے

ولہ
زاہد اس راہ نہ آ مست ہیں میخوار کئی — ابھی یہاں چھین لئے جبہ و دستار کئی
کف پا میں ترے صحرا کی نشانی پیدا — مر گیا تو بھی پھپھولوں میں رہے خار کئی

ولہ
میر مجلس رنداں آج وہ شرابی ہے — خون دل جس سے مرا بادۂ گلابی ہے
ترے اے پری پیکر سینہ پر نہیں پستاں — طاق حسن پہ گویا شیشۂ حبابی ہے

ولہ
دوستو جانے دو اب ہاتھ اُٹھاؤ ہم سے — یہ ہے وہ زخم کہ بہ ہو نہ کسی مرہم سے
مہرباں خیر تو ہے کس پہ یہ غصہ کیجے — آج آتے ہو نظر کچھ تو مجھے برہم سے

ولہ
جو کچھ چاہئے آپ فرمائیے — پہ غیروں کی باتیں نہ سنوائیے
ڈراتے ہو کیا قتل کرنے سے ہم کو — اگر یوں ہی جی میں ہے تو آئیے

رباعی
بیدار رواں ہے اشک دریا دریا — بتلا تو کہ ہے دیدۂ تر دریا دریا

بعد نے سے ترے تمام خانہ ہو خراب — حیران ہوں میں اس میں ہی گھر یا ہلا

۵۔ بسمل

بسمل تخلص، سید جبار علی نام، متوطن جبار گڑھی۔ چند مدت انہوں نے عظیم آباد میں گذر گئے ہیں بلکہ تھوڑے سے دن مہاراجہ جیت سنگھ، بنارس کے راجہ، کی وکالت میں اوقات بسر کی ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ ۱۱۹۶ھ گیارہ سو چھیانوے ہجری میں میر مذکور سے بلدۂ محمد آباد بنارس میں مکرر اتفاق ملاقات کا ہوا ہے۔ جوان سلیم الطبع اور سخن فہم نظر پڑا آزاد وضع اور وارستہ مزاج دکھائی دیا۔ یہ اشعار اس کے خلاصۂ افکار ہیں۔

نامۂ درد و الم میں نے جب آغاز کیا — جو ترے غم کے سوا تھا قلم انداز کیا

ولہ
اتنا بھی داغِ عشق سے معمور ہو گیا — سینہ تمام خانۂ زنبور ہو گیا

ولہ
یار تیری ہی زلف میں دیکھا — ایک زنجیر لاکھ دیوانہ

ولہ
کیا خیال آوے بلاؤں سے اُسے پرہیز کا — ہے جو بیمار اس تری چشمِ بلا انگیز کا
آگ ہر ساعت برستی ہے نہ تنہا چشم سے — ہے تماشا استخوانوں میں مری گلریز کا

ولہ
جب غمزۂ چشمِ یار دیکھا — سو تیر جگر کے پار دیکھا
یاد آ گئی مشتِ خاک اپنی — اُڑتے جو کہیں غبار دیکھا

ولہ
دل خس و خاشاک کی صورت اٹکتا ہی رہا — گو سدا دامن کو اپنے وہ جھٹکتا ہی رہا
جستجو میں یار کی گم کردہ راہوں کی طرح — میں کبھی ادھر کبھی اُدھر بھٹکتا ہی رہا

ولہ
خط ترا نامِ خدا خط ہے ادا و ناز کا — دیکھئے انجام کیا ہوتا ہے اس آغاز کا

ولہ
کیا اس کو جتا دیں ہم جو ہم نے کیا ہو گا — کیا کیا نہ کیا ہو گا جب دل کو دیا ہو گا

ولہ
دل میں بہ رنگِ موج تمہارے وصال کا — بڑھ بڑھ کے اشتیاق کئی بار گھٹ گیا

ولہ
ہر دم مجھے نیاز اُسے ناز ہی رہا — انجامِ کارِ عشق کا آغاز ہی رہا

صیاد فائدہ ہے رہائی سے کیا مجھے — اُڑنے سے جب مرا پر پروازہی رہا

ولہ

سدا انگلا ہی کرتا ہے پگھل کر آتشِ غم سے — سرشک آنکھوں سے میری روغن بادام کی صورت
خدا ہرگز نہ دکھلاوے کسی کو مہر بسمل کے — تہارے خنجر مژگانِ خون آشام کی صورت

ولہ

تیرِ نگاہ بسکہ لگی چھوٹ چھوٹ کر — چھاتی مشبکہ وار ہوئی پھوٹ پھوٹ کر
یہ داغ عشق مثل سِیئے نئے نواز کے — نکلے ہے بند بند سے اب پھوٹ پھوٹ کر

ولہ

پہلو میں رکھوں میں دل ناشاد کہاں تک — اے درد کروں نالہ و فریاد کہاں تک
در آج قفس کا ہے کھلا کیجئے پرواز — اے ہم قفساں خاطرِ صیاد کہاں تک

ولہ

نزلے نسے نرالے میں جگر افگار کہتا ہوں — کہ لوگ ابرو جسے کہتے ہیں میں تروار کہتا ہوں

ولہ

جز یادِ حق نہ ہو ترے دل میں کبھو گرہ — دے سجدہ وار منہ پہ اگر اپنے تو گرہ
ہر دم نمود قبضہ شمشیر کی طرح — رہتی ہے ابروؤں میں ترے تند خوگو

ولہ

دل کی طلب ہے اور تمنا ہے جان کی — کیا مہربانیاں ہیں مرے مہربان کی
درد و الم سے منزلت دل ہے بس بلند — یعنی مکیں سے ہے گی بزرگی مکان کی

ولہ

لے خانہ اس غلام ارشاد کیجئے — گو کام کا نہ ہو وے تو آزاد کیجئے
کوے بتاں تلک تو رسائی محال ہے — جب تک یہ مشتِ خاک نہ برباد کیجئے

ولہ

پیارے یہ وضع چشم مروت سے دور ہے — دل لے کے اس طرح بھی نہ آنکھیں چرائیے

ولہ

رو برو تیرے ہی گر ظالم نہ یہ دل کیجئے — پھر اس آئینہ کو جا کس کے مقابل کیجئے

ولہ

اُٹھتا ہے وہ غبار ہمارے مزار سے — ٹکر لیا کرے ہے جو تت کو ہسار سے
آوارگی سے باز رکھوں آہ کس طرح — دل تو گزر چکا ہے مرے اختیار سے

ولہ

گریہ افزا اس قدر اعضا مرے سارے ہوئے — ہر بُنِ مو جوش سے آنسو کے فوارے ہوئے

ولہ

جوش آئی ہمارے وہ جو کچھ کہ تھی پیشانی — اب یہ درد دولت ہے اور اپنی یہ پیشانی

ولہ

عشق کی بازی میں بسمل دل چلے در کار ہے — کس لئے تو اس قدر بیٹھا ہو جی ہار کر ہوئے

تیری ہی یاد و ذکر ہی تیرا ہر آن ہے	ولہ	گویا کہ اس لئے مرے منہ میں زبان ہے
عہد و پیمانِ بتاں بسکہ یہ سالوسی ہے	ولہ	ایک اُمید تو سو باعثِ مایوسی ہے
داغ اتنے ہی دیئے عشق نے پیکر کو تمام		مو بہ مو تن پہ مرے جلوۂ طاؤسی ہے
آیئے جلد کہ یہ بسمل مجروح ہنوز		ہر لبِ زخم سے مشتاقِ قدم بوسی ہے
دُکھ درد کو کب تلک حکایت کیجے	رباعی	دوراں کی کہاں تلک شکایت کیجے
اس کشورِ دل پہ فوجِ غم کا ہے ہجوم		یا شاہ و نجف میری حمایت کیجے

بابُ الثناء

۱۔ تانا شاہ

نام نامی اور اسمِ گرامی اس بادشاہ عشرت دوست کا ابوالحسن تانا شاہ ہے۔ سلاطینِ نامدار اور خواقین عالی مقدارِ دکھن سے تھا۔ اگرچہ شہرہ عیش و نشاط کا اور آوازہ مسرت و انبساط کا اس عیشِ مجسم کے ماہ سے ماہی تک مشہور ہے، لیکن کچھ تھوڑا سا احوال اس سر آرائے بارگاہِ عیش و کامرانی کا یہاں لکھنا ضرور ہے۔ جس ایام میں کہ عالمگیر خلد مکان نے عادل شاہی اور نظام شاہیوں کو زیر و زبر کیا، اور صوبہ دکھن کو بعد بہت سی خرابی کے لیا، تو ابوالحسن تانا شاہ بھی نظربندی میں آئے، اور فلکِ نیرنگ باز نے بدلے اس عیش و عشرت کے اور ہی رنگ دکھائے۔ سامانِ عیش سب برہم ہوا، اور مجمعِ اسبابِ نشاط حلقۂ ماتم ہوا۔ خلد مکان نے جس قدر تنگی ان کے اوقات میں چاہی، انہوں نے قبول کیا، لیکن حقہ کے مقدمہ میں بہت سماجت کے ساتھ اتنی بات کہلا بھیجی کہ اس کا شوق مجھے نہایت ہے، جو رعایت کہ اس کے سامان میں ہو گی وہ عین عنایت ہے۔ ازبسکہ یہ بادشاہ عشرت دوست آٹھ پہر نشۂ عیش میں مخمور رہتا تھا، حقہ ایک دم منہ سے نہیں چھٹتا تھا، اور یہ بھی معمول تھا کہ بعد ہر چلم کے ایک شیشہ سے گلاب کے حقہ تازہ

ہووے، پھر ایک شیشہ میں بید مشک کے حقہ بردار نیچے کو بھگوئے، شغل میں عیش و نشاط کے
ازبسکہ دن کو کم سوتے تھے، سیکڑوں شیشہ گلاب خاص اور عرق بید مشک کے دن رات میں
خرچ ہوتے تھے۔ یہ سب احوال مفصل خلد مکان کو معلوم تھا۔ علاوہ اس کے بادشاہ نے اس گنج
سے کہلا بھیجا۔ بارہ سولہ شیشہ گلاب کے اور آٹھ شیشہ بید مشک کے حکم فرمائیے۔ سبحان اللہ!
یا تو حقہ آٹھ پہر منہ سے نہیں چھٹتا تھا، اور اُن کے دودِ مغل کے رشک سے دھواں حسد کا حقہ
سر آسمان میں گھٹتا تھا، یا ہیچ سے فلک حقہ باز کی آٹھ چلمیں دن رات میں یہ پیتے تھے، اور گھونٹ
گھونٹ کر عجب پیچ و تاب کے ساتھ جیتے تھے۔ اس میں بعد کئی دن کے حضرت خلد مکان نے فرمایا کہ
سولہ شیشہ گلاب اور بید مشک کے ہر روز حقہ کے مصرف میں آنے اسراف ہے، اور امورات
شرعی میں پاسِ خاطر بیجا ہے، اور تکلف رسمی معاف ہے۔ آٹھ شیشہ ہر روز یہاں سے جایا کریں
ایک شیشے سے بعد ہر چلم کے حقہ تازہ کر کے آٹھ چلمیں دن رات میں پئیں۔" جب حضور سے ہر روز
آٹھ شیشہ آنے لگے، تو یہ دن رات میں لاچار چار چلموں سے دل بہلانے لگے۔ یہ ماجرا سُن کر
خلد مکان نے منہ کے مارے چار شیشوں کی اور تخفیف کی۔ انہوں نے اپنے حقہ بردار کو دو چلموں
کی پروانگی دی۔ بعد کئی دن کے جب دو شیشے اور کم ہوئے، تو ایک چلم دن رات میں یہ پیا کرتے
تھے۔ جس دن ان دونوں شیشوں کا بھی آنا موقوف ہوا، اُس دن انہوں نے عرض کیا۔ جہاں
پناہ کی دولت سے اتنا کچھ بعد خرچ کے جمع کیا ہے کہ دس چلمیں روز اسی خرچ کے ساتھ سالہا سال
پیا سکتا ہے، اُمید ہے کہ بھیڑی خانے کے خرچ کا غلام کو حکم ہووے کہ نہال نمک حلال کا زمین
میں سرخروئی کے بووے۔ ارشاد فرمایا کہ حضرت اعلیٰ کو امورات شرعی کا بہ شدت دھیان ہے،
اگرچہ مسجد کا کھود ڈالنا، خزانہ اُس کے نیچے گڑا سُن کر، نہایت آسان ہے، تو جو ہمارے مصرف
بیجا کا کفیل ہوتا ہے ابھی ایک دم میں جمع پونجی سرپلتہ دم کے ہوتا ہے۔ غرض اُس دن سے پھر حقہ
نہ پیا، جب تک کہ ان کی نظر بندی میں رہے، اور اس سرائے فانی سے عالم باقی کو تشریف لے گئے
سبحان اللہ! چشم حقیقت بین سے اگر کوئی دیکھے تو دنیا جائے حسرت ہے، بلکہ خانۂ عبرت ۔

کدھر ہیں خسرو و جم لطف کیقباد کدھر	کہاں سکندر و دارا کہاں ہے کیکاؤس
جو مست جاہ ہیں دیکھیں وہ چشم عبرت سے	کہ ان کے ساتھ گیا غیر حسرت و افسوس

اگرچہ ملک گیری اور کشورستانی کے معاملہ کو سمجھنا شاہانِ عالی تبار پر ختم ہوا ہے، گدائے گوشہ نشین کو دخل ان امورات میں کیا ہے، لیکن بعضے دانشمند کہتے ہیں کہ خلد مکان نے استیصال بادشاہانِ دکن کا جو اس محنت سے کیا، اور مکہ مسجد[1] کو کھدوا کے وہ کچھ مظلمہ اپنی گردن پر لیا، خدا جانے اس حرکت کا کیا مفاد ہے، تحصیل حاصل سے بھی اس میں کچھ کیفیت زیادہ ہے، کس واسطے کہ پیش از تسخیر دکن کے بھی خراج و باج اس طرف سے چلا آتا تھا، اور بادشاہان ہندوستان کا شہنشاہ کہلاتا تھا۔ مآل اس مشقت کا اجوبہ نظر آیا، کہ اس حسن تردد نے شاہنشاہ کو بادشاہ کر دکھایا۔

واقف رموز ملک سے ہیں شاہ دہر ہائے	ہے تو گدائے گوشہ نشیں لطف کچھ نہ بول[2]

غرض شاہ عالیجاہ ابوالحسن تاناشاہ کی طرف لوگ اس مطلع کو منسوب کرتے ہیں، اور باعتبار محاورۂ دکن کے، اور بندش قدیم کے، کہ اس مطلع میں ہے، ابراہیم خاں مرحوم بھی گفتگو پر لوگوں کی گوش دل کو دھرتے ہیں۔ مطلع یہ ہے:

کس سوں کہوں، جاؤں کہاں، مجھ دل پہ کھیل بھاری ہے	اک بات کے ہونگے سجن، یہاں جی ہی بارہ بات ہے

۲۔ تاباں

تاباں تخلص، میر عبدالحی نام، شاہ جہاں آبادی۔ نہایت عزیز خوبصورت اور صاحب جمال تھا، ایسا کہ دلی سے شہر میں بے مثال تھا۔ ہندو مسلمان ہر گلی کوچہ میں ایک نگاہ پر اس کی لاکھوں جان سے دین و دل نذر کرتے تھے، اور پرے کے پرے عاشقانِ جانباز کے یاد میں اس لبِ جان بخش

---

[1] مکہ مسجد حیدرآباد میں اب تک موجود ہے۔ اس کا کھدوانا خلاف واقعہ ہے ۱۲

[2] مصنف نے حافظ کے اس شعر کا ترجمہ کیا ہے ؎

رموز مملکت خویش خسرواں دانند	گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

مسیحا دم کے مرتے تھے۔ تکلف یہ ہے کہ اس رعنائی اور دل ربائی پر خود بدولت بھی دل کو کھو بیٹھے تھے، اور ہنستے ہنستے بے اختیار صبر اور اختیار کو رو بیٹھے تھے۔ اس بے دردی اور شیریں ادائی پر مانند فرہاد کے چاشنیٔ درد سے آگاہ، اس سرد مہری اور لیلی صفتی پر مانند مجنوں کے ہمیشہ سرگرم نالہ و آہ تھے، یعنی ایک سلیمان نام لڑکے کو چاہتے تھے، اور اُس کے دردِ محبت سے، باوجود وصل کے، آٹھ پہر کراہتے تھے۔ وہی سلیمان، کہ بالفعل شاہ سلیمان کر کے معروف تھا، اور ادا کرنے میں راہ و رسمِ درویشی کے بہ شدت مصروف، اس مورِ ضعیف نے عالمِ پیری اُس کا ہاں سنہ ۱۲ بارہ سو ایک ہجری سے، کہ بلدۂ لکھنؤ میں دیکھا۔ اگرچہ ریش سفید اور قد خمیدہ رکھتا تھا، لیکن اُسکے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کسی وقت میں بڑے بڑے گردن کش، سوئی کے ناکے سے نکالے ہوں گے۔

غرض میر عبدالحی تاباں تخلص میرزا جان جاناں مظہر سے اور میرزا رفیع سودا سے ہمیشہ صحبت رکھتے تھے، بلکہ میرزا رفیع سودا بنا بر اک نظر توجہ کے، کہ اُن کے حال پر تھی، اکثر اشعار کو ان کے اصلاح کرتے تھے۔ عین شباب کے عالم اور جوبن کے عروج میں، کہ زمان فرمان فرمائی محمد شاہ فردوس آرام گاہ کا تھا، اس ماہِ تابانِ حسن نے جامۂ زندگی کو مانند کتان کے چاک کیا ہے۔ یہ منتخب ان کے دیوان کا ہے۔

سبز خط سے دونا ہوا حسن یار کا		آخر خزاں نے کچھ نہ اکھاڑا بہار کا
اکثر جو اس زمین کو ہوتا ہے زلزلہ		شاید گرا ہے جسم کسی بے قرار کا
کس کس طرح سے دل میں گنتی ہیں حسرتیں		ہے وصل سے زیادہ مزا انتظار کا
اخگر کو چھپا راکھ میں، میں دیکھ کے سمجھا	ولہ	تاباں تو تہِ خاک بھی جلتا ہی رہیگا
کوئی دوسرا مجھ سا تاباں نہ ہوگا	ولہ	کہ دل دے تجھے پھر پشیماں نہ ہوگا
جفا سے اپنی پشیماں نہ ہو، ہوا سو ہوا	ولہ	تری بلا سے، مرے جی پہ جو ہوا سو ہوا
نہ پائی خاک بھی تاباں کی ہم نے پھر ظالم		وہ ایک دم ہی ترے روبرو ہوا سو ہوا

بیتابیوں کی عشق کے کرتا ہے کیا علاج　ولہ　تاباں یہی جو دل ہے تو آرام ہو چکا

آشنا ہو چکا ہوں میں سب کا　ولہ　جس کو دیکھا سو اپنے مطلب کا
ہیں بہت جامہ زیب، پر ہم نے　　کوئی دیکھا نہیں یہ چپ ڈھب کا
یاں پلک بھی نہ ہم سکیں جھپکا　　ایسا قاصد تو جائیو لپکا ۶۶

دیا ہے جی میں اپنا دیکھ کر سج جسکے جامے کی　ولہ　اُسی کاٹے کے دامن کیجیو یارو کفن میرا
لیا تھا دوستی سے جن نے دل ہائے　ولہ　وہ اب دشمن ہوا ہے میرے جی کا
مجھے ترسا کے اس کافر نے مارا　　نتیجہ کیا یہی تھا عاشقی کا
ہونٹوں پہ تیرے ظالم مِسّی کی یہ دھڑی ہے　ولہ　یا اُن کے تئیں کسی نے ل ل کیا ہے نیلا
اکیلا صنم باغ میں کل گیا تھا　ولہ　اسے دیکھ کانٹوں پہ گُل لوٹتا تھا
لیا چاہ سے کھینچ یوسف کو اپنے　ولہ　ترا عشق تاباں قیامت رسا تھا
فغاں نے مرا مُنہ پھر آ کر کھُلایا[1]　　ابھی روتے روتے ہی چپکا رہا تھا
مری لوح تربت پہ یارو کھُدانا　ولہ　نہ اس سنگ دل سے کوئی جی لگانا
ترے غم سے نسیاں ہے یاں تک تو مجھکو　　اِدھر بات کہنا اُدھر بھول جانا
گلی میں اپنی روتا دیکھ مجھ کو وہ لگا کہنے　ولہ　کہ کچھ حاصل نہیں ہونیکا ساری عمر رو بیٹھا
صبا میرا پیغام اُن تک تو لے جا　ولہ　کہ تجھ بن رہیں ہم، کہاں یہ کلیجا!
کسی بات کا میں نہ شکوہ کروں گا　　ترے جی میں آوے سو مجھ کو کہے جا

ایسے کے تئیں کوئی سر پہ بھی چڑھاتا ہے؟　ولہ　کھینچے ہے تری زلفیں، کیا شوخ ہے یہ شانہ
تمہارے ہجر میں رہتا ہے غم ہم کو میاں صاحب　ولہ　خدا جانے جئیں گے یا مرینگے ہم میاں صاحب
مرا بس ہو تو ہرگز خط نہ آنے دوں ترے لیکن　ولہ　لکھا قسمت کا کوئی بھی مٹا سکتا ہے کیا قدرت

[1] یعنی کھلوایا ۱۲

ولہ
غیر کے ہاتھ میں اُس شوخ کا دامان ہے آج — میں ہوں اور ہاتھ ہے اور میرا گریبان ہے آج

ولہ
لے میری خبر چشم سے یار کی کیوں کر — بیمار عیادت کرے بیمار کی کیوں کر

ولہ
کہتے ہیں اثر ہیگا گریہ میں یہ باتیں — اک دن بھی نہ یار آیا روتے ہی کٹیں راتیں

ولہ
سن فصل گل خوشی ہو گلشن میں آشیاں میں — کیا بلبلوں نے دیکھو دھومیں مچائیاں ہیں
بیٹھا ہے زمیں سے اُٹھتی نہیں عصا بن — نرگس کو تم نے شاید آنکھیں دکھائیاں ہیں
قسمت میں کیا ہی دیکھیں جیتے رہیں کہ مرجائیں — قاتل سے اب تو ہم نے آنکھیں لڑائیاں ہیں

ولہ
آشنا تو مجھ سے ایسا ہے کہ جیسا چاہیئے — پر جو کچھ دل چاہتا ہے ہائے وہ ہوتا نہیں

ولہ
شب کو پھرے وہ رشک ماہ خانہ بخانہ کو بکو — دن کو پھروں میں دادخواہ خانہ بخانہ کو بہ کو

ولہ
گئے نالہ ترے برباد جوں بانگ جرس چپ ہے — اثر دیکھا تری فریاد میں مُل ہم تے بس چپ ہے

ولہ
سلیماں کیا ہوا اگر تو نظر آتا نہیں مجھ کو — مری آنکھوں کی پتلی میں تری تصویر پھرتی ہے

ولہ
بتاں کے شہر ناپُرساں میں کب کوئی داد کو پہنچے — مگر یہاں اپنے بندوں کی خدا فریاد کو پہنچے

ولہ
تو بھلی بات سے بھی میری خفا ہوتا ہے — کیا بھلا چاہنا ایسا ہی بُرا ہوتا ہے
تیری ابرو سے مرا دل نہ چھٹے گا ہرگز — گوشت ناخن سے کہوں کوئی جُدا ہوتا ہے

ولہ
ترے پاس عاشق کی عزت کہاں ہے — تجھے بے مروت مروت کہاں ہے
میں شکوہ کروں جور ظالم سے لیکن — مجھے آہ و نالہ سے فرصت کہاں ہے
بیاں کیا کروں ناتوانی میں اپنی — مجھے بات کہنے کی طاقت کہاں ہے
جو اُس کی کمر میں نے دیکھی ہے تاباں — رگ گل میں ایسی نزاکت کہاں ہے

ولہ
جو کرتا ہوں فریاد میں اُس کے آگے — تو کہتا ہے تاباں تو جاتا نہیں ہے
ابھی پست ہو جائیگا[۱] نالوں کے مارے — ترا شور کچھ مجھ کو بھاتا نہیں ہے

---

۱ ہو جائیگا یعنی ہو جائے گا۔

رباعی

ہوتا ہوں ترا جو اشتیاقی ساقی — بیخود ہو پکارتا ہوں ساقی ساقی
ہے مجھ کو خمارِ شب کا لا، صبح ہوئی — شیشے میں جو کچھ کہ ہے ہو باقی ساقی

مخمس

بیاں میں کیا کروں دیوانگی کا اپنی افسانہ — نہ میرا گھر میں جی لگتا نہیں بھاتا ہی ویرانہ
خوش آتا ہی مجھے گلیوں میں سنگِ کودکاں کھانا — ارے ناصح عبث ہی یہ ترا بیہودہ سمجھانا
پھر یہ وہ جذبہ جس کا سو ہو کیونکر نہ دیوانہ

عبث مت بک نہیں میں مانتا کہنا ترا ناصح — مری آہ و فغاں کرنے سے تجھ کو کیا ناصح
میں اپنے جی ہی سے بیزار ہوں مت تو ستا ناصح — بھلا چاہے تو اپنی آبرو کر لے کے جا ناصح
مجھے بے طرح آتا ہی تری باتوں پہ جھنجھلانا

تو کیوں بیہودہ بکتا ہے نصیحت کے سخن اکثر — سنوں کیونکر تری باتیں کہ میرا حال ہی ابتر
رہوں آرام سے بے یار اے ناصح بھلا کیونکر — کہ میری زندگی اور موت ہی موقوف اُن جا پر
اگر آوے تو جی جانا وگر جاوے تو مر جانا

کبھی اوقات کے تئیں کرتا ہوں گھر میں نالہ و افغاں — کبھی پھرتا ہوں صحرا میں وحشت سے ہو عریاں
کبھو ہوتا ہی تاباں ساتھ میرے محنتِ طفلاں — مرے تئیں اس طرح سی دیکھ کر سب خرد و کلاں
کوئی کہتا ہی سودائی کوئی کہتا ہی دیوانا

بابُ الجیم

۱۔ جہاندار

جہاندار تخلص، میرزا جواں بخت جہاندار شاہ نام، خورشید آسمانِ بلند اختری اور سرفرازی کا ولی عہد شاہ عالم بادشاہ غازی کا، رونق دینے والا بارگاہ جہانداری اور جہانبانی کو، زینت بخشنے والا مسندِ ملک گیری اور کشورستانی کو، ہر خطِ جبینِ جہاں افروز کا اُس کے واسطے روشن کرنے عالم کے، مانند خطوط شعاعی آفتاب کے، دور کرنے والا تاریکی فلاکت کا تھا، اور دو دست دریا نوال اُسکا

افراطِ جود و کرم سے مانند یدِ بیضا کے روشن کرنے والا خوش ناموسِ امارت اور ایالت کا بخشش نے
اُس کی، دشمنیِ آسمان کے دل سے فلک زدوں کی نکالی، اور ہمت نے اُس کی گرہ بدطالعی کی
پیشانی سے بدبختوں کی کھول ڈالی جس ایام میں کہ ناموافقت سے اُمراءِ دولت کی۔ نشانِ کیوان
شان اس فلک جناب کے دار الخلافہ دلّی سے بیچ حرکت کے آئے، تو ۱۱۹۵ھ گیارہ سو پچانوے
ہجری تھے، کہ خود بدولت واقبال لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے، جو مراتب
آداب و خدمت گذاری کے تھے، سب ادا کئے، خواصی میں بیٹھنے کے سوائے گھڑیوں ہاتھ باندھے
سامنے کھڑے رہے۔ باوصف اس ناز پروری کے کبھی پیادہ چار قدم کاہے کو چلے تھے۔ پانچوں
ہتیار باندھے ہوئے ایک الائچی اور گلوری کی بخشش پر دس دس مرتبہ حجرہ گاہ پرسے جاکر آداب بجا
لاتے تھے۔ غرض اس شہزادۂ عالی تبار کی طبیعت شعر کی طرف اس قدر آئی تھی، کہ مہینے میں دو مرتبہ
بنا مشاعرے کی اپنے دولت خانہ میں ٹھہرائی تھی۔ شعراے باوقار کو اپنے چوبدار بھیج کر مشاعرے کے
دن بلواتے، اور ہر ایک شخص سے نہایت الطاف اور عنایت کے ساتھ گرمجوشی فرماتے۔ چنانچہ
راقم حقیر کو جب یاد فرمایا، تو اس ہیچمدان نے یہ عذر کہہ بھیجا کہ "کمترین نے مشاعرے کا جانا مدت سے
موقوف کیا ہے، ازبسکہ ان صحبتوں میں مناظرہ ہی کو یارانِ عالی حوصلہ نے رواج دیا ہے، اگر
ارشاد ہو تو سوائے مشاعرے کے ایک دن بندگی میں حاضر ہوں، اور اس تخم ناکاشتنی بیغز
کو موافق ارشاد کے زمین عرض میں بوؤں۔ پذیرا نہ ہوا، پھر چوبدار آیا، اور یہ ارشاد فرمایا کہ تیرا حاضر
ہونا مشاعرے میں نہایت ضرور ہے، مناظرے کا مطلق ہمارے ہاں نہیں دستور ہے۔" غرض
ایما سے نواب آصف الدولہ مرحوم کے حاضر ہوا، اور شرف سعادتِ ملازمت کا حاصل کیا۔ مگر غزلیں
اُس دن ازراہ تفضلات کے پڑھوائیں، اور ہر شعر پر کیا کہوں کہ کیا کیا عنائتیں فرمائیں۔ پھر اپنی
طبع نازاد سے بہت کچھ ارشاد فرمایا، اور سامعین کو موردِ عنایت وامداد فرمایا۔ سن ۱۲۰۱ھ بارہ سو ایک
ہجری میں بلدۂ بنارس کے اندر اس سریر آرائے بارگاہ شوکت و اجلال نے تخت نشینی ملک فنا
کی چھوڑ کر اورنگ آرائی کشور بقا کی اختیار کی۔ یہ اشعار منتخب اُس سلطان عالی تبار کے ہیں :۔

نہ پوچھو دہر میں کیا کر چلے ہم — اسی ہی آرزو میں مر چلے ہم
رہے اک شب جو اس ماتم کدے میں — بسانِ شمع رو رو کر چلے ہم
اکیلے تھے ہم اب اک فوجِ غم ہے — ترے در سے مع لشکر چلے ہم
نہ تھے جوں گل کبھی اوراقِ دل جمع — کہ اس گلشن میں کر ابتر چلے ہم
رہے در پر بتاں کے تم جہاندار — خدا حافظ تمہارا گھر چلے ہم

جدا ہو تجھ سے صنم سخت بیقرار ہوں میں — ملہ یہ دیکھ آئینہ ساں چشمِ انتظار ہوں میں
بسا ہے میرا سراپا جو عطرِ فتنہ سے — یہ کس کی نرگسِ فتاں سے دو چار ہوں میں
نہ جور سے فلکِ حیلہ گر سے گھبرا کر — مثال ابرِ بہاری کے اشکبار ہوں میں
نظر پڑا ہے وہ آویزۂ گہر جب سے — صدف سے چشم کی تب سے گہر نثار ہوں میں
ہے آفتاب کا سر پہ مرے جو پرتوِ مہر — بسانِ ماہ جہاندار آشکار ہوں میں

ہیں بسکہ جزوِ تن مرے طاؤس آسا داغ — ملہ رکھتا ہے ایک ایک عجب ہی بہار داغ
رعنائی تیری دیکھ کے اس سروِ باغِ حسن — جوں لالہ دل پہ کھاتے ہیں سب گلعذار داغ
آتش پہ رکھ کے دل کی جہاندار جوں سپند — چاہوں جو بیٹھ رہے، کہیں رکھتا قرار داغ

۲-جرأت

جرأت تخلص، یحییٰ امان قلندر بخش نام، بیٹا حافظ امان کا۔ شاعرِ شیریں کلام ہے۔ ظاہراً لفظ امان کلاں کے بزرگوں کے نام پر بطور خطاب کے زبانِ اکبری سے چلا آتا ہے، اور جرأت مذکور رشید شاگردوں میں میرزا جعفر علی حسرت تخلص کے گنا جاتا ہے۔ علمِ موسیقی میں مشغلہ بھلا چنگا رکھتا ہے اور ستار کے بجانے میں نہایت دست رسا رکھتا ہے۔ نجوم میں بھی اس شخص کو دخل تمام ہے، ایسا کہ ایک عالم لکھنؤ کا اس کا منتظرِ احکام ہے۔ تمام عمرِ عزیز کی بیکاری میں بسر ہوئی ہے، اور بے روزگاری میں کٹی ہے۔ ابتدا میں نواب محبت خاں محبت تخلص اعانت اخراجات ضروری

کی کرتے تھے، بالفعل، کہ سنہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، صاحب عالم و عالمیان میرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے کچھ امداد ہوتی ہے۔ اگرچہ بصارت چشم سے یہ عزیز معذور ہے، پر ملاقاتوں کو دوستوں کی پھرتا دور دور ہے گو کہ آنکھوں سے کچھ نہیں سوجھتا ہے، لیکن مضمون رنگیں سوجھتا ہے۔ بزبان ریختہ میں صاحب دیوان عظیم الشان۔ یہ اس کا منتخب دیوان ہے +

چین اس دل کو نہ اک آن ترے بن آیا | ولہ | دن گیا رات ہوئی، رات گئی دن آیا
دل بدن تحلیل تو جرأت ہوا جاتا ہے کیوں؟ | ولہ | آہ! یہ بیٹھے بٹھائے تجھ کو کس کا غم لگا
دل کو اے عشق سوئے زلف سیہ فام نہ بھیج | ولہ | رہزنوں میں تو مسافر کو سر شام نہ بھیج
روشن ہے اس طرح دل ویراں کا داغ ایک | ولہ | اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک
میرے ہونے سے تو کچھ گرمی بازار نہیں | ولہ | ہوں میں وہ شے کہ کوئی جس کا خریدار نہیں
دل تو اٹھے ہے پہ حیرت سے میں کیونکر رو دوں | ابر تصویر کو گریہ سے سروکار نہیں
درد کیا جانئے کیا کیا یہ بیاں کرتا یار | دہن زخم کو گویا لب گفتار نہیں
تیرے بیمار سا بیمار نہ ہوگا کوئی | جس کو ظاہر میں جو دیکھو تو کچھ آزار نہیں
جس کے غم میں آہ ہم آرام سے واقف نہیں | ولہ | کیا غضب ہے وہ ہمارے نام سے واقف نہیں
رو کے میں پوچھا کہ مقصد جانتے ہو تم مرا | ہنس کے بولا میں کسی کے کام سے واقف نہیں
کیا قتل دو عالم تو نے جنبش سے اک ابرو کی | ولہ | اگر یہ جھوٹ ہو تو تیغ پر ہم ہاتھ دھرتے ہیں
برنگ طائر تصویر ہیں ہم باغ حیرت میں | کب اپنے آشیاں سے صحن گلشن میں اترتے ہیں
نالہ و آہ و فغاں بھی مرا دم بھرتے ہیں | ولہ | آپ کا جان کے سب مجھ پہ کرم کرتے ہیں
اے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں | ولہ | تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں
کچھ تو نکلے آرزو دشنام دے تلوار کھینچ | چشم حسرت سے کہاں تک دم بہ دم دیکھا کریں
کہتے ہیں آپس میں ہمسایہ مری فریاد سے | مصلحت یہ ہے کہ اس کے پاس سے گھر چھوڑ دو
کیا کیا میں نے گناہ جو اپنے لوگوں سے یہ تم | کہتے ہو جا کر اسے بستی کے باہر چھوڑ دو

ولہ
آنے کی خبر ہے اُس کے لیکن
آتا نہیں اعتبار دل کو

ولہ
اُسکے آنے میں اب جو دیر ہے کچھ
یہ بھی قسمت کا ہیر پھیر ہے گویا

جب نہ تب خوں مرا ہی پیتا ہے
غم بہت اس کا مجھ پہ شیر ہے کچھ

تھا یہ جرأت ہی اُس کی کوچہ میں
وہ جو اک خاک کا سا ڈھیر ہے کچھ

ولہ
جاتے ہیں اُس کو دسی پہ جانا محال ہے
جس جا قدم پڑے ہے اُٹھانا محال ہے

روتے ہیں اور آتش اُلفت بھڑک اُٹھی
اب اس لگی کا دل سے بجھانا محال ہے

کیا قہر ہے کہ بزم میں اُس شوخ کی مجھے
سب کہتے ہیں کہ تجھ کو بٹھانا محال ہے

جا بیٹھتے تھے در پہ جو اُس کے وہ دن گئے
اودھر کو اب تو آنکھ اُٹھانا محال ہے

ولہ
کس کی سنوں بات میں اے مہرلیں
دھیان تو رہتا ہے تمہارا مجھے ہو ہو

ولہ
غم بہت دنیا میں ہے پر عشق کا غم اور ہے
ہے اسی عالم میں لیکن اُس کا عالم اور ہے

ولہ
گر کسی ڈھب سے کوئی مجھ کو ہنسا دیتا ہے
غم فرقت وہیں کچھ یاد دلا دیتا ہے

شب کو ٹک خواب جو آتا ہے تو ٹک اسکا خیال
آنکھ لگنے نہیں پاتی کہ جگا دیتا ہے

لخت دل کی مرے یہ اشک رواں ہیں سے بہا
برگ گل جوں کوئی دریا میں بہا دیتا ہے

گھر سے وہ جاوے جہاں میں بھی وہیں ہوں موجود
نہیں معلوم مجھے کون بتا دیتا ہے

ولہ
سخت تجھ بن قلق اس دل کا ستاتا ہے مجھے
گہ بٹھاتا ہے یہ اور گاہ اُٹھاتا ہے مجھے

ولہ
دل بھڑکے ہے ٹک مصحف رُو جان دکھادے
سرگرم ہے آتش اسے قرآں[1] دکھادے

ولہ
رہنے کی جا جہاں میں ہم خوب پا گئے
جوں درد اہل درد کے دل میں سما گئے

ہم گلشن جہاں میں جوں آتشیں انار
اک دم کی زندگی کا تماشا دکھا گئے

ولہ
جوش گل چاک قفس سے دمبدم دیکھا کئے
سب نے یاں لوٹیں بہاریں اور ہم دیکھا کئے

ولہ
شب بزم یار میں ہم بیٹھے تو تھے پر اُس کی
چتون سے تھا یہ ظاہر یہ شخص یہاں سے نکلے

[1] جب گھر میں آگ لگتی ہے تو قرآن دکھلاتے ہیں کہ اس کی برکت سے بجھ جائے ۱۲

عزیز وصل میں بھی ہم جو رو رو کر نہ سوتے تھے	وله	سو اندیشہ تھا روز ہجر کا اُس دن کو روتے تھے
کچھ ہم تو نہ سمجھے کہ شب وصل کدھر تھی	وله	ٹک زلف سے جو رُخ پہ نظر کی تو سحر تھی
ترے بن بستر اندوہ پر کچھ یاد میں کر کے	وله	پڑا روتا ہوں پھر دل بار رستہ آستیں دھر کے

۳۔ جوشش

جوشش تخلص، شیخ محمد روشن نام، وطن ان کا عظیم آباد ہے، خوش لیاقتی ان کی جو کچھ کہئے اُس سے زیادہ ہے۔ طبیعت ان کی نظمِ ریختہ میں نہایت رسا ہے، اور معنی بیگانہ سے بشدت آشنا ہے۔ چاشنی درد کی کلام سے ان کے ظاہر، اور علم عروض سے یہ بخوبی ماہر ہیں۔ شیوہ اختیار انھوں نے میر درد کا کیا ہے، اور اس طور کو بہت خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ جس ایام میں یہ تذکرہ لکھتا ہوں، تو شیخ مذکور نے اشعار اپنے مجھ کو بنارس بھجوائے، تاکہ نام اُس کا اس تذکرہ میں لکھا جائے۔ نہایت پسند آیا مجھ کو اسلوب ان کے بیان کا، چنانچہ اس طرح لکھا گیا انتخاب ان کے دیوان کا۔

کس طرح سے اوصاف ہو خلاق جہاں کا		قدرت نہ قلم کی ہے نہ مقدور زباں کا
عاشق کو ہے کب جلوۂ معشوق کی طاقت		مہتاب کو دیکھے نہیں مقدور کتاں کا
اس گلشن ہستی سے نکل راہ عدم لے		نیرنگ نظر آوے ہے کچھ رنگ یہاں کا
عنقا کی طرح گو کہ نشاں وہ نہیں رکھتا		ملتا ہے پتا نام ہی سے اسکے نشاں کا
اس دل کو دکھاتا ہوں میں بازار محبت		خطرہ نہیں جوشش مجھے کچھ سود و زیاں کا
ہم چشم کیوں کہوں میں اسے شعلہ زار کا	وله	عالم ہے کچھ جدا ہی دل داغدار کا
سر کا ہے بے خودی کا یہ مختار کار ہے		کیا اختیار ہے دل بے اختیار کا
پیتا ہے گر تو بادۂ عشرت سمجھ کے		جوشش بڑا ہے درد سر اسکے خمار کا
بزم میں یک شب بھی نہ پایا نہ دل دلگیر کا	وله	فائدہ اے شمع اشک و آہ بے تاثیر کا

ومبدم آلودہ رہنا خون سے عشاق کے		جوہر ذاتی ہے یہ جوہر تری شمشیر کا
دیکھ کر رنگ صنم تیری جفاکاری کا	ولہ	کوہکن ہو تو نہ دم مارے وفاداری کا
چشم پُر آب ہے لب خشک دماغ آشفتہ		زور عالم ہے غرض دل کی گرفتاری کا
مسکراتا ہے مجھے دیکھ رقیبوں کے حضور		یاد ہے اس کو عجب طور دل آزاری کا
بھی سیر میں گلزار کی ،تن کنج قفس میں	ولہ	یہ صید گرفتار ادھر کا نہ اُدھر کا
گر کوئی کاٹ بھی دے سر تجکو دیوانے کا	ولہ	پر یہ سودا تو کبھو سر سے نہیں جانے کا
کیوں نہ مضطر ہوں اُسے دیکھ کے دیکھو تو سہی		شمع کے سامنے کیا حال ہے پروانے کا
ہاتھ اُٹھاتا ہی نہیں یار جو سُلجھانے سے		دل تری زلف میں اُلجھا ہے مگر شانے کا
سر اُس کی تیغ سے جبتک جُدا نہ ہووے گا	ولہ	کسی طرح سے حق اس کا ادا نہ ہووے گا
کل اُن نے بیٹھ کے غیروں میں کی نگہ مجھپر		یہ تیر کس کے جگر میں لگا نہ ہووے گا
دل و جگر پہ یہی آفت نہیں فقط جوشش		جو ہے یہی ترا رونا تو کیا نہ ہووے گا
غیروں پہ تو جو ستم کرے گا	ولہ	ہم پر جو کبھی کرم کرے گا
ہم سا ہی وہ ہو گا سادگی میں		باور جو تری قسم کرے گا
جوشش مت رو دل و جگر کو		کس کا کس کا تو غم کرے گا
دیکھ کر حسن گلعذاروں کا	ولہ	خانہ ویران ہوا ہزاروں کا
دیکھیں گر اس کی چشم پُرفن کو		ہوش اُڑ جائے ہوشیاروں کا
اس کی آنکھوں کو دیکھیے جوشش		منہ تو دیکھو شراب خواروں کا
ہو چشم حباب وار دیکھا	ولہ	ہستی کو نہ پائدار دیکھا
جوں شیشۂ ساعت اس جہاں میں		دو دل کو نہ بے غبار دیکھا
ہم مر ہی گئے پہ تو نہ آیا		بس ہم نے ترا قرار دیکھا
اس ادا کا تری ہوں دیوانا	ولہ	دیکھنا مجھ کو اور چھپ جانا

آتش سے ہے جاں بلب ترا جوشش — جی میں آوے تیرے تو آجانا

ولہ

یاں معی اپنا کسے اے یار نہ دیکھا — ہے کوئی جسے تیر طلب گار نہ دیکھا
سوتوں کو جگایا ہے ترے نالے نے ہمدم — پر طالع خوابیدہ کو بیدار نہ دیکھا
کل بزم میں سب پر نگہ لطف کرے تھی — اک میری طرف تو نے ستمگار نہ دیکھا
جز چشم بتاں میکدۂ دہر میں جوشش — ہم نے تو کسی مست کو ہشیار نہ دیکھا

ولہ

کہتا ہے ایک عالم انصاف کر ہمارا — سنتا نہیں کسی کی بیداد گر ہمارا
اوروں کی عیب جوئی اپنا ہنر نہیں ہے — اپنی ہی عیب جوئی ہے یہ ہنر ہمارا
سرگشتہ مثل جل میں جوں گرد باد ہیں ہم — تھک کر جہاں کہ بیٹھے وہ ہی ہے گھر ہمارا

ولہ

اپنا تو کچھ گناہ نہ آیا ظہور میں — کیا بات ہو گئی کہ وہ بیزار ہو گیا

ولہ

جہاں میں بادۂ عشرت پیا پیا نہ پیا — سلوک بخت نے ہم سے کیا کیا نہ کیا
نگاہ لطف سے دیکھا یہی غنیمت ہے — سلام اُن نے ہمارا لیا لیا نہ لیا

ولہ

جب عشق میر اشہرۂ آفاق ہو گیا — اک عالم اُسکے حسن کا مشتاق ہو گیا
کس سے ہوئی ہے دوستی ایسی کہ ان دنوں — آنا ہمارا دل پہ ترے شاق ہو گیا

ولہ

ہوا ایک صدا کی طرح جس جاگہ گذر اپنا — پھر آواز کے کوئی نہ تھا واں ہم سفر اپنا
لگا دی دل میں آگ ہی آنسوؤں نے کیا کیا تو — جلا دینا ہے اپنے ہاتھ سے بھی کوئی گھر اپنا
شب فرقت بھی بیتابی دل ہی وہ پہلو میں — نظر آتا نہیں ہم کو تو بچتا تا سحر اپنا

ولہ

تعلقات جہاں سے خبر نہیں رکھتا — ہزار شکر کہ میں دردسر نہیں رکھتا
خفا ہوں جان سے دل کھول کر میں سعی تا ہوں — تری گلی میں کسی کا میں ڈر نہیں رکھتا

ولہ

تجھ سے ظالم کو اپنا یار کیا — ہم نے کیا جبر اختیار کیا

ولہ

اُٹھ اے طبیب جا مجھے آرام ہو چکا — مرتا ہوں کوئی دم کو مرا کام ہو چکا
اب بھی کہیں اُٹھا دیگا چہرے سے زلف کو — معمور تو شکار سے یہ دام ہو چکا

لینا تھا اُس کو دل سو لیا اُن نے نامہ بر
اب میکر اُسکے نامہ و پیغام ہو چکا

ولہ
تنہا یہ عشق میں نہ دلِ ناتواں جلا
مانندِ نخل شمع ہر اک استخواں جلا
نہ دل رہا نہ چشم رہی نہ جگر رہا
اے اشک تیرے ہاتھ سے کیا کیا مکاں جلا

ولہ
وہ کیا ہوا زمانہ رونے میں جو اثر تھا
یہ چشم خوں فشاں تھی یہ دل ہی جگر تھا

ولہ
غش آگیا وہ سامنے میرے جہاں ہوا
مجھ کو وصال یار میسر کہاں ہوا

ولہ
بے طاقت اس قدر یہ دل ناتواں ہوا
حرفِ تواں بھی اُس کی زباں پر گراں ہوا
سر پر کھڑا ہے کھینچے ہوئے تیغ کہکشاں
جلاد میری جان کا یہ آسماں ہوا

ولہ
ہزار پیار کرے گا ہزار چاہے گا
مری طرح نہ کوئی تجھ کو یار چاہے گا

ولہ
کوئی اس غم کدہ میں اپنی غمخواری نہیں کرتا
دیا ہے ایک کو دل وہ بھی دلداری نہیں کرتا

ولہ
جو ترے سامنے آئے ہیں سو کم ٹھہرے ہیں
یہ ہمارا ہی کلیجا ہے کہ ہم ٹھہرے ہیں

ولہ
ایک عالم کی جاں خراش ہو یہ
آہ ہے یا قلم تراش ہے یہ
رو دیئے تا ہو سبز کشت اُمید
اب تردد ہے یہ تلاش ہے یہ
دیدۂ تر کو دوست رکھ جوشش
بہت تحفہ گلاب پاش ہے یہ

ولہ
اپنی وہ بے ثبات ہستی ہے
کہ سدا نیستی کو ہستی ہے
نام سُنتے ہو جس کا ویرانہ
وہی سودائیوں کی بستی ہے

ولہ
جی میں جس وقت کہ مضمون کمر آتا ہے
بسکہ نازک ہے مجھے باندھتے ڈر آتا ہے
چشم تر آہ بہ لب خستہ جگر ہوں جوشش
بے طرح حال مرا مجھ کو نظر آتا ہے

ولہ
شبنم کی طرح سامنے اُس آفتاب کے
ہونے کو تو ہوئے تھے ولیکن نہ ہو سکے

رباعی
کچھ کام نہیں ہمیں وفا سے
تو ہاتھ نہ کھینچیو جفا سے
کل سب سے گلے گلے ملے تم
تھے ہم بھی تو صورت آشنا سے

ولہ
چشم سے غافل نہ ہوا چاہئے
اس کے مقابل نہ ہوا چاہئے

دل کا ضرر جان کا نقصان ہے		اب کہیں مائل نہ ہوا چاہیئے
فرہاد بے فائدہ خارا شکنی ہے	ولہ	گھر کیجیے کس دل میں یہی کوہ کنی ہے
نہ کوئی دوست ہے نہ کوئی مرادشمن ہے	ولہ	ایک یہ دل ہے غرض دوست ہے یا دشمن ہے
ایک دن کا ماجرا ہے میں اُٹھا تھا سیر کو	قطعہ	دیکھتا کیا ہوں یہ جھگڑا ہے سر بازار ہے
برہمن کہتا ہے بت خانے میں ہے ذات خدا		شیخ کہتا ہے غلط کعبہ ہی میں دیا ہے
اس میں جوشش بول اُٹھا سنتے ہو شیخ و برہمن		جانے دو اپنی طرف دیکھو یہ کیا تکرار ہے
ممکن نہیں کہ دیکھیے روئے شگفتگی	ولہ	جبتک برنگ غنچہ گریباں نہ پھاڑیئے
جاہ و حشم کی خواہش دولت کی آرزو ہے	ولہ	دو دن کی زندگانی تس پر یہ جستجو ہے
صورت پرست ہوں میں مانند آئینہ کے		جو کچھ ہے میرے دل میں سو میرے روبرو ہے
کہتا ہوں درد دل تو وہ کہتا ہے کیا مجھے	ولہ	چپ رہیے بس زیادہ نہ باتیں بنائیے
لاکھوں ہی کیے قتل گنہگار مجھی سے	ولہ	رہتی ہے بُری اک تری تلوار مجھی سے
کوئی سوائے شانہ وہاں چھوٹتا نہیں	ولہ	دیکھو تو کوئے زلف میں کیا بند و بست ہے
کشورِ عشق میں رسوا سر بازار ہوئے	ولہ	اُس کے ہاتھ آپ بکے جس کے خریدار ہوئے
میں آ نہ سکوں اور صبا جا کے رہی ہے	ولہ	کوچہ میں ترے یار عجب باد وہی ہے
جی چاہے تو ملئے جو نہ چاہے نہ ملئے	ولہ	دل میں تو ہمارے نہ یہی ہے نہ وہی ہے
جوشش تو یہاں تک ہوا رسوائے خلائق		جو دیکھے ہے کہتا ہے یہ دیوانہ وہی ہے
دل میں بھری ہے آگ اور آنکھوں میں آب ہے	ولہ	مانند شمع حال ہمارا خراب ہے
دیکھا ہے جب سے زلف کو شانے کے ہاتھ میں		جوشش ہمارے دل کو عجب پیچ و تاب ہے
اے عشق مجھے خوار کیا کیا کیا تو نے	ولہ	رسوا سر بازار کیا کیا کیا تو نے
جس طرح دل کا داغ جلتا ہے	ولہ	اُس طرح کب چراغ جلتا ہے
اُس رخ صاف کے آگے جو کبھی آتا ہے	ولہ	آئینہ اپنا ہی مُنہ دیکھنے لگ جاتا ہے

ہوے صحرا نشیں تشریف لاوے جس کا جی چاہے	ولہ	در و دربان نہیں رکھتے ہیں آوے جس کا جی چاہے
گرہ میں غنچوں نے نافے کے نافے باندھ لئے	ولہ	چمن میں کھل جو گئی زلف مشک بو تیری
مرنا تو بہتر ہے جو مر جایئے	ولہ	جی سے کسی کے نہ اُتر جایئے
سوئے حرم یا طرف بت کدہ		الغرض اے شیخ جدھر جایئے
نت نئے عذر ہیں نہ آنے کے	ولہ	ہم دیوانے ہیں اس بہانے کے
قطرے سب آنسو کے ہیں اک لخت شر سے	ولہ	کیا آگ برستی ہے مرے دیدۂ تر سے
آشنا جب سے ہوئے اُس بُتِ ہرجائی سے	ولہ	دربدر خاک بسر پھرتے ہیں سودائی سے
گر جان دے کوئی پر نہ اس کے ہونگے	رباعی	جی شوق سے لیں گے اس کا جس کے ہونگے
جوشش نہ رکھ ان بتوں سے ہرگز اُمید		یہ کس کے ہوئے ہیں اور کس کے ہونگے

بابُ الحاء

۱- حاتم

حاتم تخلص، شاہ جہان آبادی مشہور ریختہ گویوں میں سے دلّی کے تھا ہم عصر شاہ نجم الدین آبرو اور میر یقین سودا کا استاد خوش بیان تھا صاحب دو دیوان تھا، ایک دیوان میں نہایت پیچ ایہام کیا ہے اور دوسرا بطور متاخرین کے سرانجام کیا ہے۔ جامع ہے طور متاخرین اور طرز ایہام کا۔

گلشن اُس گل بن مری نظروں میں ویراں ہو گیا		جھاڑ جھاڑ اور بوٹا بوٹا دشمنِ جاں ہو گیا
ایک نے پائی نہ اب تک نبض کی رفتار حیف		اور میرا تختۂ مشق طبیباں ہو گیا
اشک خوں آلودہ میرے اس قدر جاری ہیں آج		جا بجا لعلوں سے ہندستاں بدخشاں ہو گیا
شور دریا تک ملاحت کا تری پہنچا ہے شور		بے نمک آگے ترے لب کے نمک داں ہو گیا
فیض صحبت کا تری حاتم عیاں ہے ہند میں		طفل مکتب تھا سو عالم بیچ تاباں ہو گیا
سجن نے یاد کر نامہ لکھا او ہم ہے غافل	ولہ	بجا ہے معذرت لکھنا ہمیں کاغذ خطائی پر

ہجر میں زندگی سے مرگ بھلی	ولہ	کہ کہیں سب جہاں مثال ہوا
مثالِ گُہر موجیں مارتا ہے	ولہ	لیا ہے میں نے اس جگ سو کنّا
بالے پن سیں مجھے سودا ہے ترے گیسو کا	ولہ	بال باندھا ہیاں بندا ہوں تمہ کیسا کا
مجھے درکار نہیں مشک و عبیر و صندل	ولہ	ہوں دیوانہ میں پری رو کے چونکے لوکا
زور چپت ہے مرے دل کا کبوتر حاتم (بہت بے عمل)		پھرت کرتا ہے جب اُڑتا ہے اُسی کے کوکا (خیال)
ہر اک سخن ہوا ہے ہمارا مثالِ قند	ولہ	شیریں لبوں سے جب ستی بوسے لئے ہیں ہم
ترے رُخسار و قد نے دھوم ڈالا ہے گلستاں میں	ولہ	اُدھر بلبل سسکتی ہے اِدھر قمری بلکتی ہے
دو چار اب تجھ سے کیونکر ہوئے ہم چشمی کے دعوے سے	ولہ	کہ نرگس کی چمن میں دیکھ کر گردن ڈھلکتی ہے
پری ہم جان کر اُس کو چھپائے شیشہ خالی میں		یہ تو بھی دخترِ رز پردۂ مینا سے تکتی ہے
جب سے تمہاری آنکھیں عالم کو بھائیاں ہیں	ولہ	تب سے جہاں میں تم نے دھومیں مچائیاں ہیں
زلفوں کا بل بتانا آنکھیں چُرا کے چلنا		کیا کج ادائیاں ہیں کیا کم نگاہیاں ہیں
حاتم کے بن اشارے سچ کہہ یہ چشم و ابرو		کس سے لڑائیاں ہیں کس پر چڑھائیاں ہیں
تمہارے غنچہ لب کے شوق میں گلشن کی سب کلیاں	ولہ	چمن میں سُن خبر آنے کی استقبال کو چلیاں
لگن میں تجھ ستمگر کے عجب مجلس میں غم گذرا		شمعٔ رو رو کے ساری رات سرتاپا کھڑی جلیاں

۲ - حزیں

حزیں تخلص، میر باقر نام، متوطن شاہجہان آباد۔ شاگردوں میں میرزا جان جاناں مظہر کے تھے۔ دلّی سے جب جدائی انہوں نے لاچار کی، تو عظیم آباد میں بود و باش اختیار کی۔ رفیق تھے نواب بافرہنگ سید احمد خاں صولت جنگ کے، زندگی بسر کی ہے انہوں نے ساتھ رعایت ناموس و ننگ کے۔ بہت فہمیدہ اور آشنائے درست، دوستیوں میں نہایت چالاک و چست۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، خلاصہ اشعار ان کے دیوان کے لکھے گئے یہاں ہیں۔

غم نے آباد کیا خانۂ ویراں میرا ۔۔۔ ابر مژگاں سے ہوا سبز بیاباں میرا

ولہ
یہ کہہ کے باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت! ۔۔۔ لکھا تھا یوں کہ فصلِ گل میں چھوڑیں آشیاں اپنا

ولہ
گوارا ہو گیا دل پر ہمارے جورِ یار آخر ۔۔۔ ہمیں رنج و الم سے ہو گئے صحبت بہار آخر

ولہ
غم نے لیا ہے گھیر مجھے یاں تلک کہ اب ۔۔۔ دیتا ہے ساتھ دینے سے مجھ کو جواب دل

ولہ
فصلِ گل آخر ہوئی، کیا دیکھ ہوں گے شاد ہم ۔۔۔ کچھ کرلے صیاد، اب ہوں گے نہیں آزاد ہم
رحم آتا ہے مجھے اس مشتِ خاک اپنی پہ ہائے! ۔۔۔ خوبرویوں کی ہوائیں ہو چکے برباد ہم

ولہ
اس بے وفا کے ہاتھ سے کچھ مجھ کو حظ نہیں ۔۔۔ پاؤں تلک بھی ہائے مجھے دست رس نہیں
ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ اب ۔۔۔ چاہیں کہ جل مریں، تو کہیں خار و خس نہیں

ولہ
کچھ کہا شاید اُن نے قاصد سے ۔۔۔ دل پہ کچھ کر وہ اضطراب نہیں

ولہ
آوے نہ کیونکہ رشک مجھے برگِ پان سے ۔۔۔ لیتا ہے کیا مزہ وہ سجن کے لبان سے

ولہ
نہ وصل میں اُسے راحت، نہ ہجر میں آرام، ۔۔۔ کسی طرح سے حزیں دل کے تئیں قرار نہیں

ولہ
تو نہ ڈر ٹک اٹھا نقاب کے تئیں ۔۔۔ میں سمجھاؤں[1] گا اضطراب کے تئیں

ولہ
کیونکہ خاطر خواہ دل کے درد کی تقریر ہو ۔۔۔ کب یہ معنی لفظ میں آتے ہیں، کیا تحریر ہو

ولہ
کچھ گئی ہجر میں، کچھ وصل میں گریاں گذری ۔۔۔ کیا مری عمر کی اوقات پریشاں گذری

ولہ
خوباں کے درد و غم نے کیا ناتواں مجھے ۔۔۔ یاں تک کہ مو بھی تن پہ ہوئے ہیں گراں مجھے
کیوں کر کروں جفا کی شکایت میں اُس ستی ۔۔۔ کرتا ہے وہ وفا میں کبھو امتحاں مجھے

ولہ
وفا میری اگر جور و جفا تجھ کو نہ سکھلاتی ۔۔۔ تو کیا آرام سے یہ زندگانی ہائے کٹ جاتی

ولہ
حزیں میں درد دل کا کس طرح ظاہر کروں اُس سے ۔۔۔ مجھے کہتا ہے "تیری بات مجھ کو خوش نہیں آتی"

ولہ
مجھے کہتا ہے "تیرا دل کہاں ہے" ۔۔۔ قیامت شوخ ہے، برا بدگماں ہے

[1] یہ مقام تقطیع میں نہیں آسکتا۔ غالباً "سنبھالوں" ہوگا۔

۳- حسرت

حسرت تخلص، میرزا جعفر علی نام، متوطن شاہ جہان آباد کے، بیٹا میرزا ابو الخیر کا تھا۔ صاحب قصاید و دیوان ہے، اور سر حلقہ سوزونان خوش بیان ہے۔ اکثر تو مشق لکھنؤ کی مع جرأت دم شاگردی کا مارتے ہیں، اور یا اُستاد کہہ کے پکارتے ہیں۔ نخاس کے اندر دُکان عطاری کی یہ عزیز رکھتا تھا، اور اوقات اسی وجہ حلال سے بسر کرتا تھا۔ سنہ ۱۲۱۱ بارہ سو دس ہجری میں تختہ بند کرکے دُکان وجود کو سیر بازار عدم کی ہے، خدا بخشے اس عاقبت محمود کو۔

اتنا سودا یہ دل زار ہوا، کچھ نہ ہوا
کاشکے عشق جتاتا نہیں اس کو حسرت

کچھ بھی یہ عشق سے بیزار ہوا، کچھ نہ ہوا
میری صورت سے وہ بیزار ہوا، کچھ نہ ہوا

بجا مجھ کو مریض عشق سے ملتے حذر آیا
کہ آئینے میں شکل اپنی جو دیکھی مجھ کو ڈر آیا

ولہ

رقیبوں کے حوالے کرکے خط کو نامہ بر آیا
عزیزو کیا کہوں قاصد تو میرا کام کر آیا!

ولہ

نہیں غنچوں پہ شبنم، اس دہن کے وصف نے اُسکو
یہ لذت دی کہ پانی منہ میں ہر غنچہ کے بھر آیا

اسی جہان میں رکھتے ہیں ہم جہان جُدا
حباب وار ہے اپنا بھی آسمان جُدا

ولہ

تری فرقت میں ہے شام و سحر مجھ کو عجب مشکل
جو شب کاٹی تو دن مشکل، جو دن کاٹا تو شب مشکل

ولہ

کرم سے کون جو عقدے پڑے ہیں کام میں میرے
ترے آگے ہیں سب آساں مگر آگے ہیں سب مشکل

ہوئے ہم بُت کے بندے، برہمن ہمراہ کرتے ہیں
حرم کے رہنے والو اتم ہی عشق اللہ کرتے ہیں

ولہ

جلے جوں شمع، اب نزدیک ہے خاموش ہو جاویں
یہ افسانہ سنا کر قصہ ہم کوتاہ کرتے ہیں

تصور نے ترے ظالم یہاں تک تفرقہ ڈالا
کہ ملنا ہو گیا دشوار اب خرگاں سے مژگاں کے

ولہ

برنگ آبلہ اے وائے یہ کیا زندگانی ہے
کہ جس کے پاؤں پڑتے ہیں اسی کو سرگرانی ہے

ولہ

ولہ

سلہ اصل مسودہ میں اسی طرح املا لکھا ہے۔

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کروگے	ولہ	لو دل تمہیں ہم دیتے ہیں کیا یاد کروگے
تاراج کیا صبر و دل و جاں پھر اب آگے		کیا خاک بھی ہے جسے برباد کروگے
ترے بن کس طرح پیارے مری اوقات گذریگی	ولہ	ابھی سے دل کو بیتابی ہے، کیونکر رات گذریگی
کیا راہ میں غیروں سے ملاقات لگائی	ولہ	جو صبح سے یاں آنے تلک رات لگائی
اٹھا جو زمانہ ہے تو اس صید نے دل کے		صیاد کے ملنے کے لئے گھات لگائی
اس زلف میں جا وفات پائی	ولہ	اس دل نے عجب ہی رات پائی
ہمارے کام پہ ہر چند آسمان پھر کر	ولہ	تجھے قسم ہے! جو تو اس طرف کو آن پھرے
چلا تھا لشکرِ غم چڑھ کے گھر پہ مجنوں کے		مجھے جو دیکھا تو وہیں ادھر نشان پھرے
دل دردِ بتاں سے آہ کیونکر نہ کرے	رباعی	پر آہ تو تب کرے جو اس سے نہ ڈرے
وہ شکل ہے جیسی دشمنوں میں گھایل		دم لیوے تو سر کٹے، نہ دم لے تو مرے

۴ حیرانؔ

حیران تخلص، میر حیدر علی نام، ساکن شاہ جہان آباد کے۔ شاگرد راے سرب سنگھ دیوانہ تخلص استاد کے[1]۔ علمِ شعر سے تو بخوبی آگاہ نہیں ہیں، لیکن اشعار ان کے سب دلچسپ اور شیریں ہیں۔ بندش شعر کی ان کے اُستادانہ ہے، استاد جانتا ان کو ایک زمانہ ہے۔ نواب امیر الدولہ حیدر بیگ خاں مرحوم کی امارت میں، اگرچہ نوکر وزیر الممالک نواب آصف الدولہ مغفور کے تھے، لیکن سائے میکو جل سے کہ مالک واصلباتی کا تھا، توسل رکھتے تھے۔ بعد اُن مذکور کے مرنے کے ایک آدھ برس تو تنخواہ کی طرف سے اذیت اُٹھائی، پھر تو ایک مرتبہ نواب آصف الدولہ مرحوم سے کچھ ایسی موافقت آئی کہ پچاس کے سو روپے اضافہ کیا، اور سو سوار کا رسالہ۔ بالفعل

---

[1] یہ معو جرات کی طرف بھی منسوب ہے۔ [2] اس فقرہ میں قافیہ کی پابندی سے سخت تعقید پیدا ہو گئی ہے مطلب یہ ہے کہ سرب سنگھ جن کا تخلص دیوانہ ہے، اور جو اُستاد فن ہیں، حیران ان کے شاگرد ہیں۔

کہ ۱۲۱۵ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، مع رسالہ تنخواہ لکھنؤ میں لیتے ہیں، اور داد عیش کی دیتے ہیں۔ یہ اشعار اس ستودہ اطوار کے ہیں +

کہاں وضع ہے، اور ہیں یہی ہیہات نصیب!
تو ہمیں ہو چکی بس اس سے ملاقات نصیب!

ہم لب گور ہوئے خوں ہو جگر اس غم سے
کرنی اس غنچہ دہن سے نہ ہوئی بات نصیب!

صبح ہر روز اسی غم میں ہمیں ہوتی ہے شام
آ جاگینگے مرے کون سی اب رات نصیب!

کچھ ہمیں شکوہ نہیں جو سے تیرے ہرگز
ہم ہمیشہ سے ہیں آجان کچھ اوقات نصیب!

مسجدوں میں پھرے نت سبحہ پھرلتے حیراں
شیخ جی پر نہ ہوئی تم کو کرامات نصیب!

ولہ

ہوا نہ ہم کو کبھی سیر باغ و گشت نصیب
کریں گے زیست کا کیا یاد ہم سے زشت نصیب

دلِ ستم زدہ کا آج پوچھتے ہو حال
غمِ فراق سے کب کا ہوا بہشت نصیب

ولہ

اپنے جانے کا وہاں دن کہو نہ رات کو ڈھب
دیکھئے کیسے بنے آن پڑی بات کڈھب

دردِ دل غیر کے ہونے سے نہ کہنے پایا
کل میسر ہوئی حیران کو ملاقات کڈھب

ولہ

دکھ اس سے کون سکے، تاب التماس کہاں
کسے ہے ہوش بجا، دل کدھر، حواس کہاں!

ہوا ہے اب تو نئے دوستوں سے ربط نئے
تمہیں اب آنے کی فرصت ہمارے پاس کہاں

ولہ

کلیجا بھن گیا۔ کب تک کروگے ملے بیدادی
اٹھوں میں ہی جہاں سے، تاکہ یہ اٹھ جائے بیدادی

ولہ

کل کہا میں نے میرے گھر چلئے
اس میں کچھ کم نہ ہوگی محبوبی

سن کے تیوری بدل لگا کہنے
"رسم و راہِ ادب تو سب ڈوبی

مجھ کو کہتا ہے میرے گھر چلئے
دیکھیو اختلاط کی خوبی"

۵۔ حسرت

حسرت تخلص، ہیبت قلی خاں لقب، ساکن عظیم آباد کے شاگرد میرزا جان جاناں مظہر کے تھے۔ چندروز انہوں نے رفاقت نواب شوکت جنگ کی، کہ خلف نواب صولت جنگ

ناظم پرگنہ کے تھے، کی ہے۔ اور کچھ دنوں ان کو خدمت عرض و معروض کی نواب سراج الدولہ ناظم بنگالہ کے حضور میں رہی ہے۔ سنہ ۱۱۹۶ گیارہ سو چھیانوے ہجری کے اندر نواب مبارک الدولہ میر مبارک علی خاں بہادر صوبہ بنگ کی رفاقت میں نہایت غربت اور پریشانی کے ساتھ اوقات بسر کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۱۰ بارہ سو دس ہجری میں اس سرائے فانی سے سفر کر گئے۔ بڑے ہی لطیفہ گو اور حاضر جواب تھے، بذلہ گوئی اور علم مجلس میں انتخاب تھے۔ قریب دو ہزار بیت کے دیوان اس عالی دودمان کا ہے۔ یہ انتخاب ان کے دیوان کا ہے ◆

رات کا سچ ہوا یہ خواب مر
ل گیا صبح آفتاب مرا
تیرے کوچہ سے باز نہیں[1] آتا
یہ دلِ خانماں خراب مرا

ولہ
نہ جانوں کرے کیا حنا کا لگانا
لہو پانی کرتا ہے یہ پان کھانا

ولہ
عجب طرح کا عشق حسرت نے ٹھانا
کبھی اُس کے کوچہ نہ آنا نہ جانا

ولہ
بسکہ دُکھ دیتا ہے میرے دل کو وہ بدخو مرا
کل نہیں پاتا ہے مارے درد کے پہلو مرا

ولہ
دل ہوا غم میں آب کی سی طرح
پر جلے ہم شراب کی سی طرح
ہاتھ میں جام لے ملا مجھ سے
صبح کو آفتاب کی سی طرح

ولہ
چھپاؤں اشکِ گلگوں کس طرح ہائے !
گریباں ہو رہا ہے جا بجا سرخ

ولہ
اشک پر اشک چلا متصل آوے باہر
یہاں تلک روئے آنکھوں سے دل آوے باہر

ولہ
بعد مرنے کے ہماری خاک کو برباد کر
دے بگولے کو کہ لے مجنوں کا گھر آباد کر

ولہ
ترے جمالِ جہاں گیر سے بنے کیوں کر
میں ایک تیرا دیوانہ، ترا ہزار میں دل

ولہ
زلف و رخ یار دیکھتا ہوں
کیا لیل و نہار دیکھتا ہوں
پھر یار سے ان دنوں میں بارے
صحبت کو برآر دیکھتا ہوں

[1] اس لفظ کو خود ملک کے لہجے کے موافق بہ وزن نہ پڑھنا چاہئے ورنہ مصرع ناموزوں ہو گا ۱۲

آپ ہی اپنے یار تھے، جا تا نہیں	وله	غیر میں ہو رہے تھے پہچانا نہیں
ہم نہ ہوں، تو ہو، تو شب جا کریں	وله	شمع ہے محفل میں پروانہ نہیں
کعبہ بھی ہم گئے، نہ گیا ان بتوں کا عشق	وله	اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں
مر گئے انتظار کے ہاتھوں	وله	کیا کہیں! اپنے یار کے ہاتھوں
پھر مسیحا دی کرے تو اُٹھیں		سو کہاں روزگار کے ہاتھوں
فرہاد سے ہمسری کرے کون	رباعی	سر کس کا پھرا ہے یوں مری کون
چل کشمکش جہاں سے حسرت		ہوتا رہے نت در سے پرے کون
سدا بارش ہی میں رہتی ہیں میری چشم تر ساون	وله	تو ایک دو دن برس کر ہم سے آ سکتا ہے بھادون
اُڑا دے اے دوانے اشورش سودا سے سب ڈر کو	وله	بہار آئی، تو کیدھر دیکھتا ہے، پھونک دے گھر کو
مجھے افراط رقت میں بجا نہیں بات کر آئی	وله	کہ کر سکتا نہیں ڈوبا ہوا تقریر پانی میں
سُنا ہے آج میخانہ میں جام مے پرستوں نے	وله	لٹا یا دین و دنیا دونوں ہمت اس کو کہتے ہیں
ہم دوانوں کے نہیں عشق میں گھر جلتے ہیں	وله	اس محبت میں پرندوں کے بھی پر جلتے ہیں
دیکھ اس لب کو ترے، آگ ہیں لعل دیا قوت		تیرے ان دانتوں کی جھلکی سے گہر جلتے ہیں
ان پتنگوں کی ہیں جرأت پہ سوا جاتا ہوں		سب کلیجے ہیں یہ کمبخت، قمر جلتے ہیں
تو جو لگرمیاں کرتا ہے گا مجھ سے ہر دم		دیکھنے والوں کے حسرت سے جگر جلتے ہیں
نہ جی لگا یئو اُس سے جو دردمند نہ ہو	وله	کسی کا دل کسی ظالم کے پاے بند نہ ہو
گو دل بروں کے ماہ سے رخ پہ نقاب ہو	وله	پوشیدہ ہو سکے ہے جو کوئی آفتاب ہو
لب بام آ کے یہ تیرا اکھڑے رہنا تو آفت ہے	وله	سوا نیزے پہ گویا آفتاب آیا، قیامت ہے
داغ دل ہیں تازگی پہ ہوئے	وله	اب شگوفہ بہار کرتا ہے
سر تا جز ورم سے عجز کے مقابل ہے	وله	اُدھر بہار، ادھر ایک شیشۂ دل ہے
پلا شراب، ہوائے شرب آتی ہے	وله	گھٹا بھی اپنا جھگڑا اکھڑی دکھاتی ہے

لے اُڑا کام اپنا پروانہ	ولہ	ہائے ہم بال و پر نہ رکھتے تھے
جیسے بھٹکے پھرا کئے حسرت		یار کے دل میں گھر نہ رکھتے تھے
قفس ہی میں ہمیں رہنے دے صیاد	ولہ	کہاں اب اُڑ سکیں جب بال و پر گئے
تجھے کچھ بھی ہے حسرت فکر دل کی		کہاں کھویا اُسے تو ہائے گھر گئے!
ناصح عبث ستا مت، ہیں مبتلا کسو کے	ولہ	کچھ دل ہی گیا پھرے ہے، پھیرے سے کیا کسو کے
یہ گل ہزار اپنے جامے میں پھول بیٹھے		ویسے کھلے نہ دیکھے بندِ قبا کسو کے
جدائی کی ہوا دہکا گئی اب آگ سینے کی	ولہ	لگے اُڑنے بھبھکے آہ کے، کیا طرح جینے کی
تا شاد کام میرے حال جیسے نہ گیا	رباعی	جی تک میں دیا، ملال جی سے نہ گیا
یہ لوح مزار پر ہماری لکھنا		ہم گئے، پہ ترا خیال جی سے نہ گیا
زاہد جو نہیں ہے میرے دل سے آگاہ	رباعی	کہتا ہے کہ کافر ہے تو اے روئے سیاہ
ہوں جس کی پرستش میں کہوں کیا یا رب		آتا ہے وہ بت، دیکھو اللہ! اللہ!
کب شہر کو چھوڑے، جو سیانا ہو گا	رباعی	صحرا دیکھے گا، جو دوانا ہو گا
ہم دونوں میں سیر کر کے دیکھا حسرت		رہنا تو وہاں، جہاں کہ جانا ہو گا
میخانہ میں کیا پھرے ہے مٹکی مٹکی	رباعی	زاہد واعظ سے دور، بھٹکی بھٹکی
قاضی سے ڈرے نہ محتسب سے ہرگز		یہ دختر رز ہے جس سے اٹکی اٹکی

۶- حسن

حسن تخلص، خواجہ حسن نام، متوطن شاہجہان آباد کے، بیٹے خواجہ ابراہیم بن غیاث الدین بن محمد شریف بن ابراہیم کے ہیں۔ جو کہ مشہور خواجہ کمہار کر کے تھے۔ چشتی اور ساکن پہاڑ گنج ہیں۔ بڑے ہی لطیفہ گو اور بذلہ سنج ہیں۔ علم موسیقی ہندی سے بخوبی ماہر، اور استعداد اس علم کی ان کی تصانیف سے ظاہر۔ علم نجوم میں بھی دخل بھلا چنگا رکھتے ہیں۔ اور فقر و درویشی میں

تو آدھا لکھنؤ معتقد اپنا رکھتے ہیں۔ علومِ متداولہ سے بھی خوب آگاہ ہیں، خصوص علمِ تصوف کے بادشاہ ہیں۔ توسل بصورتِ دنیا ہیں ان کو نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خان سے ہے، اور یہیں ملاقات تو ایک جان سے ہے، بخشی نام ایک رنڈی اربابِ نشاط سے ہے، اُس پر مرتے ہیں، علاوہ اکثر نام اُس کا مقطع میں غزل کے داخل کرتے ہیں۔ زبانِ ریختہ میں صاحبِ دیوان ہیں۔ کچھ اشعار منتخب ان کے لکھے گئے یہاں ہیں ۔

حالِ دل اپنا میں ہر ایک سے کہوا دیکھا — وہاں کسی ڈھب سے پہ ہوتے نہ پذیرا دیکھا
وقتِ نظارہ نہ رو، کہتے تھے اے چشم تجھے — شدتِ گریہ سے، لے خاک نہ سوجھا، دیکھا
گھورتے ہو مجھے کیا قہر کی آنکھوں سے تم — ایک عالم نے آپ کو گھورا دیکھا
دیکھنے سے مرے کا ہے کو غضب ہوتے تھے — کیا غضب ہو گیا گر میں نے بھی دیکھا دیکھا

ولہ

تب اس حیلہ گر کو نہ کچھ کام ہوگا — کہ جب میرا یہاں کام اتمام ہوگا
یہی شورشِ عشق ہے تو الٰہی! — اس آغاز کا کیوں کہ انجام ہوگا
رہی بے قراری اسیروں کی یونہیں — تو صیاد! ٹکڑے ترا دام ہوگا
موئے ہم تو، پر بیقراری وہی ہے — خدا جانے کب دل کو آرام ہوگا
اگر نزع سے جان بخشی حسن کو — تو اس میں تمہارا بڑا نام ہوگا

ولہ

جو بندہ خانے میں آ بیٹھے گا، فقیر تم کو دعا کریگا — کسی کے دل کو جو خوش کروگے خدا تمہارا بھلا کریگا

ولہ

عالم اُس حور کی جو جلوہ گری کا دیکھا — پھر یہ جلوہ نہ کسی حور و پری کا دیکھا

ولہ

پہنچے وہاں کچھ جب تئیں پیغام ہمارا — یہاں تب تئیں آخر ہی ہوا کام ہمارا

ولہ

حال دلاسوں سے کرے ہے آہ و زاری بیشتر — خانۂ ماتم میں ہو پڑے سے زاری بیشتر

ولہ

بھلا میں دوانہ سہی، پر یہ ناصح — مرے ساتھ بکتا ہے، عاقل کو دیکھو
یہاں تھک کے بیٹھے ہو کیا راہ میں تم — چلو راہ رو، اپنی منزل کو دیکھو

ولہ

نمک جلا دے ہمیں گویا ہوتا — اسے لبِ یار سیکھا ہنستا

میں تو سب طرح سے تیرا ہوں میاں
پر جو تو بھی کہیں میرا ہوتا

مانوں تب وعدۂ فردا اے یار
جب ترے وعدے کو فردا ہوتا

اے مرے اشک سر مژگاں پر
قطرہ کیا ہو وے سے دریا ہوتا

تو جو ڈھونڈھے ہے حسن خلوت کو
مین خلوت میں اکیلا ہوتا

سر گریباں میں جھکا دل میں بیٹھ
موند لے آنکھ کو تنہا ہوتا

ولہ

چلنے سے کب اشک ہارتا ہے
دریا ہے کہ جوش مارتا ہے

ولہ

آکر بلا سے قتل ہی کر جایئے مجھے
صورت اسی بہانہ سے دکھلایئے مجھے

ولہ

غم نے ایذا جو اسے صنم بخشی
یہ بھی سرکار کی کرم بخشی

ولہ

حقیقت کہیں کیا ہم اس انجمن کی
نہ تھی واں خبر اپنے ہی تن بدن کی

اگر جاں کنی میں وہ جاں بخش آوے
تو ہو نزع سے جان بخشی حسن کی

ولہ

یہ تو نے مجھ سے نالۂ شبگیر کچھ نہ کی
یہاں دل جلایا، اور وہاں تاثیر کچھ نہ کی

کیوں تم خفا ہو، کب میں کسی بات پر میاں
موجب تمہارے قول کے تقریر کچھ نہ کی

کچھ اور تو ہوا نہیں ہر ساری عمر میں
تقصیر یہ ہوئی، کہ میں تقصیر کچھ نہ کی

مرتا ہی جاں کنی میں حسن حیف! اس نے رات
اب اس کی جان بخشی کی تدبیر کچھ نہ کی

ولہ

ٹک بہانا یہ رونے پہ اگر دھیان لگاوے
ساون کی جھڑی دیدۂ گریان لگاوے

شمشیر نگہ تیز ہے آگے ہی، جو چاہے
اور سنگ سی سرمے کے ذراسان لگاوے

دن رات مری تجھ سے دعا ہے یہی یارب!
اُس بت کا مجھے آٹھ پہر دھیان لگاوے

ولہ

کب میں کہتا ہوں کہ میری جان جانے سے بچے
پر ٹک ایسا ہو کہ یہ دل تلملانے سے رہے

ہم نے ایسی بھی تو کچھ چوری نہ کی تھی آپ کی
بے سبب اب آپ جو ایدھر کے آنے سے رہے

آہ کس کس بے وفائی کا میاں کیجے شمار
اور تو سب یکطرف، منہ بھی دکھانے سے رہے

اُس سے کس کس طرح ٹالا ہم کو اپنے در سے پر
دیکھ تو ہم بھی حسن کس کس بہانے سے رہے

۷۔ حسن

حسن تخلص، میر غلام حسن نام۔ شاہ جہان آبادی۔ بیٹا میر غلام حسین ضاحک تخلص کا، اولاد میر امامی ہروی کے۔ دلی کے پرانے شہر میں بود و باش رکھتے تھے۔ صغر سن سے وارد لکھنؤ میں ہوئے نواب سالار جنگ اور خلف اُن کے میر نوازش علی خاں سردار جنگ کی رفاقت میں اوقات انہوں نے ساتھ عزت اور غربت کے بسر کی ہے، اور اصلاح سخن کی میر ضیاء الدین ضیا تخلص سے لی ہے اقسام علم سے تو جمیع علوم میں انہیں اقرار ہیچمدانی ہے، ہاں مگر اشعار میں ان کے البتہ ایک صفائی اور روانی ہے، قریب آٹھ ہزار بیت کے انواع نظم میں دیوان ان کا ہے، اور ایک تذکرہ بھی ہندی گویوں کا زبان ریختہ میں لکھا ہے۔ بے نظیر اور بدر منیر کے احوال میں کیا خوب مثنوی لکھی ہے، اور سنہ ۱۲۰۱ بارہ سو ایک ہجری میں سیر روضۂ رضوان کی کی ہے۔ یہ اشعار منتخب دیوان ان کے گوش گزار کرتے ہیں +

گر کیجیے رقم کچھ تری وحدت کے بیاں کا		تو چاہیے خامہ بھی اُسے ایک زباں کا
چھوٹا نہ وہاں تغافل اس اپنے مہرباں کا	ولہ	اور کام کر چکا یہاں یہ اضطراب جاں کا
نہ ہنسی تھیں آہیں، نہ تھمتے تھے آنسو	ولہ	حسن تجھ کو کیا رات غم تھا کسی کا
ایسی ہی آہ! باتیں اس بیوفا نے چھیڑیاں	ولہ	روتے روتے ہی رہے جس میں گذرا دن ڈھلا
کچھ تو صدا ہی آہ: نہ خاک بھی اُڑ جو	ولہ	اودھر کو لگ رہا ہی حسن گوش نقش پا
اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا	ولہ	جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا
چھوڑ دے کوئی کسی کیلئے جس طرح سے کچھ	ولہ	ہم نے منت میں تری کون و مکاں چھوڑ دیا
اپنی جا گر نہ ملے اور کہیں مجھ کو کیا	ولہ	تیری خاطر سے میں آتا ہوں نہیں مجھ کو کیا
وہ ملک دل کہ اپنا آباد تھا کبھو کا	ولہ	سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہو کا
دامن صحرا سے اُٹھنے کا حسن کا جی نہیں	ولہ	پانوں دیوانے نے پھیلایا بیاباں دیکھ کر

وله
اب جو چھوٹے بھی ہم قفس سے، تو کیا ہو چکی وہاں بہار ہی آخر

وله
اُس شوخ نے پھینکا ہے مگر تیر ہوا پر جاتا ہی جو دل کا مرے نخچیر ہوا پر

وله
دیکھا جو وہاں اُس کو، گماں سو طرف گیا آئے نہ ہوے کاش کہ ہم کوئی یار تک

وله
آن کر غمکدۂ دہر میں جو بیٹھے ہم شمع ساں اپنے تئیں آپ ہی رو بیٹھے ہم

وله
اس کی جب بزم سے ہم ہوکے بہ تنگ آتے ہیں اپنے ساتھ آپ ہی کرتے ہوے جنگ آتے ہیں
حُسن میں جب تئیں گرمی نہ ہو، جی دیوے کون شمع تصویر کے کب گرد پتنگ آتے ہیں

وله
اپنے دل سے تو کبھی ہم ترا شکوہ نہ کریں ہو کر آزردہ تم ایسے ہی تو بولا نہ کریں

وله
تیرے بن باغ میں جس وقت غنچۂ دل کے کھلتے ہیں خراش ناخن غم سے جگر کے زخم چھلتے ہیں
نہ لیٹ اس طرح منہ پر زلف کو بکھرا کے ای ظالم تو دا اُٹھ بیٹھ تو اس دم کہ دونو وقت ملتے ہیں

وله
ہے سنا دل کی جو زلفوں کے گیا پھیرے میں شب کو کیوں نکلا اکیلا، جو پھنسا پھیرے میں

وله
کہتا ہی تو کہ "تجھ سے میں ہی نباہتا ہوں" تو بھی کہیں ہو سچا ہمیں یوں ہی چاہتا ہوں

وله
مجھ پر ہی تیرا یہ ستم و جور کچھ نہیں، لیکن ترا ہر ایک سے یہ طور کچھ نہیں
روٹھا کرے وہ کیوں نہ کسی اور سے حسن یہ سب بگاڑ چاہ کا ہے، اور کچھ نہیں

وله
صیاد کی مرضی ہی یہ اب گل کی ہوس میں نالے نہ کریں مرغ گرفتار قفس میں
وہ اور زمانہ تھا کہ خوباں میں تھی الفت ایسا نظر آتا نہیں اب ایک بھی دس میں
دم رُکتا ہوا آتا ہی لب تک ترے غم سے عقدے پڑے ہیں بسکہ مرے تار نفس میں
دل اپنا اسی باتوں سے اُٹھ جاتا ہی تجھ سے جا بیٹھے ہی تو ل کے جو ہر ناکس و کس میں

وله
تیرے ہمنام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں جی دھڑک جاتا ہی میرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو

وله
غیر کو تم نہ آنکھ بھر دیکھو کیا غضب کرتے ہو ادھر دیکھو
دیکھنا زلف و رخ تمہیں ہر وقت شام دیکھو نہ تم سحر دیکھو

وله
کہنے کی ہیں یہ باتیں کس بن نہیں گذرتی پر ایک جان تو ہی جس بن نہیں گذرتی

جان و دل ہیں اُداس سے میرے	ولہ	اُٹھ گیا کون پاس سے میرے
ساتھ دیکھوں ہوں کسی کے جو کسی دلبر کو	ولہ	میں بھی جی رکھتا ہوں مجھ کو بھی ہوس آتی ہے
کیا چھیڑ سے پوچھے ہے کہ گھر تیرا نہیں ہے	ولہ	کہنے کو تو گھر یہاں ہے، پہ جی اپنا وہیں ہے
سیر ہے تجھ سے مری جان جدھر کو چلیئے	ولہ	تو ہی جب ساتھ نہ ہووے تو کدھر کو چلیئے
جب میں چلتا ہوں ترے کوچے سے گھبرا کے کبھی		دل مجھے پھیر کے کہتا ہے "ادھر کو چلیئے"
نغمۂ عشق سے ہیں سمۂ وز تار ملے	ولہ	ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے
دن توقع ہی توقع میں کہاں تک گذرے		مر گئے ہجر میں، بس اب تو کہیں یار ملے
جی تو ایسا ہی خفا تھا کہ نہ ملئے گا کبھو،		پر ترے ہنس کے لپٹ جانے میں ناچار ملے
گر بخت اپنے جاگیں تو اک کام کیجیے	ولہ	سایہ میں اُس کی زلف کے آرام کیجیے
اب میں بھی بے قراری پہ اپنی لیا قرار		بس خیر! آپ شوق سے آرام کیجیے
بھولے سے نام لے کے مراہٹ بتا گیا	ولہ	پیاری لگی یہ مجھ کو تری بات آج کی
کئی دن تیرے چھپ رہنے میں اشک آنکھوں سے برسائے	ولہ	نکل خورشید رو گھر سے کہ عالم خوب ترسائے
ترا ہر چند دل تجھ سے بھی کچھ سخت ترسا ہے	ولہ	ولیکن سخت اگر کہیئے، تو کب میرے جگر سا ہے
گریباں چاک اور خاموش مجھ کو دیکھ کہتا ہے		کروں کیا بات اس سے، یہ تو کچھ دیوانہ سا ہے
رہنے نہ دے گا اُس بن یہ دل تو ایک دم بھی	ولہ	کیوں روٹھ کر ہم اپنا کھو دیں عبث بھرم بھی
دریا میں ڈوب جائے، کہ یا چاہ میں پڑے	ولہ	اے عشق پر نہ کوئی تری راہ میں پڑے
آجا کہیں شتاب! کہ مانندِ نقشِ پا		تکتے ہیں راہ تیری سرِ راہ میں پڑے
یوں غیر کچھ نہیں، تو بلا کو بری لگے	ولہ	تو کچھ نہ کہہ، کہ ہم غربا کو بری لگے
کیا ہنسے اب کوئی اور کیا رو سکے	ولہ	دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے
رہے جس دم میں خطرہ سدا نیستی کا	ولہ	بس اے زندگی! ایسی ہستی سے گذرے
آنکھوں کو اُس کی دیکھا تو مستی نظر پڑی	ولہ	پھر ساتھ اُس کے بادہ پرستی نظر پڑی

سارا جہان خواب تھا آنکھوں میں تجھ بغیر | بارے وہ آج آیا تو بستی نظر پڑی

ولہ

جو چاہے آپ کو تو اُسے کیا نہ چاہیے | انصاف کرو، چاہئے ہو یا نہ چاہئے،
مجھ سے نے تجھ کو چاہا تو چاہا عجب نہیں | تجھسا جو مجھ کو چاہے، تو پھر کیا نہ چاہیے

ولہ

مژگاں سے جھاڑتے ہیں جو اُس گلی کے تنکو | رہتے ہیں ہم وہ اسے روز ازل سے تنکے

رباعی

دنیا داری میں اور نہ دیں داری میں | چاہت میں کسی کی ہیں، نہ بیزاری میں
حیرت کدۂ دہر میں تصویر کی طرح | سویا کرتے ہیں عین بیداری میں

رباعی

ہر آن میں آپ کو دکھا جاتے تھے | ہر لحظہ نیا شوق دلا جاتے تھے
کیوں دیر لگی ہے، کس نے روکا تم کو | اب تک تو کئی بار تم آ جاتے تھے

مثنوی در ہجو لکھنؤ و تعریف فیض آباد۔

نہیں یہ لکھنؤ، ہے یہ زناتا | زناتے پر عبث رکھتا بہاتا
زبس یہ ملک ہے پتھر پہ بستا | کہیں اونچا، کہیں نیچا ہے رستا
کسی کا آسماں پر گھر ہوا ہیں | کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں
زبس گنجان ہے یہ شہر باہم | سما سکتا نہیں ہو غیر کا دم
سیہ گل سے گلی یوں تر ہے ہر | بغل میں جس طرح زنگی کی بھرے ہے
فراغت سے یہاں کس کا مکاں ہے | ہر اک گھر بخیل کا سا دل یہاں ہے
کنوئیں بھی ہوئے ہیں پھر اس تنگ گھر میں | پڑے پتلی کا تل جیسے نظر میں
کنوئیں کہنا اسے ہے عقل سے دور | کہ ہے اس گھر کی چھاتی کا وہ ناسور
کہوں کیا میں قباحت اس مکاں کی | پڑی بنیاد بعد اس کے جہاں کی
ہزاروں راہ اس میں پیچ در پیچ | ولیکن مثل زلف زشت رو پیچ
جو اس کے زیر سایہ آن نکلے | رُکے دم، اور اُس کی جان نکلے
جو کوئی رات کو بھولے یہاں گھر | پھرے گلیوں میں ٹکراتا وہ در در

نہیں امکاں جو گھر اپنا وہ پاوے
بلا خورشید کو جب تک نہ لاوے

زمیں کوفے سے یہ شہر ہم عدد ہے
اگر شیعہ کہے نیک اس کو بیجا ہے

چڑھے ہے گومتی جب گرد آ کر
حباب آسا ہے پھرتے ہیں سب گھر

رکھے ہے پار ہو سکنا تب امکاں
چڑھے جب آدمی پر آدمی یہاں

سوائے قندیاں دیکھا نہ کچھ اور
سو ہے روپوش وہ بھی دیکھ یہ طور

چلا میں یہاں سے دل اپنا اٹھا کر
کہ کیجے سیر فیض آباد جا کر

عجب معمورۂ آباد پایا
مثال گل ہر اک دل شاد پایا

کھلا بازار اور رستہ کشادہ
بیاض جدولی جیسے ہو سادہ

دو ورستہ راستے میں اتنا رستا
کسی نے آج تک دیکھا ہی بستا

وہ جی ہے شہر کا ترپولیا یوں
کہ جیسے تین رگیں جسم میں ہوں

ادھر کو جوہری، اودھر کو بزاز
ادھر صراف، اور اودھر طلا ساز

روپے اور اشرفی دیکھے برستے
دیئے تختوں پہ جوں نرگس کے دستے

فیرنی اور فالودے کا عالم
کہے تو چاند اور تارے ہیں باہم

ملا شربت میں جو اس کو بتاوے
شب مہ کا سما پانی میں پاوے

ملائی دودھ کی دیکھو تو گویا
اسی میں مال حلوائی نے کھویا

بلندی پر ہے حلوائی کی دکاں
ستارے گرد ہیں جیسے چراغاں

دھری ہیں گولیاں اور یوں اندرسی
کہ گویا چاند اور تارے ہیں برسے

مٹھائی کی کروں تعریف تا چند
قلم کی ہو گئی اب تو زباں بند

ہزاروں خانگی اور کسبی آ کر
کریں ہیں سیر لالہ دل لگا کر

چمک دامن کی دکھلا یوں چلے ہے
کہ بجلی اپنے ہاتھوں کو ملے ہے

وہ سبزہ کان میں زیب بنا گوش
کہ جس کو دیکھ طوطی کے اڑیں ہوش

شعاع اس کی یہ اور منہ کا پسینا	ہے گویا پھول پر شبنم کا مینا
کوئی کرتی پہن جالی کی سادہ	گریباں کھ کے چھاتی تک کشادہ
کیا اس دام میں تکمہ کو یوں صید	سمجھ کے جوں گریباں میں ہو خورشید
مسافر اس طرف جو آن نکلے	نہ نکلے وہاں سے غیر از جان نکلے

بابُ الخاء

۱۔ خاکسار

خاکسار تخلص، محمد یار نام، شاہ جہان آبادی، قدم شریف کے خادموں میں سے تھا، بڑا ہی مشتاق زبان ریختہ کا۔ ہمیشہ محمد تقی میر تخلص سے نوک جھوک کرتا رہا ہے، اور ان کے اشعار میں مشاعروں کے اندر اکثر تصرف کیا گیا ہے۔ صاحب دیوان اور شاعر خوش بیان تھا۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ "شعر اس عزیز کے میرے ہاتھ نہیں لگے ہیں، اس جہت سے اشعار اس کے داخل اس تذکرے کے کمتر ہوئے ہیں"۔ یہ اشعار طبع زاد اس کہن اُستاد کے ہیں +

تھا زلیخا کو جو جاں سے مہ کنعان عزیز	ہم نے بھی تجھ سے تو بے مہر نہ کی جان عزیز
کل مجھے قتل کر اُس دشمن دیں کافر نے	بولا لوگوں سے یہ تھا مرد مسلمان عزیز
کیوں نہ ہو مصحف رخسار سے مجھ کو زیادہ[1]	کس مسلماں کو نہیں دین اور ایمان عزیز
خاکسار عرش سے بھی دیکھا ہے تیرا مزاج	آپ میں آ ذرا، اپنے تئیں پہچان عزیز

دل شیفتہ کر کے کیا لیا تو	ولہ	اے خانہ خراب! کیا کیا تو
تیری زلف سیہ سے اے پیارے	ولہ	مجھ کو یک سر ہزار سودا ہے
قیامت بھی ہو گی تو میری بلا سے	ولہ	مجھے داد خواہی کی طاقت کہاں ہے

[1] تقلیع میں عین گرتا ہے ۱۲

روونے سے خاکسار کے سوتا نہیں کوئی	ولہ	اس خانماں خراب کو چپکا خدا کرے!	
کیا ہے حاصل تجھے ناصح مرے سمجھانے سے	ولہ	آہ! جوں شمع ہے راحت مجھے جل جانے سی	

بَابُ الدَّالِ

۱۔ درد

درد تخلص. خواجہ میر نام. متوطن شاہ جہان آباد کے، خلف الصدق حضرت ناصر دہلوی کے. ثابت قدمی میں اس قطب آسمانِ استقلال کی، اور زاویہ گزینی میں اس مرکز دائرہ فضل و کمال کی یہ نقل مشہور ہے، اور زبان زد جمہور ہے، کہ جس ایام میں معمورہ شاہ جہان آباد کا، اور ہر ایک کوچہ اُس خجستہ بنیاد کا، مجمع اہل کمال سے، اور کثرت خجستان عدیم المثال سے، رشک ہفت اقلیم اور غیرتِ جنت النعیم تھا، تو معموری پر شہر کی عرصہ ربع مسکوں کا تنگ، اور وہ خراب آباد تشبیہ سے ہفت اقلیم کی تنگ تھا۔ جبکہ متواتر نزولِ آفات کے باعث، اور مکرر ورودِ بلیات کے سبب خراب ہوا، اور مصدر عقوبت و عذاب ہوا، تو ہر ایک درویش گوشہ نشین نے، اور ہر ایک صابر زاویہ گزین نے، اور ہر تو انگر مالدار نے، اور ہر امیر عالی مقدار نے، فرار کو غنیمت جانا، اور بھاگے اِدھر کو جدھر پایا ٹھکانا۔ مگر وہ سعید والا تبار، کہ نام نامی اُس کا خواجہ میر تھا، اُس قطب آسمان استقلال نے خیال بھی جگہ سے سرکنے کا نہ کیا، متحمل بلاؤں کے اور حامل جفاؤں کے ہوئے، اور شاہ جہان آباد کو چھوڑ کر ایک قدم اپنے کنج عزلت سے نہ گئے۔ اگر شیخ فرید شکر گنج اُس کوہ تحمل کو دیکھتا، تو چاشنیٔ فقر اُس کی حیران ہو کر مانند نیشکر کے انگشت تحیر کو کاٹتا۔ اور اگر سید حسین خنگ سوار ہیچ اس عرصہ کے ہوتا، تو زین پوش خدمت کا اُس کے کاندھے پر ڈال کے دوڑتا۔

غرض اس مجمع فضل و کمال کی التفاتِ طبیعت طرف نظم کے نہ واسطے شہرت اور نام کے بلکہ واسطے کرلینے افسردہ دلانِ خام کے ہے۔ اُس شہسوار معرکہ سخنوری کے توسن تند خرام قلم نے ہیچ قلمرو معنی آفرینی کے ایک گام بے راہی نہیں کی، اور اُس یکہ تاز عرصۂ مضمون

تراشی کے سِت رنگ آسمان پیغام سے ہیچ میدانِ بلند مقامی کے ایک قدم کوتاہی نہیں کی تعجب نہیں ہے اگر اُس عندلیبِ گلشن معنی کے کلام معجز نظام کی تحریر سے صفحۂ کاغذ کا ہم رنگ برنگِ گل ہو، اور نغمہ زبانِ قلم کا ہم آہنگ صفیرِ بلبل ہو۔ اگرچہ دیوان ان کا بہت مختصر ہے، لیکن سراپا درد و اثر ہے۔ زبان فارسی میں بھی اکثر غزلیں کہیں ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ بھی خالی کیفیت سے نہیں ہیں۔ رباعیوں کی طرف مسایل تصوف میں بیشتر طبیعت آئی ہے، اور شرح بھی اُس کے مشکل مقاموں کی آپ ہی فرمائی ہے۔ طریقۂ فقر میں بہت بڑے کاسب اور شاغل تھے، اور راہِ طریقت کے طالبوں کے واسطے رہنماے کامل تھے سنہ ۱۲۰۲ بارہ سو دو ہجری میں اُس بلبل گلشن آزادی نے دامِ ہستی سے نکل کر شاخسار کو چمنِ عدم کے آباد کیا ہے۔ یہ منتخب ان کے دیوان کا ہے

مقدور کسے ہے ترے وصفوں کے رقم کا — حقا کہ خداوند ہے تو لوح و قلم کا
بستے ہیں ترے سایہ میں سب شیخ و برہمن — آباد تجھی سے تو ہے گھر دیر و حرم کا
مانند حباب آنکھ تو اے درد کھلی تھی — کھینچا نہ پر اس بحر میں عرصہ کوئی دم کا

ولہ
اہل زمانہ آگے بھی تھے، اور زمانہ تھا — پر اب جو کچھ ہے، یہ تو کسی نے سنا نہ تھا
باور نہیں ابھی تجھے غافل یہ عنقریب — معلوم ہووے گا کہ یہ عالم فسانہ تھا

ولہ
یک بیک نام لے اُٹھا میرا — جی میں کیا اُس کے آگیا ہوگا

ولہ
گل و گلزار خوش نہیں آتا — باغ بے یار خوش نہیں آتا

ولہ
جاں پہ کھیلا ہوں میں، میرا جگر دیکھنا — جی نہ رہے یا رہے، مجھ کو اُدھر دیکھنا
ذکر وفا کیجیے اُس سے کہ واقف نہ ہو — کہتے ہو کس سے یہ تم ٹک تو ادھر دیکھنا

ولہ
باہر نہ آسکی تو قیدِ خودی سے اپنی — اے عقل بے حقیقت! دیکھا شعور تیرا
جھکتا نہیں ہمارا دل تو کسی طرف یہاں — جی میں سما رہا ہے از بس غرور تیرا

ولہ
ہم نے چاہا بھی، پر اُس کوچہ سے آیا نہ گیا — واں سے جو نقشِ قدم دل کو اٹھایا نہ گیا

ولہ
چمن میں صبح یہ کہتی تھی ہو کر چشمِ تر شبنم — بہارِ باغ گو یوں ہی رہے لیکن کدھر شبنم

تیری خون آشنا میاں مشہور ہیں اے تیغ یار		ایک قطرہ چھوڑے تو پیوے ہمارا ہی لہو
اس ہستی خراب سے کیا کام تھا ہمیں	ولہ	اے نشۂ ظہور! یہ تیری ترنگ ہے
نہ ہاتھ اٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے	ولہ	کسے دماغ کہ ہو دو بدو کمینے سے
مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جاوے		کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے کی
جو ملتا ہے ل ہے کہاں زندگانی	ولہ	کہاں میں، کہاں تو، کہاں نوجوانی
عجب خواب درپیش ہے پھر تو سب کو		سنا لو تم اب اپنی اپنی کہانی

۲- درد مند

درد مند تخلص، فقیر صاحب نام۔ دکن ان کے بزرگوں کا وطن ہے، بلکہ ان کا بھی مولد دکن ہے، لیکن تربیت انہوں نے شاہجہان آباد میں پائی ہے، اور خدمت سے میرزا جان جاناں مظہر کی کیفیت آدابِ فقر کی اٹھائی ہے۔ مرید بھی مرزائے مذکور کے تھے۔ چند مدت عظیم آباد میں بود و باش کی ہے، اور رفاقت میں نواب غلام حسین خاں اور نواب اعظم خاں کے بیٹے کی گذرانِ معاش کی ہے۔ بعد اس کے پھر دلی گئے، اور چند مدت وہاں رہے پھر نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ بھتیجے نواب وردی خاں مہابت جنگ کے بلائے ہوئے شاہجہان آباد سے مرشدآباد میں آئے، اور طور بود و باش کے وہیں ٹھہرائے۔ رفاقت میں نواب مذکور کی البتہ ایک رفاہِ احوال ہوا۔ آخر سنہ ۱۱۷۶ گیارہ سو چھہتر ہجری میں بلدۂ مرشدآباد کے اندر انتقال ہوا۔ سلیقۂ سخن رسی میں اُستاد تھے، اور طریقۂ مصاحبت و اختلاط کے ماہر حد سے زیادہ تھے۔ فارسی دیوان ان کا صاحب نظروں کا منظور ہے، اور ہندی میں تو یہی ساقی نامہ مشہور ہے +

پڑی اُس کی خوبی کی از بسکہ دھوم	لیا ہاتھ قدرت کا صانع نے چوم
ارے ساقی! اے جانِ فصلِ بہار!	یہی تھا ہمارا و تیرا اقرار
ہمارے بسرنے کی یہ فصل تھی؟[1]	فراموش کرنے کی یہ فصل تھی؟

[1] اس مضمون کو تصحیح ... [illegible]

تری جان کی سوں غنیمت ہوں میں — سلیقوں میں ظالم قیامت ہوں میں
مری عقل میں کون انباز ہے — ارسطو مرا اک دوا ساز ہے
فلک چرخ مارے گا گر صد ہزار — نہ لاوے گا مجھ سا کوئی روبکار
نظر تو کرو ٹک چمن کی طرف — شگوفہ کو آیا ہے مستی سے کف
چمن میں بھرا ہے نشہ یاں تلک — کہ جاتی ہے نرگس کی گردن ڈھلک
تجھے جان گل کے لہو کی قسم — تجھے باغ کے رنگ و بو کی قسم
تجھے جام کے چشم تر کی قسم — تجھے اپنی پنہاں نظر کی قسم
ادا سے لٹکنے کی تجھ کو قسم — نشہ سے بہنے کی تجھ کو قسم
تجھے جام صہبا کے سر کی قسم — تجھے اپنے مینا کے سر کی قسم
تجھے نازِ مستی کی اپنے قسم — تجھے خود پرستی کی اپنے قسم
قسم ہے تجھے بے سبب جنگ کی — قسم ہے مرے نام کے ننگ کی
ارے بے وفا بے مروّت صنم — میں دیتا ہوں تجھ کو قسم پر قسم
تجھے دختر رز کی حرمت کی سوں — تجھے مغبچوں کی شرافت کی سوں
تجھے وعدہ کر بھول جانے کی سوں — تجھے اپنی سوگند کھانے کی سوں
تجھے ناتوانوں کی طاقت کی سوں — تجھے بیقراروں کی فرصت کی سوں
شبِ عید کے تجھ کو چاؤں کی سوں — تجھے اپنی مہندی کے پاؤں کی سوں
جو تو نے کیا مے کو مجھ پر حرام — تو اتنا کر اے ظالموں کے امام
کہ تو سرکشی سے نہ کر پائمال — مرے خون کو اپنے اوپر حلال
تجھے رحم مجھ پر کچھ آتا نہیں — مگر جینا میرا بھاتا نہیں
نہ توڑ آئینہ اپنے خریدار کا — زیاں خوب نہیں اپنی سرکار کا
یقیں جانیو گر نہ ہو ایک آن — تری مہربانی کا مجھ کو گمان

تو صورت نہ پکڑے ہماری حیات	نکل جائے جی ناامیدی کے ساتھ

ہے غم سے رقیبوں کے مرا دل ناشاد	رباعی	اس دھڑکے سے جاتے ہیں سبھی عیش بباد
پرویز کے شیشہ خانہ عشرت پر		سنگ آیا ولیک سخت آیا فرہاد

۳ - دل

دل تخلص، شیخ محمد عابد نام۔ متوطن بلدہ عظیم آباد کے بے مثل، اور بے نظیر عالم محبت و وداد کے شیخ محمد روشن جوشش تخلص بڑے بھائی ہیں، جن کی خوبیاں باب الجیم کے اندر بیان میں آئی ہیں۔ غرض دونوں بھائی پسندیدہ اطوار اور حمیدہ خصال ہیں، طریقہ یک رنگی میں بے مثال ہیں یہ ابیات دل خراش اس اہل دل کی تلاش سے ہیں[له]۔

تیری زلفوں میں پھنسا دل یہی تقصیر ہوئی	نقد جاں لیجیے حاضر ہے گنہگاری دل
تالے ہی سدا بھر دن عمر کے بھرتے ہیں	ہیں نزع میں ہم تجھ بن جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
جوں آئینہ یہ ستم رسیدہ	رہتا ہے مدام آب دیدہ
تمہارے در پہ جو دربان نے آستیں پکڑی	برنگ نقش قدم ہم نے بھی زمیں پکڑی

۴ - دیوانہ

دیوانہ تخلص، رائے سرب سکھ نام، رشتہ دار راجہ مہا نراین کا تھا۔ نہایت پرگو۔ اور وضع مغلیت پہ مرتا تھا۔ دو دیوان زبان فارسی میں اس نے لکھے ہیں، اور اکثر ریختہ گو لکھنو کے مرزا جعفر علی حسرت، اور میر حیدر علی حیران، اس کے شاگردوں میں سے ہیں بعثہ ۱۲۱۰ بارہ سو

له اصل کتاب میں نمونہ کلام نہیں تھا معلوم نہیں مصنف ہی کو نہیں ملا یا جس نسخہ سے ہم نے نقل کیا ہے اس کے کاتب نے چھوڑ دیا ہے یہ مندرجہ بالا چار شعر ہم نے "سخن شعرا" مصنفہ عبدالغفور خاں نساخ سے نقل کیے ہیں۔

چار ہجری میں اچار گرم روی راہ عدم میں کی، اور آتشِ فنا پیکرِ وجود کو دی۔ فارسی منظوم اس کا دس ہزار بیت سے زیادہ ہے۔ یہ ہندی اس کا طبعزاد ہے ◆

جب نہ تب سنئے تو کرتا ہے وہ اقرار بغیر
گفتگو ہم سے اُسے پر نہیں انکار بغیر

بزم میں رات بہت سادہ و پرفن تھے ولے
گرمیٔ بزم کہاں اُس بت عیار بغیر

دیکھ بیمار کو تیرے یہ طبیبوں نے کہا
ہو چکی اس کو شفا شربتِ دیدار بغیر

جان پر آبنی ہمدم مری خاموشی سے
بات کچھ بن نہیں آتی ہے اب اظہار بغیر

جس کی خاطر کے لئے یار سب اغیار ہوئے
کیونکہ دیوانہ بھلا رہئے اب اُس یار بغیر

ولہ

دل ہے کہ تیری تیغ کے آگے سے ٹل نہ جائے
رستم کا کیا جگر ہے جو زہرا اُچھل نہ جائے

رباعی

وے یار کہاں کہ یار باشی کیجے
وے وقت کہاں کہ خوش معاشی کیجے
اک گوشہ میں بیٹھ کر دیوانہ تنہا
اب ناخنِ غم سے دل خراشی کیجے

بابُ السّین

۱۔ سوداؔ

نامِ نامی اور اسمِ گرامی اُس شاہ بازِ عرش پروازِ معنی کا مرزا رفیع ہے۔ متوطن دارالخلافہ شاہ جہان آباد کے۔ بیشک مقام اُن کی طبیعتِ فلک فرسا کا موافق اُن کے نام کے نہایت رفیع اور منیع ہے۔ روز تولد سے ساٹھ برس کی عمر تک دہلی میں ساتھ کمال عز و وقار کے رہے، اور طبع رسا کی مربی گری سے انیس و جلیس سلاطینِ نامدار اور وزرائے عالی تبار کے رہے۔ اگرچہ

سلہ مصنف نے جس خاص اسلوب میں رائے سرب سنگھ دیوانہ کے انتقال کو بیان کیا ہے، اُن میں ایک خاص جھلک پائی جاتی ہے، جو مصنف کی عزاختلی پر مشعر ہیں ◆

ذات اُس یگانۂ روزگار کی کثرتِ اشتہار کے باعث مستغنی ہے تکلیف سے خامۂ مدائح نگار کی، لیکن انصاف کہتا ہے کہ کچھ تھوڑا سا احوال اس مستغنی الصفات کا لکھا چاہیے، اور تذکرے سے اُس شاہ بیتِ کلیات معانی کے، بیان کو ان اوراق پریشان کے، زیب و زینت دیا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے کہ میرزائے مذکور سرحلقۂ سخنوران اور سرآمد معنی گستران تھے۔ آشنائے معنی بیگانہ اور مضمون تازہ کے پیدا کرنے میں یگانہ تھے۔ اقسامِ نظم سے دیوان اس مطلع دیوان سحربیان کا بھرا ہے، اور انواعِ نظم کو کیا کیا زور و شور کے ساتھ بیان کیا ہے۔ خصوصاً طرز قصیدہ کو کس صفائی اور تکلف سے ادا کر کے اس طاقِ بلند پر رکھا کہ دستِ وہمِ نازک خیالان ہندستان کا اس کے خیال تک نہ جا سکا۔ آگ گویا دیں اُس آتش زبان کے ہجوم شرار سے جوشِ قطراتِ عرقِ انفعال سے ہے، اور پانی کو خجالت سے اس طبع رواں کی خاک میں چھپنے کا خیال زبان ہندی کی شرفِ ہم زبانی سے اُس کی سرفراز، اور نظم ریختہ کو طبع معنی آفرین پر اُس کے گھمنڈ اور ناز۔ جب کہ بعد خراب اور ویران ہونے شاہ جہان آباد کے نقل و حرکت کا اتفاق میرزائے مذکور کو اس شہر سے ہوا، تو اَور شہروں کی سیر کرتے ہوئے آخر بلدۂ لکھنؤ میں طورِ سکونت کا کیا۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت قدر و منزلت کی، اور چھ ہزار روپے سالیانہ کی جاگیر مقرر کر دی۔ چنانچہ بیشتر قصیدے نواب آصف الدولہ مرحوم کی تعریف میں کہے ہیں، اور کیا کیا تر و تازگی کے ساتھ مضامینِ عالی باندھے ہیں۔ جب کہ سنِ شریف اس خضرِ راہِ سخن دانی کا ستر برس کو پہنچا، تو داعیِ اجل کو لبیک اجابت کہہ کے سرائے وجود سے پیما منزلِ عدم کا ہوا۔ تاریخ وفات اُس رفیع قدر محفل نکتہ دانی کی ہر ایک سخن سنج نے کہی ہے، لیکن یہ تاریخ اُس فرہادِ بے ستون مضمون تراشی کے سنگ مزار پر کندہ کی ہوئی ہے۔

خلد کو جب حضرتِ سودا گئے	فکر میں تاریخ کے ماہر ہوا
بولے منصف دور کر پائے عناد	شاعرانِ ہند کا سرور گیا

آغا باقر کا امام باڑہ اس محبِ امام علیہ السلام کا مدفن ہے، سایۂ قدوم امام کے باعث

اس گلشن ہستی کی عجب دید ہے لیکن — جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا
سودا جو کبھو گوش سے ہمت کے سنے تو — مضموں یہی ہے جرسِ دل کی فغاں کا

ولہ

جگہ تھی دل کو ترے دل میں اک زمانہ تھا — مرے بھی شیشہ کو اس سنگ میں ٹھکانا تھا

ولہ

جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤں گا — ہاتھ سے دل کے تری اب میں نکل جاؤں گا
لطف اے اشک کہ جوں شمع گلا جاتا ہوں — رحم اے آہِ شرربار کہ جل جاؤں گا
چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل — پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

۲- سوز

سوز تخلص، سید میر نام، ساکن قراول پورہ شاہ جہان آباد۔ سید علی نسب، اور فن سخنوری میں اُستاد، طرزِ ادا بندی کے بادشاہ، اور صحتِ مضمون درد و آہ تھے۔ کلام ان کا سر سے پاؤں تک سوز و ساز ہے، اور پاؤں سے سر تک ناز و نیاز۔ شعر کے پڑھنے میں صاحب طرزِ خاص تھے، اور آئینِ محبت میں مایۂ مؤدّت و اخلاص۔ علمِ تیراندازی اور کماں داری میں بہ شدّت دل آشنا رکھتے تھے، اور حسنِ شفیعہ نویسی میں نہایت دستِ رسا۔ ابتدائے جوانی میں اِنہوں نے ساتھ کامِ دل کے ایامِ زندگانی کو صرفِ نشۂ بے خمار کیا، اور سنہ اٹھارھویں میں جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے وارستہ مزاجی کی تکلیف سے لباسِ فقر اختیار کیا۔ لکھنؤ میں تشریف رکھتے تھے، اور اوقات ساتھ توکل و قناعت کے بسر کرتے تھے ؞

سنہ ۱۲۱۲ بارہ سو بارہ ہجری میں مرشدآباد تک تشریف لائے، لیکن اطوار سکونت کے وہاں کچھ نظر نہ آئے۔ اُسی سال پھر لکھنؤ تشریف لے گئے، اور اس دارِ فنا سے راہی ملکِ بقا کے ہوئے ؞

علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزارِ ابراہیم میں لکھا ہے کہ "جس سال یہ تذکرہ میں لکھتا ہوں، تو میر مذکور نے کچھ اشعار اپنے مع چند فقرۂ نثر لکھ کر مجھے بھیجے تا کہ داخل تذکرہ کروں"۔ چنانچہ ایک

آدہ فقرہ میر مذکور کی نثر کا بھی خانِ مذکور نے تذکرے میں لکھا ہے۔ ترجمہ اُس کا زبانِ ریختہ میں راقم حقیر نے اس طرح کیا ہے کہ جو شے حق سبحانہٗ تعالیٰ نے خلق کیا ہے، بلکہ جتنے خار و خس ہیں، کتنے ہی کام آتے ہیں، اور بندگانِ خدا اُن سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مگر یہ سوز وہ شخص ہے کہ کسی کو اس سے حلاوت حاصل نہیں ہوتی ہے، سواء سکوت اور کراہیت کے۔ سبحان اللہ! یہ بھی قدرتِ الٰہی کا اظہارِ کمال ہے، کہ ایسی شے خلق کی جاوے۔ جس سے کوئی فائدہ نہ اُٹھاوے۔ پس اگر کوئی منکر سوال کرے کہ ناکارہ محض تو نہیں ہے؟ خیر تو اس لائق ہے کہ نام اُس کا قابل جلانے کے ہے۔ غرض میر مذکور صاحب دیوان ہیں۔ اشعار منتخب ان کے لکھے جاتے یہاں ہیں۔

اہلِ ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا — آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا
درد سے محروم ہوں در ہاں سی مجھ کو کام کیا — یارِ خاطر تھا سو میرا بار خاطر ہو گیا
میں نے جانا تھا صحیفہ عشق کا ہی سے کرنام — واہ یہ دیوان بھی نقلِ دفاتر ہو گیا
کیا مسیحائی ہے تیرے لعل لب میں اے صنم — بات کے کہتے ہی دیکھو سوز شاعر ہو گیا

وله

دیکھ دل کو چھیڑ مت ظالم کہیں دُکھ جائیگا — ہاں بغیر از قطرۂ خوں اور تو کیا پائے گا
قتل کی نیت تو کر آیا ہے تو کیا دیر ہے — پھر مجھے تو مار کر ظالم بہت پچھتائے گا
پھر بھی کہتا ہوں تجھے اے سوز کو یوں مت ستا — مت ستا ظالم! کہیں تو بھی ستایا جائیگا

وله

منڈی گر چشم ظاہر دیدۂ بیدار ہو پیدا — در و دیوار سے شکل جمال یار ہو پیدا
تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال آتا تو پیدا کر — کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار ہو پیدا
یہاں تک کفر دیا چاہئے گر خاک گلشن ہو — بجائے ہر رگِ گل رشتۂ زنار ہو پیدا
قتیلِ خنجرِ مژگاں ہوں، کیا یہ بھی تعجب ہے — کہ میری خاک سے سبزے کی جاگہ خار ہو پیدا
مسیحائی ہے تیری تیغ میں کیا سوز کو ڈر ہے — جو لاکھوں بار ہووے قتل لاکھوں بار ہو پیدا

وله

جی تاک میں آیا بتِ گلفام نہ آیا — جیتا تو الٰہی سے کچھ کام نہ آیا
دنیا میں یہی دوستی ہوتی ہے مری جاں — جبتک نہ لیا دل تجھے آرام نہ آیا

عالم کی تمنا میں تری جاں لب آیا
قاصد تو پوچھتا تھا کہ قاصد ہے تو کس کا
تھا نزع کی حالت میں یہی سوز کی لب پر
کھڑے رہنے والو مگر سوز ہے یہ
مرا کشتہ ایسا تو ہے جس کی خاطر

رحمت سے خدا کی تو لب بام نہ آیا
وحشت سے اُسے یاد مرا نام نہ آیا
جی ناک میں آیا، بُت گل فام نہ آیا

ولہ

بھلا اس کے دل کا تو ارمان نکلا
یہ خورشید پھاڑے گریبان نکلا

قتل سی یہ بے گنہ رضی ہیں اپنے اس لئے
ابر کے قطرہ سے ہو جاتے ہیں موتی ناصحا
ہگذر اس خوں سی آخر پھر تجھے آویگا رحم

ولہ

ہاتھ میں اک روز تو داماں قاتل ہووے گا
کیا ہمیں رونے سے اپنے کچھ نہ حاصل ہوئے گا
سوز کا دل جس گھڑی خنجر سے بسمل ہوئے گا

کعبہ ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا
زلفوں سی پڑا طول میں اب عشق کا جھگڑا

ولہ

جو تم سے بتاں ہو گا سو اللہ کرے گا
خط آن کے یہ جملہ کو تاہ کرے گا

اپنے رونے سے گر اثر ہوتا
جن کے نامے پہنچتے ہیں تجھ تک
پھر نہ کرتا ستم کسی پہ اگر
خون عشاق کرتے کیوں ناحق
سوز کو شوق کعبہ جانیکا

ولہ

قطرۂ اشک بھی گہر ہوتا
کاش میں اُن کا نامہ بر ہوتا
حال میرے سے باخبر ہوتا
گر بتوں کو خدا کا ڈر ہوتا
ہے بہت پر زیادہ تر ہوتا

اگر میں جانتا ہے عشق میں دھڑکا جدائی کا
نہ پہنچے آہ و نالہ گوش تک اُس کے کبھو اپنا
خدایا کس کے ہم بندے کہاویں سخت مشکل ہے
خدا کی بندگی کا سوز ہے دعویٰ تو خلقت کو

ولہ

تو محشر تک نہ لیتا نام ہرگز آشنائی کا
بیاں ہم کیا کریں طالع کی اپنے نارسائی کا
رکھے ہے ہر صنم اس دہر میں دعویٰ خدائی کا
و لے دیکھا جسے بندہ ہے اپنی خودنمائی کا

قاصد ہزار طرح کے قصوں میں آسکا
قاصد ہو طفل اشک گئے بارہا ولے

ولہ

لیکن نہ حسن و عشق کا جھگڑا چکا سکا
دل کی خبر کوئی نہ تری کو سے لا سکا

کیا فائدہ ہی رونے سے اے چشم زار بس | | کب اشک دل کی آگ لگی کو بجھا سکا
رستم نے کوہ پہاڑ اُٹھایا تو کیا ہوا | | اُس کو سراہیئے جو ترا ناز اُٹھا سکا
اے سوز عزم کوچۂ قاتل نہ کر عبث | | تو ایک بھی بتا دے کہ واں جا کے آ سکا

خطرہ نہیں ہی مجھ کو اے عشق اپنے جی کا | وله | تو نے خطاب بخشا جب سے بہادری کا
ہر صبح منہ چڑھے ہی اُس تندخو کے اُٹھ کر | | کیا آہنی کلیجہ دیکھو ہے آرسی کا
کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سے تو باز | | دیکھا مزا نہ تو نے نادان عاشقی کا
عارض کو تیرے پہنچے کب اُس کی ٹھہراہٹ | | پیارے ہزار ہو تو ہے گل کا رنگ پھیکا
رستم تو آج تو ہے میدان کے سخن کا | | اے سوز کس کو دعویٰ ہی تجھ سے ہمسری کا

تجھ پہ قربان مری جان دل و دیں میرا | وله | ایک باری تو سُن افسانۂ رنگیں میرا
بوسۂ گل شاخ ہوا میں سے بھی لیتا ہی ہمن | | کس قدر شوخ ہے اللہ یہ گلچیں میرا

زلفوں کا اگر مجھ کو سروکار نہ ہوتا | وله | یہاں تک تو پریشان یہ دلِ زار نہ ہوتا
خوگر جو مداوے سے طبیب اپنے کو پایا | | تو زیست سے مایوس یہ بیمار نہ ہوتا
گر آنکھ اٹکتی نہ کسی شوخ سے جا کر | | تو دل بھی کہیں سوز گرفتار نہ ہوتا

ایک دن اک شخص نے اُس سے کہا | ط | تو نے تو یہ ذکر سنا ہوئے گا
یعنی کہ عاشق ہے ترا بھی سوز | | ہو متبسم یہ کہا ہوئے گا

بلبل نے جس کا جلوہ جا کر چمن میں دیکھا | وله | دو آنکھ موند ہم نے وہ من ہی من میں دیکھا
خورشید آوے جیسے ابر تنک کے اندر | | عاشق کو تیرے جن نے یوں پیرہن میں دیکھا
یوں دیکھنے سے میرے کیا فائدہ کسی کو | | دیکھا انہیں نے مجھ کو جن نے سخن میں دیکھا

اس سوا کچھ نہ پایا ترے دیوانے کا | وله | قطرۂ خوں ہے مگر خار بیاباں میں لگا

کسی طرح ترے دل سے حجاب نکلے گا | وله | مرے سوال کا منہ سے جواب نکلے گا
نکلنے کا نہیں سینے سے دل جو ڈھونڈھی گا | | جو نکلے گا تو جلا سا کباب نکلے گا

وله

ہے جیتے جی تو مجھے کوسنے یار میں رونا ۔ رہے گا مرگئے کے بعد از مزار میں رونا
جو چھپ کے رات کو شبنم چمن میں رو تو کیا ۔ مجھے تو ایک سے لے تا ہزار میں رونا
نہ غم خزاں کا مجھے نے بہار کی شادی ۔ خزاں میں خاک ہے سر پہ بہار میں رونا
تو روز وصل تو اے سوز اپنے آنسو پونچھ ۔ ابھی بہت ہے تجھے ہجر یار میں رونا

وله

بتوں کے عشق سے واللہ کچھ حاصل نہیں ہوتا ۔ اُنہوں سے بات کرنے کو بھی اب تو دل نہیں ہوتا

وله

جس نے تجھ کے تئیں دم بخشا ۔ اُس نے مجھ کو دل پر غم بخشا
ساغر عیش دیا اوروں کو ۔ سوز کو دیدۂ پر نم بخشا

وله

جس نے ہر درد کو درماں بخشا ۔ مجھ سے کافر کو بھی ایماں بخشا
بے نیازی تو میاں کی دیکھو ۔ گل کو بھی چاک گریباں بخشا
چشم معشوق کو دی عیاری ۔ سوز کو دیدۂ گریاں بخشا

وله

غم تو کہتا ہے کہ میں تجھ کو ستا جاؤں گا ۔ پر مری جان ترے غم کو میں کھا جاؤں گا
ہم غریبوں کے گھر آنے کا کہاں تم کو دماغ ۔ مت کرو وعدہ عبث ہم سے کہ آ جاؤں گا
اس طرح جی دوں کہ تو رحم سے بولے صد حیف ۔ رسم عشاق کشی جان اُٹھا جاؤں گا
باغباں فکر نہ کر تو مرے ویرانے کا ۔ آشیاں آتش گل سے میں جلا جاؤں گا
لے چکا دل کو خط اب جان جو مانگی ہے غل ۔ سوز کہتا ہے یہ گولی تو بچا جاؤں گا

وله

گل ہی نہیں غلام تبسم کی آن کا ۔ غنچہ بھی زرخرید ہے تیرے دہان کا
زاہد جو کھینچ کھینچ کے چلّے ہوا ہے خم ۔ بہتر ہے ایسے چلّوں سے چلّہ کمان کا
سینہ میں دل کہاں ہے غم رفتگاں سے سوز ۔ اک گرد رہ گیا ہے نشاں کاروان کا

وله

جو دل کہ تھا الٰہی اُس دلربا کے گھر سا ۔ خالی پڑا ہے اب یوں اُجڑا ہوا نگر سا
ترسا نے ترس کھایا احوال سن کے میرا ۔ بے ترس ڈھونڈا ہے اتنا نہ مجھ کو ترسا
شاید کہ اپنے گھر کی دی اُس نے خاک روبی ۔ خورشید کی کلہ پر کچھ تو دھرا ہے پرسا

جاتا ہی سوز جس دن کہتا ہی ہمنشیں سے / آنے نہ دیجو اس کو لگتا ہے بد نظر سا

ولہ

مروت دشمنا غفلت پناہا / ادھر ٹک دیکھ لیجو مڑ کے آہا
صَرَفْتُ العُمْرَ فِی لَھْوٍ وَّلَعِبٍ / فَآھًا ثُمَّ آھًا ثُمَّ آھًا

یوں دیکھ لے ہی وہ کہ ادا کو نہ ہو خبر / چھینے دل اس طرح کہ دغا کو نہ ہو خبر
عشاق تیری تیغ تلے او ستم پناہ / سر اس طرح سے دیں کہ قضا کو نہ ہو خبر
رخصت جو دی تو مجھ کو تو میں تیرے پاؤں کا / بوسہ لوں اس طرح کہ حنا کو نہ ہو خبر
ناصح تو چاک جیب کا مانع ہو اس قدر / دل چاک یوں کروں کہ قبا کو نہ ہو خبر

ولہ

اب ضرر کرنے لگا دل کو بتاں کا اختلاط / سچ تو ہے ان بے وفاؤں سی کہاں کا اختلاط
اب کوئی دم کو مچاوے گی خزاں یاں آ کر دھم / عندلیبو چھوڑ دو تم گلستاں کا اختلاط

ولہ

یہ سب باتیں ہیں قاصد یار میرے گھر نہیں آتا / نہ دیکھوں جب تلک آنکھوں سی کچھ باور نہیں آتا
پرائے دل کو لے کر اپنے تلووں کے تلے ملتا / اسے سن تو تجھے ہرگز خدا کا ڈر نہیں آتا
کسی کے دل میں ہوگا سوز مر جاوے تو بہتر ہے / الٰہی میں مروں کیوں کر کبھی تو مر نہیں آتا

ولہ

کیا دید کروں میں اس جہاں کا / وابستہ ہوں چشم خوں چکاں کا
ہرگز نہ ملا تری گلی سے / ممنون ہوں جسم ناتواں کا
سوز آگے ذرا سنبھل کے جانا / بیٹھا ہے لگائے گھات بانکا

ولہ

جگر سی آہ دل سی نالہ سینہ سے فغاں نکلا / سراتن سی کیا حسرت زدوں کا کارواں نکلا
جو دل تھا میرے پہلو میں سو اب وہ عرش اعظم ہے / خدا کے واسطے دیکھو کہاں سی جا کہاں نکلا

ولہ

الٰہی محبت کو لگ جائے لوکا / کہ اٹھتا ہے ہر دم جگر سے بھبھوکا
فریب محبت نے مجھ کو پھنسایا / میں بھولا میں بھولا میں چوکا میں چوکا
جہاں روز پریوں کا رہتا اکھاڑا / وہاں اب پڑا ہے گا میدان ہو کا

ولہ

مرا قتل کیا دلربا تم نے چاہا / وہ کب چوکتا تھا خدا نے نہ چاہا

چشم غفلت کھول کر ٹک دیکھ تو ای مست خواب ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ دھر تے کن کن ملوکوں کا کیا خانہ خراب
مسند فرعونیت پہ بیٹھتے تھے جو بہ باز تو ۔۔۔ اہل استحقاق کا منہ سے نہ دیتے تھے جواب
خاک میں پنہاں ہوئے ایسے کہ کچھ پیدا نہیں ۔۔۔ کون سا ان میں ہے رستم کون سا افراسیاب
بارہ ساعت کے لئے افلاک پر ہیں جو دماغ ۔۔۔ واہ واہ اُن کو بھی کہلو آفتاب اور ماہتاب
پوچھیو تو باندھ کر کس پہ چلا ہے تو کمر ۔۔۔ میں پڑا کھاتا رہوں گا تا قیامت پیچ و تاب
ان دنوں میں سوز کو دیکھا ہے یارو واہ وا ۔۔۔ ایک دنیا دار سے مل کر ہے عالی جناب

اشک کب ہوں تیرے ستانے کی خشک ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ کوچے کب ہوتے ہیں منجلانے کے خشک
چوری چوری مُنہ ترے شاید لگا ۔۔۔ ہونٹ کچھ ہیں دھب میں پلانے کی خشک
زلف کی پلٹوں میں کیا جا کر پھنسا ۔۔۔ یا الٰہی ہاتھ ہوں شانے کے خشک

ٹکرائیں سنگ سے سر ہو ہمکنار ہم تم ۔۔۔ ولہ ۔۔۔ روئیں گلے سے لگ کر اے آبشار ہم تم
میرا ہی سرو مجھ سے سرکش ہوا ہے قمری ۔۔۔ نالے کریں نہ یک جا ہیں سوگوار ہم تم
دیکھیں تو داغ سینہ کس کے ہیں اب زیادہ ۔۔۔ اے لالہ داغ دل کے کریں شمار ہم تم
تو میری دل کو دیکھ اور میں تیری دل کو دیکھوں ۔۔۔ دل چاک چاک کر کر دیکھیں بہار ہم تم
تم تو چلے گئے پر یہ سوز ہے اکیلا ۔۔۔ اے میر درد صاحب تھے یادگار ہم تم

۳۔ سجّاد

سجاد تخلص میر سجاد نام اکبر آبادی۔ وطن بزرگوں کا اِنکے آذربایجان ہے، لیکن تربیت انہوں نے
شاہ جہان آباد میں پائی ہے۔ اور شاگردوں میں شاہ نجم الدین آبرو کے کیفیت طرز ایہام شاہ
صاحب مذکور سے زیادہ ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنی وضع کا یہ عزیز بھی اُستاد ہے میر محمد اکرم خاں
دادا ان کے دارالانشائے بادشاہی میں نواب یحییٰ خاں میر منشی کے ہمراہ تھے، بہت مرد سنجیدہ
اور حقیقت آگاہ تھے۔ غرض میر مذکور صاحب دیوان پُر بیان ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب دیوان ہیں۔

ساقی بغیر جام کے جی کا بچاؤ نہیں		جوں فیل مست آ سے بھر ابر سیہ پلا
کافر بتوں سے داو نہ چاہو کہ یہاں کوئی	ولہ	مرحبا ستم سے اُن کے تو کہتے ہیں حق ہوا
گر تیرے گل کے آنے نے کچھو نہیں ہوس		سچا وکیوں پھرے ہے سجن آج فق ہوا
یعقوب کے جب عشق پڑا سر پہ ٹوٹ کے	ولہ	آنکھوں نے اُس کی رو دیا آخر کو پھوٹ کے
عشق میں جائے گا بے طرح مارا		بے طرح دل ہوا ہے آوارا
خط کتروا کے آج قینچی سے		ہم سے ملنے میں جائے ہے کترا
غم نہیں گر گم ہوا بالوں میں تیری جا کر دل		پیچ پر تجھ زلف کے گویا کہ اُس کو بل دیا
تجھ کو اے سچا و غیر از خنجر بیداد کے		اور بھی کچھ ظالموں کی دوستی نے پھل دیا
بتاں تو چاہتے سچا دیکھ تجھ کو		کریں کیا پر خدا نے جو نچاہا
مقبول اس جہاں کا ہرگز حسنی نہ دیکھا		راجہ وہی ہے جو کوئی یہاں سے گیا ہے ناچ
شتابی پلا دے کہ جاتا ہے ابر	ولہ	جو کچھ باقی ساقی رہی ہو شراب
دور میں رخسار کے تیرے کہیں انصاف نہیں	ولہ	خط چرا لے جائے دل کو اور باندھی جائے زلف
جس خوبرو کی دل میں نہ عاشق سے ہو نفاق	ولہ	کہتے ہیں ساری اُس کے تئیں حسن اتفاق
ایک دل رکھتا ہوں جو چاہے سو لیجا دو اُسے	ولہ	خواہ زلفیں خواہ مژگاں خواہ ابرو خواہ چشم
جب ہم آغوش یار ہوتے ہیں	ولہ	سب منہ سے درکنار ہوتے ہیں
بتوں کے تئیں کس قدر مانتا ہے	ولہ	یہ کافر مرا دل خدا جانتا ہے
اے صنم زنار پہنی تجھ وفا کے واسطے		ورنہ کوئی کافر بھی ہوتا ہے خدا کے واسطے
کوئی جا کے قاتل کو سمجھائیے گا	ولہ	کہ عاشق کا جی کھو کے کیا پائیے گا
کہا دل نے بولو یہ خوبوں کے تئیں		یہ دیکھو گے اپنا کیا پائیے گا
ہے میرے تمام حال کی تقریر یہ زلف	ولہ	روز سیاہ و نالۂ شبگیر ہے یہ زلف
رہو آہ دل سوز میرے سے فرق	ولہ	کہ ہے خوشہ میں اس کے خرمن کی برق

دل کو کبھی پیار دلا کر کے اے سجن		لاگا نہیں گلے سے مرے آج لگ	
لختِ جگر ہمارا پانوں کے ساتھ کھا کر	ولہ	کرتے ہو ہم سے باتیں اب تم چبا چبا کر	

بابُ الشین

۱- شورش

شورش تخلص، میر غلام حسین نام، متوطن عظیم آباد کے مشہور میر پُہنا کر کے تھے۔ بھانجے تھے ملا میر وحید کے۔ اور مشورہ سخن کا کیا تھا میر باقر حزیں تخلص سے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے کہ "میرے آشنا تھے، اور بیماری میں غرور کی مبتلا تھے۔ فقط اپنے خیال فاسد سے انہوں نے اپنے کلام کی قباحتوں پر التفات نہیں کیا ہے، اس سبب سے سخن ان کا ہمیشہ مورد اعتراض سخن گیروں کا رہا ہے"۔ ایک تذکرہ شعرائے ہند کا زبان ریختہ میں انہوں نے لکھا ہے، لیکن وہ بھی بسبب ان کی خود پسندی کے خالی خلل اور زلل سے نہ تھا۔ ۱۱۹۵ھ گیارہ سو پچانوے ہجری میں اس سرائے فنا سے جادہ نورد منزل بقا کے ہوئے۔ دیوان ان کا زبان ریختہ میں مرتب ہے۔ یہ ان کے کلام کا منتخب ہے +

ہمارے پاس بھی آیا نہ آیا		بھروسہ کیا ہے جی آیا نہ آیا	
کسی کو خم سے غرض ہے کسی کو جام سے کام	ولہ	قسم مغاں کی ہے ساقی کو ہم کو نام سے کام	
اُٹھی یہ اُلفتِ گل کے سبب سے سب اپنا		وگرنہ کیا تھا ہمیں ہم صفیر و دام سے کام	
ہماری صبح رخِ یار شام زلفِ نگار		نہ مہر و ماہ سے ہے ہم کو صبح شام سے کام	
ہر ایک دم میں ہمیں وصل ہجر میں موجود		غرض نہ نام سے رکھتے ہیں نے پیام سے کام	
رقیب گرچہ بہت برخلاف ہے شورش		ہوا کرے ہمیں ہے یاں اپنے کام سے کام	

بابُ الصّاد

۱- صائغ

صائغ تخلص۔ نظام الدین احمد نام۔ ساکن بلگرام۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ تجمان قدیم سے میرزا محمد رفیع سودا کے، اور دوستانِ صمیم سے اس خاکسار کے تھے۔ بڑے صاحب درد و تاثیر، اور طبیعت کی گدازی میں بے نظیر۔ اچھا شعر جب کسی سے سُنتے، تو گھڑیوں روتے، اور بے چین رہتے عالم اخلاص اور دوستی میں زمانہ کے افتخار۔ استقامت طبع اور رسائی ذہن میں مستغنی روزگار تھے۔ سنہ بائیسویں تک جلوس شاہ عالم بادشاہ غازی کے ہمیشہ مرشد آباد اور کلکتے میں ایام زندگی کے بسر کرتے تھے۔ آخر سنہ[1] ہجری میں ملکِ وجود سے رخت سفر کا باندھ کے راہی کشور عدم کے ہوئے۔ فارسی دیوان مترتب ہے ان کا۔ اور ریختہ کا شوق کمتر تھا۔ یہ اشعار اس نکو کردار کے ہیں ؂

بجن کی اُس محبت پہ دیا تھا جانُ و دل صائغ		نہ تھا معلوم ہو جاوے گا وہ نامہرباں اپنا
جلے بُھنے ترے جس وقت آہ کرتے ہیں	ولہ	تو دود دل سے جہاں کو سیاہ کرتے ہیں
قسم ہے تیری ہی، کھلنے میں یار تیر نگاہ		جگر تلک نہیں دل کے تباہ کرتے ہیں
یہی ہوئے ہیں تب و تاب جاں ستی آگاہ		جو کوئی دل سے گذر گاہ گاہ کرتے ہیں
خدا بچاوے غم و درد و ہجر عشق میں آہ		ڈبا کے زورقِ دل کو تباہ کرتے ہیں
نہ کوہکن سے ہوئی بے ستوں میں صائغ راہ		بڑے وہ مرد ہیں جو دل میں راہ کرتے ہیں
ہلاہل شوق ہو من کو دھڑی ہونٹوں جلانے کا	ولہ	نہ جانوں کیا سبب یاقوت کے نیلم بنانے کا

[1] قلمی نسخہ میں سن وفات نہیں لکھا

یہ بلبل شاخ گل پر بیٹھ کر کیا شور کرتی ہے	صبا کا آج وعدہ ہے مگر کلیاں کھلانے کا

بابُ الضاد

۱- ضیا

ضیا تخلص، میر ضیاء الدین نام، متوطن شاہجہان آباد کے، میرزا محمد رفیع سودا کے ہم عصر، نظم ریختہ میں مالک تھے طبع بلند کے، اور صاحب تھے ذہن ارجمند کے۔ دلی سے جب کہ لکھنؤ میں آئے، تو طرح سکونت کا وہیں ٹھہرائے۔ ایک مدت اوقات اُسی شہر میں بسر کی، اور داد شعر و شاعری کی دی۔ اکثر سخنوروں کو اس دیار کے نسبت شاگردی کی اُس شاعر شیریں کلام کے ساتھ ہے۔ اقسام نظم میں ان سے بیشتر ہوئی فکر غزلیات سے ہے۔ قصیدے سے تو ان کو کچھ انکار سا رہا ہے، اور مثنوی کا خیال بھی کم تر کیا ہے۔ آخر عمر بلدۂ عظیم آباد میں استقامت اختیار کی تھی اور طبیعت اکثر ساتھ عزلت و گوشہ نشینی کے بار کی تھی۔ آشنا پرست اور دردمند رنج و راحت میں ہمیشہ خورسند تھے۔ از بسکہ مدار دنیائے فانی کا فنا پر ہے، راہ گذار جادۂ بقا کے ہوئے۔ مالک دیوان رنگین و متین کے ہیں۔ یہ شعر اس شاعر ذکی و ذہین کے ہیں ◆

باؤ بھی کھائی نہ تھی دل نے کہ مرجھانے لگا		آہ یہ غنچہ تو کچھ کھلتے ہی کملانے لگا
کل کی رسوائی تجھے کیا بس نہ تھی اے ننگِ خلق		اُس کے کوچے میں ضیا پھر آج تو جانے لگا
پلادے آبِ خنجر ہم کو ظالم تشنہ جاتے ہیں	وله	جو کوئی مرتا ہے اُس کے حلق میں پانی چواتے ہیں
ہے ماتم کس دوانے کا الٰہی آج صحرا میں		کہ سیلیں سی تی پھرتی ہیں بگولے خاک اُڑاتے ہیں
ضیا لکھ ہاتھ سینے پر خبر دل کی بھی لے ظالم		کہ آج آنسو تری آنکھوں سے کچھ لہو سے آتے ہیں
گریباں میں خاک اُڑاتا جوں ابر و جوں بگولا	وله	صحرا میں تو نے مجنوں وحشی ضیا کو دیکھا
اے آہ غنچۂ گل نہ کہیں دل تھلک پڑے		یہ جام بھر رہا ہے صبا دا چھلک پڑے

تیرے مینا کا حال میں پوچھا تھا شمع سے	اک آہ اس نے کھینچی اور آنسو ڈھلک گئے

بابُ العین

۱۔ عزلت

عزلت تخلص، سید عبدالولی نام۔ خلف شاہ سعید اللہ سورتی کے۔ وہ شاہ سعید اللہ کہ سر دفتر فاضلان اور سر حلقہ صاحبدلان تھے۔ اور بادشاہ عالمگیر کے تئیں اس مرجع خلائق سے اعتقاد صادق تھا۔ اصل وطن شاہ صاحب مذکور کا کوئی قصبہ ہے قصبات لکھنؤ سے، لیکن از بسکہ اقامت سورت میں اختیار کی تھی سورتی مشہور ہوئے۔ غرض جب عزلت مذکور اپنے والد کی وفات کے بعد دلی میں گئے، تو شاہ جہان آباد کے سخنوروں کی ہم صحبتی سے فکر میں ریختہ کے پڑے۔ تلاش پر نظم کی دل دیا، اور حوصلہ شعر و شاعری کا حاصل کیا۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ اوصاف حکمت و فضیلت کے اور فلاح و اطوار اس عزیز کے خالی سبکی اور بے مغزی سے نہ تھے۔ نواب علی مردی خاں مہابت جنگ مغفور کے عہد دولت میں وارد مرشد آباد کے ہوئے، اور مورد عنایت و امداد کے ہوئے۔ حرکات ان سے خلاف ان کے منصب کے عمل میں آتے تھے اور آنکھوں میں ارباب تمیز کی کیفیت کو اعتبار کی گھٹاتے تھے۔ نواب مرقوم الصدر کی وفات کے بعد سر زمین دکن نور جمال سے اپنے منور کی، اور بقایائے عمر اسی مملکت میں بسر کی۔ دیوان ان کا مدت سے پا چکا اختتام ہے، یہ ان کا منتخب کلام ہے۔

خیر میں سے نہ ہو نیرنگ لالن فصل ہولی میں	وله	ترا جامہ گلابی ہو تو میرا خرقہ بھگوں ہو
بہار آئی چمن میں غل ہو بلبل کی صفیروں کا		جدا ہے ہر گلی میں شور زنجیر اسیروں کا
عبث تھا امر اول ناز سکھلانے کے کام آتا		یہ آئینہ تھا اس خود بیں کے اتراہٹ کے کام آتا
جلایا مصحف دل تو نے کیوں بہ تقیِ تغافل سے		جو سچ بولوں تجھے جھوٹی قسم کھانے کے کام آتا

بتوں کا جور دیوانہ دوا کرنا تا ہیں گا | ولہ | کہ پتھروں کو وہ صندل دردِ سر کا جانتا ہیں گا
بگولہ بن کے ان دستوں میں کوہکن اب تک | | نسیم گلگوں کی مانی ہاتھ مل مل چھانتا ہیں گا
سیہ روزی میں میری قدر کو اجاب کیا تمیں | | اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہیں گا
مجھے چاہے کہ تم سارے سبب دشنام سکیں گا | | غلیل ابر کے غزلت کس منہ سے تلتا ہیں گا
ہوا ہی داغ اس کا مغز نازک آتش گل سے | ولہ | چمن زادوں میں اک منزا منش لالہ ہوا پیدا

جدھر نکلے وہ ہو لی بلز باز | ولہ | گلابی ہے غبارِ راہ وہاں کا
تحمل امید بیوفایوں سے | طہ | دل سلامت رہے تو پھل پاتا
اول میں عشق اپنے سے بیہوش کیا | ولہ | یاد اپنی دی پھر ہم کو فراموش کیا
ہم نے بھی جرس وار ای یار سفری | | دل کو نالاں لبوں کو خاموش کیا

ہماری گرد سے دامن جھٹک گیا دلدار | ولہ | کلال سا پڑا جلتا ہے اب تلک یہ غبار
یاروں کی خاطروں کی کیا دل مرا خبر لے | ولہ | ہیں پر غبار سب دل کیا خاک جا خبر لے
یوں شب کہ صبح ہو جائے تب آفتاب آ کے | | ہم جل کے ہو گئے راکھ جب لگ وہ آ خبر لے
ہم ہیں مفلس یار کی قیمت گراں کیا کیجیے | ولہ | ہم زمین اور اس کا رتبہ آسماں کیا کیجیے
بچا دل زلف کے عقرب سے تو کیا | ولہ | کہ چوٹی ناگنی پیچھے پڑی ہے
تری زلف کی شب کا بیدار میں ہوں | ولہ | تجھ آنکھوں کے ساغر کا مخمور میں ہوں
کدھر بہتا پھرتا ہے اے گریۂ غم | | کہ آنکھوں سے تیرا خریدار میں ہوں
پیر ہو یا شیخ ہو ہے دیکھو طفلاں کا مرید | ولہ | مردہ بولا ہے کفن پھاڑ قیامت آئی
دل میں رندوں کے پھپھولا ہوا عمامۂ شیخ | ولہ | یارب اس بزم سے یہ زہر کا ٹکڑا اٹھ جائے
کھلا کے دل جسے پالا سو ہے مراد الٰہی | ولہ | جناب پاک جنوں مدظلہ العالی
شانہ اس زلف میں پھرتے یہ سخن کہتا تھا | ولہ | بات کہتے ہی شب وصل چلی جاتی ہے
شکستہ گر ہوا دل اب نظر نہ کر مجھ کر | | یہ ٹوٹے آئینے میں منہ تری بلا دیکھے

۲- عشق

عشق تخلص، شاہ رکن الدین نام۔ شاہ گھسیٹا کر کے مشہور تھے۔ شاہ جہاں آبادی۔ نواسے شاہ فرہاد کے عمدہ مشایخوں میں سے ولی کے۔ جہاں بیان ہوتی۔ شاہ فرہاد کی حالت سکر و مستی ہے، تو کہتے ہیں کہ اس عالم میں تعظیم بادشاہ کی نہیں کی ہے۔ غرض عشق مذکور ایام شباب میں شاہجہان آباد سے مرشد آباد میں آئے، اور خواجہ محمدی خاں مرحوم کے ساتھ لباس دنیا داری میں ایک مدت ایام حیات بعزت تمام بسر کئے۔ اگرچہ کچھ خدمت نہ کام رکھتے تھے۔ لیکن آنکھوں میں امرایان مرشد آباد کے نہایت احترام رکھتے تھے۔ بعد ایک عرصہ کے اپنے بزرگوں کے طور پر مزاج فقر و درویشی کی طرف آیا، اور تکیہ فضل ایزدی پر کر کے طور استقامت کا عظیم آباد میں ٹھہرایا۔ پھر تو نہایت زور و شور کے ساتھ مشیخت پناہی کی، اور معتقدوں کے ہجوم سے عالم درویشی میں شاہی کی۔ طالبان راہ عشق کو ہدایت مطلب سے خالی نہیں چھوڑا۔ بقول علی ابراہیم خاں مرحوم ۱۱۹۵ھ گیارہ سو پچانوے ہجری تک داد حال و قال کی دی۔ آخر بلدہ عظیم آباد میں مرشد حقیقی قضا کے ارشاد دعوت پر لبیک اجابت بآواز بلند کہی۔ دیوان اس مشیخت دستگاہ کا زبان ریختہ میں مترتب ہے، یہ اس کا منتخب ہے:

کہنے کو ادھر ادھر گئے ہم — تجھ تیری طرف جدھر گئے ہم
تا جاں نہ ہوئی صد دل حسکی — تو نے کہا مر، تو مر گئے ہم

بات کہنے کی نہیں طاقت شکایت کیا کروں	وله	عشق رخصت دے تو شور حشر اب برپا کروں
سنے صد دل ہے باقی نے آہ و نے فغاں ہے	وله	اے سوز عشق سچ کہ تو ان دونوں کہاں ہے
دیکھے بن اس کے یک دم چین یہ رہتا نہیں	وله	اس دل کا فکر کے ہاتھوں سخت گھبرائے ہیں ہم
جوں آفتاب تاباں گو نام کو عیاں ہوں	وله	یہ پرتو ہے تیرا کہ سو دیکھ میں کہاں ہوں
گو نام اور نشاں سے ہے ظاہر میں میرا یارو		جو دیکھو فی الحقیقت ہوں وہم یا گماں ہوں
باتیں نہ سن تو میری جل جائے گا دیوانے		میں برق آسماں ہوں یا عشق کی زباں ہوں

عرش تا فرش سیر کر دیکھا	ولہ	تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
چشم تحقیق سے جہاں ڈھونڈھا		کافر ہوں تجھ سوا اگر دیکھا
تیرے کے نام پر تڑپتا ہوں		اس طرح کا کہیں جگر دیکھا
آبلہ آبلہ ہوئے سب عضو		نخل الفت میں یہ ثمر دیکھا
سحر میں سامری کے کیا قدرت		تیری نظروں میں جو اثر دیکھا
اپنے ہم چشم سے لگا کہنے		نالہ و آہ گھر بہ گھر دیکھا
ٹک اک انصاف سے اگر دیکھو		عشق سا کوئی چشم تر دیکھا
دیدۂ دل جو کر کے وا دیکھا	ولہ	حرم و دیر میں خدا دیکھا
ہنس کے کہنے لگا ملامت گر		عشق میں تو نے کیا مزا دیکھا
اس کی لذت کو دل سمجھتا ہے		اس کو میں کیا کہوں کہ کیا دیکھا
دشت تجھ کو قسم ہے مجنوں کی		عشق سا کوئی برہنہ پا دیکھا
از عدم تا وجود آ دیکھا	ولہ	جان دیکھا سو بے وفا دیکھا
اپنی آنکھوں سے دیکھ اے خوش چشم		مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا دیکھا
تجھ سے کوئی آشنا نہ ہوا ہو		پر تجھے سب سے آشنا دیکھا
اس کے دامن تلک نہ پہنچے ہم		خاک میں آپ کو ملا دیکھا
ظالم اپنی جفا میں کہ تو کبھو		لب مرا شکوہ میں ہلا دیکھا
کبھو غم سے جدا نہ دیکھا میں		عشق کو جا کے بارہا دیکھا
میں کافر ہوں اگر منظور مجھ سے لطف مرہم کا	ولہ	کہ یہ داغ جگر ہے یادگار اس یار ہمدم کا
ترا یہ وعدۂ فردا تو دل کو روز فردا ہے		کہاں فرصت ہے اے ناداں بھروسا ہی کہاں دم کا
رلاتے میں ہے کچھ تجھ کو ہیگا فائدہ کہ تو		مگر اتنا کہ گھر اپنا ڈبویا اور مردم کا
کفایت ہے بروز حشر مجھ کو شفقت حیدر		کہ جس کے نام سے زہرا ہوا پانی جہنم کا

چاکِ دل تا بہ گریباں نہ ہوا تھا سو ہوا	دل	لختِ دل زینت داماں نہ ہوا تھا سو ہوا
بے وفائی تری دل دیکھ کے اے دھوکہ خلاف		عشق بازی میں پشیماں نہ ہوا تھا سو ہوا

۳- عیش

عیش تخلص، میرزا عسکری نام، بیٹے مرزا علی نقی کے۔ وہ مرزا علی نقی جن کو نواب حسین قلی خاں کی طرف سے اپنی جاگیر کی ایک مدت رہی، اور زندگی اُنھوں نے اس خدمت میں نہایت تشخیص و حکومت کے ساتھ بسر کی ہے۔ غرض میرزا عسکری مذکور جوان مودبِ باشعور اور تہذیب اخلاق سے معمور ہیں۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ میرے آشنا ہیں، بہت ہی باشرم و باحیا ہیں۔ وطن توان کا شاہجہان آباد ہے، لیکن ایک مدّت سے مرشد آباد میں آکر رہے تھے، اور بعضے خدمتوں کے ساتھ سرکار میں ناظم بنگالہ کے اوقات بسر کرتے تھے۔ دیوان ان کا مورد اشتہار ہے، یہ اُن کا خلاصۂ افکار ہے +

وہ اگر آوے سر بام کہیں	میں بھی کرلوں اُسے سلام کہیں
کیا ہے یہ قطرہ قطرہ، دے ساقی	ایک باری تو بھر کے جام کہیں
اس شب وصل کی سحر اسے چرخ	لیو مت مجھ سے انتقام کہیں
یہ غزل عیش سے ہے تصدق سوز	مجھ سے ہوتی تھی الفرام کہیں

بابُ الفاء

۱- فقیر

فقیر تخلص، میر شمس الدین نام، متوطن شاہجہان آباد کے۔ اُستادوں میں سے شعرائے ہندوستان کے تھے۔ اہل ہند میں مجال کسی کی نہ ہوئی کہ سخن گستری میں مقام فیضی کے مانند خوش بیانی میں جگہ پر ان کے تکیہ کرسکے۔ دارالخلافہ شاہجہان آباد میں ہر روز زندگانی کا انھوں نے

نہایت غربت اور استغنا کے ساتھ بسر کیا ہے، اور اس عرصہ میں دکن کا بھی سفر کیا ہے۔ چنانچہ بیشتر دکن بطور سیاحت کے دیکھے، اور اکثر مقاموں میں سیر کی وضع پر پھرے۔ اقسام نظم میں کوئی قسم نہیں رہی کہ ان کے خامہ سحر آفرین نے اُس میں جادو کاری نہیں کی، اور انواع شعر میں کوئی نوع نہیں چھوٹی کہ ان کے کلک گوہر سلک سے اُس میں دُرر باری نہیں ہوئی۔ اکثر علوم میں کتابیں انکی تصانیف سے ہیں۔ خصوصاً عروض و قوافی میں کیا خوب رسالے تالیف کئے ہیں۔ سنہ ۱۱۱۷ھ گیارہ سو سترہ ہجری میں واسطے حج و زیارت کے تشریف لے گئے، بعد حصول سعادتِ زیارت کے جب کہ پھرے تو کشتیِ حیات اُس آشنائے بحر معنی کے گرداب ممات میں تباہی ہو کر ڈوبی یعنی اس ناخدائے جہاز سخندانی کے جہاز کو بادِ مخالف نے صدمۂ طوفان دیا، اور دریائے سقط[1] میں غریق بحر رحمت کیا۔ اگرچہ کہنا ریختہ کا اُس اہل کمال کا دون مرتبہ کمال تھا، لیکن اکثر واسطے تفنن طبیعت کے اس کا بھی اشتغال تھا۔ یہ گوہر آبدار اس بحر سخن سنجی کے آویزۂ گوش روزگار ہیں

دردمندوں سے نہ پوچھو کہ کدھر بیٹھ گئے
تیری مجلس میں غنیمت ہے جدھر بیٹھ گئے

ہے غرض دید سے یاں کام تکلف سے نہیں
خواہ ادھر بیٹھ گئے خواہ اُدھر بیٹھ گئے

دیکھا ہووے گا مرے اشک کا طوفاں تم نے
لاکھ دیوار گرے سیکڑوں گھر بیٹھ گئے

کس نظر ناز نے اُس باز کو بخشی پرواز
سیکڑوں مرغ ہوا پھاٹ کے پر بیٹھ گئے

کم ہے آواز ترے کوچہ کے باشندوں کی
نالہ کرتے سے گلے اُن کے مگر بیٹھ گئے

مفت اُٹھنے کے نہیں یار کے کوچہ سے فقیر
جب کہ بستر کو جما کھول کمر بیٹھ گئے

ولہ

آہ تو نے تو کئی بار ہلایا ہے فلک
زیادہ گستاخ نہ ہو عرش کو پہنچے کی دھمک

کل ہی کی شب کا ہے مذکور کہ جبریل آئے
خوب معلوم نہیں آپ تھا یا اور ملک

[1] آج کل باندھ بولتے ہیں ۔

۲۔ فغاں

فغاںؔ تخلص، اشرف علی خاں نام تھا۔ شاہ جہان آبادی۔ خلف میرزا علی خاں نکتہ کے۔ بآٹھ پہران کو خوش طبعی اور خوش اختلاطی سے کام تھا۔ کوکے تھے احمد شاہ بادشاہ کے، اور مربی گری سے فراغت کی ندیم تھے جہاں پناہ کے۔ چنانچہ ظریف الملک کوکے خاں بہادر حضور سے بادشاہ کے خطاب پایا تھا۔ اور مرتبہ کو شوخی کے ساتھ لطیفہ سنجی کے بہت دور پہنچایا تھا۔ دلّی سے مرشد آباد میں اپنے چچا کے پاس، کہ محمد ایرج خاں کر کے مشہور تھے، وارد ہوئے۔ لیکن نہ رہے، اور تھوڑے ہی دنوں میں پھر شاہ جہان آباد چلے گئے۔ بعد کئی برس کے عظیم آباد میں آئے، اور طور بود و باش کے وہاں ٹھہرائے رفاقت میں مہاراجہ شتاب رائے کے چند مدت اوقات کاٹے، اور لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی ہی میں دن رات کاٹے۔ اتفاقِ اصلاحِ سخن ان کو شیخ علی قلی ندیم تخلص سے ہوا ہے۔ نظم ریختہ میں طبیعت ان کی رسا ہے۔ سنہ ۱۱۸۶ گیارہ سو چھیاسی ہجری میں اس حباب کو دریائے فنا کے نزاعتما سمجھ کر آشنا بحرِ بے کنار بقا کے ہوئے۔ بلدۂ عظیم آباد اس شیریں کلام کا مدفن ہے، اور تلخی روز حشر تک اب وہیں مسکن ہے۔ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، غزلیں منتخب ان کے دیوان کی لکھی گئی یہاں ہیں +

شکوہ کرے ہے تو جو مرے اشک سرخ کا — تیری کب آستیں مری لوہو سے بھر گئی

وله

ہستی کے غنچے نظر آتے جو عدم میں — ہرگز کوئی اس خواب سے بیدار نہ ہوتا
اے شیخ اگر کفر سے اسلام جدا ہے — پس چاہئے تسبیح میں زنار نہ ہوتا

وله

مجھے تو تعزیہ دار اپنا کر گئے اپنے — کہ جو شفیق تھے وہ دوست مر گئے اپنے
عبث تو تڑپے ہے کنج قفس میں مرغ چمن — اسی تڑپ میں تو یہ بال و پر گئے اپنے
مرا مقام ہے اس سرزمیں پہ عاریتاً — اُدھر کو جانا ہے آخر جدھر گئے اپنے
کسے تو ڈھونڈھتا پھرتا ہے اے فغاں تنہا — کہ اس سفر کے مسافر تو گھر گئے اپنے

وله

شب فراق نہ تنہا مجھے رُلاتی ہے — یہ صبح وصل بھی آنسو سے منہ دھلاتی ہے

اگر میری زباں پہ بار دیگر انتظار آوے | ولہ | ابھی رونے پہ ظالم دل مرا بے اختیار آوے
دل زلف میں الجھا مجھے آرام یہی ہے | ولہ | میں صید بلاکش ہوں مرا دام یہی ہے
تار کی طرح کہیں زلف بتاں سے ٹوٹے | ولہ | یا الٰہی دل بیمار بلا سے چھوٹے
ضعیف ہے دل بیمار اس قرینے سے | ولہ | اٹک کے آہ نکلتی ہے میرے سینے سے

عشاق تیری گرمی بازار کر گئے | ولہ | اس جنس کو گراں یہ خریدار کر گئے

اٹھ چکا دل مرا زمانے سے | ولہ | اڑ گیا مرغ آشیانے سے
دیکھ کر دل کو مڑ گئی مژگاں | تیر خالی پڑا نشانے سے
ہم نے پایا تو یہ ستم پایا | اس خدائی کے کارخانے سے

غیر از دوئی کے مانع دیدار کون ہے | ولہ | وہ یار ہو گیا تو پھر اغیار کون ہے
بیم غضب رکھے ہے مجھے مغفرت سے دور | گر وہ کریم ہے تو گنہگار کون ہے
جاگا نہ کوئی خواب عدم سے کہ پوچھتے | آسودگانِ خاک میں بیدار کون ہے
میں مر گیا پہ آہ نہ پوچھا فغاں سے مجھ | درد جگر کسے ہے یہ بیمار کون ہے

۳۔ فرحت

فرحت تخلص شیخ فرحت اللہ نام۔ بیٹا شیخ اسد اللہ کا۔ اولاد سے قاضی مظہر کے، وہ قاضی مظہر کہ جانشین مرزا شاہ بدیع الدین مدار کے تھے۔ وطن بزرگوں کا ان کے ماوراء النہر ہے لیکن فرحت نے دِلّی میں پرورش پائی ہے، اور عاشق مزاجی و دلبستگی ہی میں عمر گنوائی ہے۔ ہمیشہ بند عشق میں مسلسل مویوں کے گرفتار، اور سدا درد عشق سے یگانہ خوبوں کے یار۔ شاعر کہن مشق و ہم صحبت شعراء نامدار۔ شاہ جہان آباد۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے لکھا ہے کہ یہ عزیز میرا اخلاص مند تھا، اور عسرت کا موردِ گزند تھا۔ جب کہ دلی سے مرشد آباد میں آیا، اور طور سکونت کا وہاں ٹھہرایا، جو مجھ سے ہو سکتا تھا خبر گیری ان حال گاہ گاہ ہوتا تھا۔ غرض بہت تنگی معیشت کے ساتھ عزیز

کا نباہ ہوتا تھا۔ آخر الامر ۱۱۹۱ھ گیارہ سو اکانوے ہجری میں اُسی بلدے کے اندر انتقال کیا، اور اس دارِ محن سے، خلاف اپنے تخلص کے بہت مغموم گیا۔ زبان ریختہ میں اُس نے بہت کچھ کہا ہے، یہ منتخب اُس کے دیوان کا ہے +

گذرے اگر چمن میں وہ گلعذار اپنا	ولہ	دیں چھوڑ بے کلی سے گل شاخسار اپنا
تاثیر آہ میں نے تالے میں ہے اثر کچھ		ہووے وہ آہ یارب کس طرح یار اپنا
جاوے کہیں بھڑک مت آتش سے دل کی میرے		رکھ دور مجھ سے دامن اے کوہسار اپنا
اُس شوخ نے یہ پوچھا فرحت سے کل کہ تو نے		اس طرح کیوں گنوایا صبر و قرار اپنا
انکھوں میں اشک بھر کر بولا نہ پوچھ ظالم		ہرگز نہیں ہے دل پہ کچھ اختیار اپنا

۴۔ فدوی

فدوی تخلص، میرزا محمد علی نام، معروف میرزا بچو، متوطن تھے اُس اجڑے نگر کے جو کہ مشہور شاہ جہان آباد، کر کے۔ نظم ریختہ میں اُستاد ہے۔ تلاش معنی میں فکر رسا رکھتے تھے، اور بیان حسن میں دل درد آشنا۔ علم موسیقی ہندی میں مناسبت بہت درست، اور تان کی سستی اور چستی کے جاننے میں نہایت چالاک و چست۔ چند روز انہوں نے اوقات مرشدآباد میں بسر کی ہے، لیکن اس سیر و تماشے کے ساتھ جو کہ وضع اہل نظر کی ہے۔ آخر شہر عظیم آباد میں سکونت کا اتفاق ہوا تو وضیع و شریف اس شہر کا ان کا مشتاق ہوا۔ فدویت میں معارف آگاہ شاہ گھسیٹا کے حاضر رہتے تھے، اور فیض صحبت سے اُس عرفان پناہ کے کسب علوم ظاہری اور باطنی کا کرتے تھے چنانچہ اُسی شہر میں اس کہن رباط مسافر کش ہستی سے دل اُٹھایا، اور ایوانِ مہمان دوست عدم میں اسباب سکونت کا بچھوایا۔ زبان ریختہ میں شاعر شیریں بیان ہے، یہ اُس کا منتخب دیوان ہے +

گر خاک پہ میری کبھی اے یار گذرنا	مت بھول کے ہرگز مع اغیار گذرنا
ایسا نہ ہو رندوں کی کزک ہو کہیں مندیل	میخانہ سے اے شیخ خبردار گذرنا

ضد دیکھیو خوباں کی کہ اک آن کی خاطر		مرجائے جو عاشق تو نہ زنہار گذرنا
اُس بو کے تصدق ہیں کہ اُس گل کی گلی سے		ہے بادِ صبا کے تئیں سو بار گذرنا
کل یار کے کوچہ کی طرف گذریگا فدوی		مت آج سے تو اُس طرف اغیار گذرنا
ہم کو تو وفا سے نہیں اے یار گذرنا	ولہ	پر تو بھی جفا سے نہ ستمگار گذرنا
تجھ کو نہیں آنکھوں کی قسم تیر نگہ سے		ٹک دل کو بچا سینے کے تو پار گذرنا
جب یار کے آگے سے چلے قافلہ دل کا		اے اشک تو ہو قافلہ سالار گذرنا
گر ننگ وحیا تم نہیں جانے تو نہ جاؤ		ہے مجھ کو تو اس کوچہ سے لاچار گذرنا
شاید نظر آجائے کبھو در پہ تو سو بار		فدوی کے تئیں ہو پسِ دیوار گذرنا
وہ کافر ہماری شب تار ہے	ولہ	جسے دیکھنا مہر کا عار ہے

بابُ القاف

۱ - قایم

قایم تخلص، شیخ محمد قایم نام، متوطن چاندپور ندینہ کے۔ نظم ریختہ میں استاد مسلم الثبوت تھے۔ ساتھ طبعِ بلند اور ذہنِ رسا کے موصوف، مضمون تراشی اور معنی بندی میں معروف۔ کہتے ہیں کہ ابتدائے عشق میں مشقِ سخن کا انہوں نے خواجہ میر درد تخلص سے کیا ہے، اور آخر سخن سنجی میں اتفاق اصلاح کا ان کو میرزا محمد رفیع سودا سے ہوا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بعد سودا اور میر کے کسی ریختہ گو کی نظم کا نہیں یہ اسلوب ہے، راقم آثم کو تو طوطی گویائی کا اس سخن آفرین کے نہایت مرغوب ہے۔ طوطی کو اقرار تلخ گفتاری کا سامنے اُس شیریں مقال کے، اور خامۂ مانی کو اظہار فرسودہ زبانی کا روبرو اُس نازک خیال کے۔ صفائے بندش سے اُس کی آئینہ کو طلب صفائی دوام، اور خجالت سے اُس کلام رنگین کے گل کو شکستہ رنگی سے کام۔ آبداری اُس نظم صفا پرور کی رشک افزا آب گوہر کی، اور موجزنی اُس طبع معنی خیز کی حسد انگیز چشمۂ کوثر کی۔ افسوس ہے ایسے شخص کا

اس جہان فانی سے اُٹھ جاتا، اور داغِ حسرت سے دلوں کو ارباب فہم کے جلاتا۔ اُس عندلیب شاخسار سحر بیانی نے شاید سنہ ۱۲۱۰ھ بارہ سو دس ہجری میں، اُدھر ہی نواح وطن میں اپنے، اس دار فانی سے سیر عالم باقی کی کی، اور عجب طرح کی ایذا جان کو اہل معنی کے دی۔ اگرچہ اقسام نظم میں کوئی منقسم اُس شیریں کلام سے نہیں رہی ہے، لیکن رغبتِ طبیعت کے ساتھ غزل اور مثنوی بیشتر کہی ہے۔ دیوان ان کا بھرا ہوا اشعار آبدار سے ہے، یہ ان کے منتخب افکار سے ہے ◆

دریا ہی پھر تو نام ہے ہر اک حباب کا — اُٹھ جائے گر یہ بیچ سے پردہ حجاب کا

ولہ
درد دل کچھ کہا نہیں جاتا — آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا
ہر دم آنے سے میں بھی ہوں نادم — کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

ولہ
یہ کہیو تو قاصد کہ ہے پیغام اسی کا — پر دیکھیو لینا نہ کہیں نام کسی کا
خوباں کی طرف دیکھنے کا بندہ ہوں میں قائم — ملتے ہیں کہیں نام ہے بدنام کسی کا

ولہ
بنی بھوں سی ڈرا چاہئے کہ کہتے ہیں — کرے ہے کاٹ سروہی سے بیشتر اونا

ولہ
جب تک کہ ہے توہم ہیں ترے ساتھ ہمیشہ — جوں موج کہ نت لازمہ ہے آب رواں کا

ولہ
عہدہ سے اُس صنم کے بر آیا نہ جائے گا — یہ ناز ہے تو ہم سے اُٹھایا نہ جائے گا
کعبہ اگر چہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ — کچھ قصر دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

ولہ
ہم سے ہر طرح ترے ہجر میں دل شاد کیا — ہچکی گر آئے تو سمجھے کہ ہمیں یاد کیا

ولہ
کہاں ہے شیشۂ مے محتسب خدا سی ڈر — مری بغل میں جھلکتا ہے آبلہ دل کا

ولہ
دل پا کے اُس کی زلف میں آرام رہ گیا — درویش جس جگہ کہ ہوئی شام رہ گیا

ولہ
میں اس چمن سی اور یہ مجھ سے چمن گیا — لے دل میں اپنے حسرت سرو چمن گیا
شیریں تو ساتھ خسرو کی گزری ذوق سے عیش — پتھر تھا تیری چھاتی پہ سو کوہکن گیا
ظالم تو میری سادہ دلی پر تو رحم کر — روٹھا تھا تجھ سی آپ ہی میں لو آپ ہی من گیا
روؤں گا زیر سایہ دیوار بیٹھ کر — جس دن تری گلی میں کوئی داد من گیا

وله
زلف دیکھی تھی کس کی خواب میں رات
ہم سحر تک تھے پیچ و تاب میں رات

خوب نکلے ہم اس کے کوچہ سے
ورنہ آئے تھے اک عذاب میں رات

لیک خالی سی کچھ لگے ہے بغل
دل گرا شاید اضطراب میں رات

وله
بھلا اے ابر مژگاں اب تو برس کر
ابھی تو کھل گیا تھا تو برس کر

وله
بے شغل نہ زندگی بسر کر
گر اشک نہیں تو آہ سر کر

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی
اس سے جو کوئی جیا سو مر کر

وله
کیوں کیا مجھ کو تو صیاد گرفتار قفس
میں نہ شائستۂ بسمل نہ سزاوار قفس

وله
جب سوچ پر اپنی آگئی چشم
دریا دریا بہا گئی چشم

وله
اب کے جو یہاں سے جائینگے ہم
پھر تجھ کو نہ منہ دکھائیں گے ہم

ہاں کیوں نہ ملیں گے تجھ سے ظالم
جب گالیاں نت کی کھائینگے ہم

آزردہ ہو غیر سے لڑو یہاں
اس عہدے سے کب بر آئیں گے ہم

ایسا ہی جو دل نہ رہ سکے گا
ٹک دور سے دیکھ جائیں گے ہم

جوں چاہیئے چاہ کا سرشتہ
قایم ہیں تو کر دکھائیں گے ہم

وله
نہ دل میں آب ہے نہ نم رہا ہے آنکھوں میں
کبھی روئے تھے سو خوں جم رہا ہے آنکھوں میں

میں مر چکا ہوں پہ تیرے ہی دیکھنے کے لئے
حباب وار ذرا دم رہا ہے آنکھوں میں

وله
میں کہا عہد کیا کیا تھا رات
ہنس کے کہنے لگا کہ یاد نہیں

وله
نگاہوں سے نگاہیں سامنے ہوتے ہی جب لپٹیاں
یکایک کھل گئیں دونوں طرف سے دل کی پھر کلیاں

وله
جب اسے غیر سے ہو نین کھلانے کا شوق
سرمہ کے واسطے بھیجے ہے صفاہان مجھ کو

وله
راہ کے بیچ جو رکھتا ہوں اسے گھیر کبھو
ہنس کے کہتا ہے کہ اب چھوڑ مجھے پھیر کبھو

وله
اتنی اے دیدۂ و دل مجھ پہ نہ بیداد کرو
دیکھیں کیا ہووے خدا کو تو ٹک اک یاد کرو

وله
کبھی دکھا کے کمر اور کبھی دہاں مجھ کو
نپٹ ہی تنگ کیا تو نے اے میاں مجھ کو

تو اپنے واسطے اے باغباں نہ کاوش کر		نپٹ ہے سایۂ دیوار گلستاں مجھ کو
جو کہ چہلیں تھیں سو ہائے گئیں وہ یار کے ساتھ	وله	سر پٹکنا ہی پڑا اب در و دیوار کے ساتھ
ایک ہم خار تھے آنکھوں میں سبھی کے سو چلے		بلبلو خوش رہو تم اب گل و گلزار کے ساتھ
میں ہوں دیوانہ سدا کا نہ مجھے قید کرو		جی نکل جائے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ
تھی شرط مجھے اس سے تو اک رات بسے کی	وله	کیا ہے کہ دل اس زلف سے ہرگز نہ بھر آیا
تیغ چڑھ اس کی سان پر آئی	وله	دیکھیں کس کس کی جان پر آئی
دہن کو تیرے پایا بات کہتے	وله	ہماری جزرسی میں کیا سخن ہے
دل ڈھونڈھتا سینہ میں مرے بو العجبی ہے	وله	یاں راکھ کا اک ڈھیر اور اک آگ دبی ہے
میں جاتا ہوں کعبہ سے اب دیر کو	وله	بھلا یہ بھی دیکھوں خدا کیا کرے
مردنِ دشوار میں یہ حال بے تقصیر ہے	وله	حسرتِ دل سو طرف سے اس کی دامنگیر ہے
قتل کرنے سے مرے تو بھی ہوا کچھ منفعل		غرقِ آبِ شرم میں اب تک دمِ شمشیر ہے
مر جایئے کسی سے پہ الفت نہ کیجئے	وله	جی دیجئے تو دیجئے پر دل نہ دیجئے
مرا کوئی احوال کیا جانتا ہے	وله	جو گذرے ہے مجھ پر خدا جانتا ہے
یاس میں تجھ غم کے میں اپنی بھی غم خواری نہ کی	وله	دل دیا تجھ کو تو میں نے کچھ گنہگاری نہ کی
دم بدم اس رنجش بیجا کو کیا کہتے ہیں شوخ		دل دیا تجھ کو تو میں نے کچھ گنہگاری نہ کی
بعد خط آنے کے اس سے تھا وفا کا احتمال		لیک وہاں تک عمر نے اپنی وفاداری نہ کی
دل مرا دیکھ دیکھ جلتا ہے	وله	شمع کا کس پہ دل پگھلتا ہے
گندمی رنگ جو ہے دنیا میں		میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہے
ہم نشیں ذکر یار کر کچھ آج		اس حکایت سے جی بہلتا ہے
گو ہم سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے	ول	کہنے کو بات رہ گئی اور دن گذر گئے
زاہد در مسجد پہ خرابات کی تو نے	وله	جی بھی یہی چاہے تھا کرامات کی تو نے

ایدھر تو میں نالاں ہوں اُدھر غیر نجل میں
اب کس سے مری جان ملاقات کی تو نے

مرا ہی تجھ کو کیا پیارا نہیں ہے
وله پر اتنا بھی تو نا کارہ نہیں ہے

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قایم
وله مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

کیا ہی ٹھٹھرا ہے یہ کہ جس کے حضور
وله آئینہ کی قلعی اُدھڑتی ہے
قایم آیا ہے پھر وہ بن ٹھن کر
دیکھیں کس کس کی یاں بگڑتی ہے

کیا پشم ہے دنیا کہ یہ ارباب نعیم
رباعی بے قرب کریں ہم کو دکھا کر زر و سیم
مسجد میں خدا کو بھی نہ کیجے سجدہ
محراب جو خم نہ ہو برائے تعظیم

مثنوی بردیہ

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید
ان دنوں چرخ پر نہیں ہے مہر
گو دمیں کانگڑی رکھے ہے سپہر
پانی پر جس جگہ کہ کائی ہے
سبز وہ شال کی رضائی ہے
دن کی گنتی بھر دھوپ میں اوقات
کالی کمل میں رات کاٹے ہے رات
چرخ کی اطلسی قبا ہے ہمیش
نہیں یہ کہکشاں ہے دانا گیش
ندی پر آکے بیٹھے جو بگلا
پروں سے اپنے اوڑھے ہے دگلا
برف کوچوں میں یوں پڑی ہے صاف
جوں کہ اُڑتا ہے پنبۂ نداف
کہرے کو دیکھ کہتے تھے سب یار
ٹھنڈی سی ہے فلک کے جی میں غبار
پر جو دیکھا ہے غور کریں آپ
نکلے ہے منہ سے آسماں کی بھاپ
باد چلتی ہے بسکہ تند اور سخت
روز و شب کانپتے رہے ہیں درخت
گرچہ سرما سے خاص و عام ہیں شل
پر کہوں کیا میں حال اہل دول
لپٹے رہتے ہیں روئی میں مجبور
جس طرح ناشپاتی و انگور

جاکے حلوائی کو جو دیکھو کہیں — بھنی چھٹ کچھ دکاں میں اس کے نہیں
قایم اب سردی کا ہے یہ نکو — شعر ہو گر خنک تو رکھ معذور

مخمس

شیخ تو تا بود ہووے یا ترا پندار نیست — بتکدہ ویراں ہوں یا ہوں برہمن یکبار نیست
کام کیا ہے مجھ کو گو ہوں راہب و پندار نیست — کافرِ عشقم مسلمانی مرا در کار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنار نیست

عاشقوں کے رونے کی کچھ اور ہی ہوتی ہے دھن — دیکھ ہم روتے ہیں لختِ دل جو جی چاہے تو چن
ہم نہ کہتے تھے تجھے ظالم کہ آ یہ بات سن — ابر را با دیدۂ گریانِ من نسبت مکن
نسبتِ باریدگی دارد ولے خونبار نیست

رباعی

دیکھ حال مرا اٹھا کے سو سو حیلے — ساتھی بھاگے ہر اک طرف کو جی لے
کہتی تھی جو کشش میں نہ چھوڑوں گی قدم — سو اس کے بھی ہو چکے ہیں کنّے ڈھیلے

۲۔ قدرت

قدرت تخلص، شاہ قدرت اللہ نام۔ ساکن شاہ جہان آباد کے۔ مشہور سخنوروں میں سے تھے رشتہ دار تھے میر شمس الدین فقیر کے۔ صاحب مذاق تھے چاشنیِ درد و تاثیر کے تکلم ریختہ میں ذہن رسا رکھتے تھے۔ خاطر سخن گستر اور طبع معنی آشنا رکھتے تھے۔ طرز مضمون آفرینی سے ماہر، ادراک شگفتگی و برجستگی کلام سے اُن کے ظاہر۔ اکثر فکر اشعار فارسی کی بھی کرتے تھے، لیکن تکلم ریختہ پر مرتے تھے۔ تلاش کرنے میں مضمون کے اپنے ہم عصروں میں ممتاز، اور صفائی میں بندش کی نازک خیالوں سے ہمدم کے دمساز تھے۔ وارستہ فراغی کے یار، اور آزادہ حالی سے سروکار۔ ایک مدت سے دلی کو چھوڑا تھا، امرا ولد و مرشد آباد تھے، اکابر اور اعزہ اُس شہر کے سب ان سے بر سر عنایت و امداد تھے۔ ملی ابرہیم

خلف مرحوم نے لکھا ہے کہ مجھ سے ان کو اخلاص اور اتحاد تھا۔ واقعی عزیز اپنے طبقہ کا اُستاد تھا۔ شاید سنہ ۱۲۰۵ بارہ سو پانچ ہجری میں اُسی بلدے کے اندر انتقال کیا۔ اور طبع کو صاحب طبعوں کے حد سے زیادہ پر ملال کیا۔ دیوان میں اُس صاحب قدرت کے ہر قسم کے اشعار ہیں۔ یہ غزلیں انکی منتخب افکار ہیں ◆

ہنگامۂ پرہیز و ورع اب بسر آیا | اے بادہ کشاں مژدہ کہ پھر ابر تر آیا
کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے | شاید تہِ مژگاں کوئی لختِ جگر آیا
غفلت میں کٹی شام جوانی تری صد حیف | پیری میں تو ٹک چونک کہ وقت سحر آیا

وله

ترے حضور میں جب قصدِ عرضِ حال کیا | ہجومِ گریہ نے میری زباں کو لال کیا
میں داغ تازہ میں توڑے یہاں تلک ناخن | کہ ایک بدر کا کاسہ پر از ہلال کیا
ہوا ہے اُس کے گلو میں گرہ دمِ اعجاز | ترے لبوں نے مسیحا سے کیا سوال کیا

وله

ٹوٹی کمند بخت کا وہ زور رہ گیا | جب بامِ دوست ہاتھ سی کچھ دور رہ گیا
اوپر سے زخم گرچہ ہرے ہو چلے ولے | ناسور تھا جگر میں سو ناسور رہ گیا

وله

مدتوں سے رخنۂ دل یہاں جو نت مسدود تھا | یک ذرا کھولا تو دیکھا خانۂ پُر دود تھا
کبریائی کا جو دیکھا میں نے جس جا پر ظہور | اپنی اپنی حد میں جو پشہ تھا اک نمرود تھا
حالِ قدرت پوچھتا ہے کیا تو ظالم مجھ سے سُن | اُس کے سائیں پر دعا کو آج ہی موجود تھا
آہ جو اُٹھتی تھی درد دل سے تھی لپٹی ہوئی | اشک جو گرتا تھا سو لختِ جگر آلود تھا

وله

بیتابیوں سے یہ دلِ بیتاب رہ گیا | اپنی طپش میں جل کے یہ سیماب رہ گیا
آنسو تھمے ہیں پر نہیں سوکھی ہے چشم تر | دریا اُتر گیا ہے یہ گرداب رہ گیا

وله

ہم پہ ایامِ مصیبت آج پھر آنے لگا | یار گھر جانے لگا ہی دوست گھر جانے لگا
جب مسیحا دشمنِ جاں ہوں تو کب ہو زندگی | کون رہ بتلا سکے جب خضر بہکانے لگا
مجھ کو غفلت نے خبر ایام فرصت کی نہ دی | آہ جب جانے لگے ہمدم تب میں پچھتانے لگا

کب تلک اے نالہ زیرِ لب رہیں گا تو گرہ		حوصلہ باقی نہیں بس جی تو گھبرانے لگا
دل سدا سینہ میں جلتا ہی رہا	ولہ	لختِ دل آنکھوں سے ڈھلتا ہی رہا
تو نے گر مجھ کو دلاسے میں رکھا		جی مرا تو بھی تو گھلتا ہی رہا
دل ہوا اسیرِ زلفِ سیہ خام رہ گیا	ولہ	صیدِ ضعیف مر کے تہِ دام رہ گیا
جب دیکھتا ہے مجھ کو تو دیتا ہے گالیاں		اپنے نصیب کا یہ اک انعام رہ گیا
آگے نہ چل سکا ترے کوچے کو چھوڑ کر		خورشید جا کے تا بہ لبِ بام رہ گیا
قدرت کس آسکے یہ کپٹری گی پسندگی		آنے سے اب تو نام و پیغام رہ گیا
آتش فروز دل جو تھا حسن شعلہ رو کا	ولہ	ہر اشک ہی شرارہ ہر آہ سے بھبوکا
ڈھونڈھے ہے ہوس اب کیا سینہ میں غم زدوں کے		مدت سے لٹ چکا یاں سامان آرزو کا
کشتہ ہوں جان و دل سے تیرے خدنگ کا میں		بحرِ کماں میں ہیگا پیاسا مرے لہو کا
تشنہ لب مرتا ہے نت موجِ دمِ شمشیر کا	ولہ	اے غرورِ ناز کچھ بھی فکر اس نخچیر کا
خوابِ غفلت لگ گئی تھی ان دنوں دل کو ابھی		آہ پھر کس نے یہ چھیڑا سلسلہ زنجیر کا
رنگِ خونِ کشتگاں جس جا سے اڑ سکتا نہیں	ولہ	ہوں اسیرِ ناتواں اس خاکِ دامنگیر کا
گھر سے جس وقت وہ غارت گرِ ایماں نکلا	ولہ	کفر سے گھر گیا دیں سے مسلماں نکلا
وہ دل جمع کر اٹھا جو بغل سے اپنی ہے		تو بزیرِ شکن زلف پریشاں نکلا
اس چشم سے ہو کے آب نکلا	ولہ	سینہ سے دلِ خراب نکلا
جو نالہ جگر سے پار نکلا		لے سیخ پر اک کباب نکلا
خط آیا و لے ہمارے خط کا		منہ سے نہ ترے جواب نکلا
بیت الحزن میں شب کہ ترا انتظار تھا	ولہ	کھٹکا ہر ایک دل کا مرے جی کے پار تھا
ادھر بھی ایک بار جفا کی عناں کو پھیر		دل ہے خدنگِ دوست جگر ہی نشاں طلب
دستِ بیدادِ ظلم سے تیرے ہیں جتنے ہم خراب	ولہ	اس قدر بھی ہووے گا عالم میں کوئی کم خراب

زخم سے دل کے ابھی اے چارہ گر رہتا ہی خلل ۔ مت ڈبوے بے فائدہ پھاے نہ کر مرہم غریب

وله

گھڑے رونا گھڑے سر کو پٹکنا ۔ خوشا ایام اوقات محبت

وله

ہرزہ گردی سے رہائی سے کیے چھوٹا ۔ پھر مجھے زنداں میں لے زنجیر کھینچ
جان ہے وابستہ اُس پیکاں کے ساتھ ۔ میرے پہلو سے نہ اپنا تیر کھینچ

وله

ذرا قفس سے قفس تو ملا کے رکھ صیاد ۔ کہ تا اسیر کریں مل کے ایک جا فریاد

وله

جہاں نظر پڑے پاؤں تلے ملے کاغذ ۔ سمجھ کے نامہ مرا ہاتھ میں نہ لے کاغذ
میں کیونکہ اُس کو لکھوں خط عجب اشک و آہ سے ہیہات ۔ ادھر جلے تو ادھر اُس طرف گلے کاغذ

وله

کسے بجز خون دل پیمانہ میں منظور ہی ساغر ۔ مری آنکھوں میں تجھ بن دیدۂ ناسور ہی ساغر

وله

آہ روے پاک تیرا کس طرح آوے نظر ۔ لخت دل جب چھا رہا ہو دیدۂ نمناک پر
یہ دل شوریدہ جیسے ساتھ ہو زیر زمیں ۔ شور محشر ہی رہا قدرت کی مشت خاک کو

وله

تجلی جلوہ چاہے تو صفائے سینہ پیدا کر ۔ اگر دیدار کا طالب ہے تو آئینہ پیدا کر

وله

ہے نالۂ شام آتش و آہ سحر آتش ۔ کیا زیست ہو اپنی ادھر آتش اُدھر آتش
جز داغ تدارک نہیں اس داغ جگر کا ۔ آتش کے جلے کو نہ کرے یہ جگر آتش
پھاہے کو اگر داغ سی چھاتی کے چھڑا دوں ۔ خاشاک کے پہلو میں چھپے آن کر آتش

وله

چل بسے دنیا سے بن دیکھے ترا دیدار حیف ۔ لے چلے حسرت بھرا یہاں سے دل افگار حیف
جرم پر تیری محبت کے ہمیں کرتے ہیں قتل ۔ حفظ جاں کے واسطے گر کیجیے انکار حیف

وله

مرگ پہلی ہی جب تلک آئے فراق ۔ ورنہ کیا جانوں کہ سر پر کیا بلا لائے فراق

وله

زخم پہلو نے نہ پائی آہ دل ناکام تک ۔ حیف پہنچا ہی نہ اپنا کار شوق انجام تک
صبح کے ہوتے ہی ہوے جس کی یہ حالت تباہ ۔ آہ وہ بیچارہ پھر جیوے گا کیونکر شام تک
کر چکا ہے کام اپنا یہاں تو درد انتظار ۔ جب تلک پہنچے ہے قاصد اُس [illegible] کام تک
ہم نہ کہتے تھے کہ مت مت چمن کی راہ چل ۔ لے گئی آخر ہوائے گل شکنج دام تک

وله
رنگ کچھ اور ہی بدلتا ہے مرا پیتا تب دل
ہے گھڑی آتش کا پرکالہ گھڑی سیماب دل

وله
گرے تھے آکے اس در پہ سمجھ کر اپنا مامن ہم
اگر تو سے نہیں راضی تو جاویں آہ کس کن ہم
ہوا یوں پھر گئی اس بزم کی اپنے نصیبوں سے
گنے جاتے ہیں اور سب دوست تیرے ایک دشمن ہم
شب ہجراں کو قدرت اس طرح ہم روز کرتے ہیں
کبھی سر کو پٹکتے ہیں کبھی کرتے ہیں شیون ہم

وله
جوں نقش قدم ہیں ترے وے خاک نشیں ہم
تا مست نہ چکیں آپ سے چھوڑیں نہ زمیں ہم
نسبت ہے ہماری تری جوں سایۂ خورشید
جس جا نہیں تو ہم ہیں جہاں تو ہے نہیں ہم

وله
گئے وہ دن کہ پلک ملتے یاں دریا بہے
اب بعد خون جگر چشم کو تر کرتے ہیں
تیرے جاں سوختہ خورشید قیامت کے تئیں
ہر سحر پنبۂ ناسور جگر کرتے ہیں
بھیج مت مرہم کافور تو قدرت کے حضور
یہ علاج اور ہی زخموں پہ اثر کرتے ہیں

وله
ابرو ترے کہتے ہیں کہ میں تیغ دو سر ہوں
عاشق کا یہ دعویٰ ہے کہ میں سینہ سپر ہوں
شایستۂ دنیا نہ سزاوار ہوں دیں کا
اے وائے میں قدرت نہ ادھر ہوں نہ ادھر ہوں

وله
دل سے کہا سناں نے کہ سینہ میں یاں رہوں
ناوک یہ پوچھتی ہے بھلا میں کہاں رہوں
قدرت بزیر خاک بھی آرام کب ملے
یہ درد و داغ ساتھ ہے میرے جہاں رہوں

وله
آگ اس داغ کو لگیو کہ نمک سود نہیں
پھوٹے وہ آنکھ جو لخت جگر آلود نہیں
مرحبا آتش دوری کہ جلایا ایسا
جل بجھے سر سے لے پاؤں تلک اور دود نہیں
زخم پر زخم لگے تب ہو تسلی دل کی
حوصلے پہ مرے اک زخم کچھ افزود نہیں

وله
شام کو دھوتا ہوں سو خون جگر سے آستیں
صبح خون آلودہ ہے پھر چشم تر سے آستیں
تو بھی کم ابر بہاری سے نہیں اے چشم تر
کر دے اب رشک چمن خون جگر سے آستیں
لخت دل اور اشک ہر گز خاک پر گرنے نہ دے
بھر لے اے قدرت تو اس لعل و گہر سے آستیں

وله
جنوں تیرے کے ناخن مگر گھس گئے ہیں
کہ عقدہ پڑا ہے بکار گریباں
ٹپکنے لگے اشک گلگوں مژہ سے
پھر آئی ہے فصل بہار گریباں

ولہ
قافلے کے قافلے اس رہ میں جوں نقش قدم
ہو گئے پامال تیرے حسرت پابوس میں

ولہ
بہ تذکر مرہم سے داغ سینہ پہ نور کو
کوئی بجھاتا ہے ارے ظالم چراغ نور کو

داغ نے دل کو مرے تنہا نہ چھوڑا ایک دم
زخم سینہ سے سدا الفت رہی ناسور کو

تب مزا دیوے گا قدرت زخم سینہ پر نمک
دے سر ناخن سے پہلے آشتی انگور کو

ولہ
نہ جا اس بزم سے ہرگز جھٹک مت طرف داماں کو
نہ دے برباد اے ظالم غبار خاکساراں کو

ہوا دستِ جنوں سے تار تار از بسکہ پیراہن
گریباں ڈھونڈتے ہے دامن کو اور دامن گریباں کو

ولہ
تم نے تو منہ چھپایا اس زلف عنبریں میں
یہ شام غم ہماری اب کس طرح سحر ہو

ولہ
جگر میں رکھتا ہے ابرو کماں کے نشاں کو
ہما چھیڑ پیوست ہے استخواں کو

گلو گیر ہے یاں تلک ناتوانی
کہ سینہ سے لب تک نہیں رہ فغاں کو

اڑائی ز بس خاک ماتم میں دل کے
کیا ہم نے آخر زمیں آسماں کو

ولہ
نوح کشتی سے خبردار کہ یاں چھاتی پر
مرہم تازہ ناسورِ کہن پھوٹے ہے

ولہ
کس کی نیرنگی یہ برق خاطرِ مایوس ہے
جو شرر دل سے اٹھا سو جلوۂ طاؤس ہے

صبر و طاقت تو کبھی کے کوچ یہاں سے کر گئے
اب وداعِ ننگ ہے اور رخصتِ ناموس ہے

قطعہ
کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
کیا ہی ملک روم و کیا ہی سرزمین روس ہے

سنتے ہی صحبت یہ بولی اک تماشا میں تجھے
چل دکھاؤں تو کہ قیدِ آز کا محبوس ہے

لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف
جس جگہ جان تمنا سو طرح مایوس ہے

مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے

پوچھ تو ان سے کہ جاہ و حشمتِ دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

کل تو قدرت پائے خم رکھتے تھے تسخیر ریا
آج رہنِ جام مے پر خرقۂ سالوس ہے

ولہ
سینہ اس کا ہے دل اس کا ہے جگر اس کا ہے
تیرِ بیداد جفا مرغ کہ یہ گھر اس کا ہے

اس گلی سے جو کوئی گذرے سو ہی سر گندے
دیکھ اس راہ نہ چل رہ گذر اس کا ہے

محنتِ دل نوکِ مژہ پر نہ سمجھ اے ہمدم
تخمِ غم دل میں جو بویا تھا ثمر اُس کا ہے

وله

نہ تھی تاب نگہ جب لگ گیا وہ دور آنکھوں سے
نہ ہونا چشم کا بہتر تھا ایسی کور آنکھوں سے

جہاں جاوے وہ نورِ دیدہ آنکھوں کے مقابل ہو
جدا ہوتے نہیں جاوے نگہ کو دور آنکھوں سے

زباں قدرت کی ضعفِ پیری سے اب بس ہو لکنت میں
اشارت بات کی کرتا ہے جوں رنجور آنکھوں سے

وله

کر اقلیمِ قناعت کا سفر تا تجھ پہ روشن ہو
کہ چشمِ مور سے بھی تنگ تر ملکِ سلیماں ہے

لبِ قدرت سے جز فریاد کچھ ریزش نہیں کرتا
یہ کچھ شاعر نہیں ہے اپنے دل کا مرثیہ خواں ہے

وله

نہ واقف کارواں سے ہوں نہ کچھ آگاہ منزل سے
گیا میں وادیٔ اُلفت کو لے اک جنبشِ دل سے

گئے وے دن کہ بہتے تھے پڑے نالے ان آنکھوں سے
سرِ مژگاں تلک اک اشک اب آتا ہے مشکل سے

کرے تو ذبح جب تک اس کو یہ مفت مرتا ہے
نہ ہو غافل ارے صیاد صیدِ نیم بسمل سے

وله

غنیمت بوجھ ملنے کو کہ یہ عالم اک افسوں ہے
کدھر فرہاد شیریں ہے کدھر لیلی و مجنوں ہے

تو کیا ساماں پوچھے ہے کہ تجھ بن کیونکہ گذرے ہے
یہ سر ہے اور زانو آستیں اور چشم پُرخوں ہے

وله

آساں نہ کٹے گی یہ جدائی کی جو شب ہے
مشکل ہے قیامت ہے مصیبت ہے غضب ہے

وله

دل پُر داغ ہے اور حسرتِ پابوسی ہے
دستِ اُمید ہے اور دامنِ مایوسی ہے

دلِ گم گشتہ خبردار کہ یاں سینہ میں
تیرِ بیداد سدا در پئے جاسوسی ہے

دمِ جاں بخش کی اُس کے جو پڑی ہے یہ دھوم
لبِ عیسیٰ نے مگر تیری زباں چوسی ہے

وله

جس جگہ جلوہ ترا مایۂ مدہوشی ہے
یاد میں اپنے اگر ہے تو فراموشی ہے

آہ یہ کون سی منزل ہے کہ رکھتے ہی قدم
نقشِ پا سے مرے سجدہ کو ہم آغوشی ہے

وله

سرگشتہ ترے لئے جہاں ہے
اے خانہ خراب تو کہاں ہے

جو زخم کہ ہو چکے نہ ناسور
وہ زخم نہیں وبالِ جاں ہے

قدرت ٹک کھول چشمِ عبرت
گر فکرِ سراغِ رفتگاں ہے

جو نقشِ قدم ہے اس زمیں پر
آئینۂ حالِ رہرواں ہے

اشک اب آنسو سی کچھ تھم رہے ہے	ولہ	لختِ دل مژگاں پہ شاید جم رہے ہے
ابتو اس منزل سے نہیں اٹھتے قدم		ہمرہاں آگے چلو تم ہم رہے ہے
ہر آن اک ستم ہے ہر لحظہ اک جفا ہے	ولہ	کوچہ ترا ہے ظالم یا دشتِ کربلا ہے
ملتا نہیں کسی سے اس پر ہمکو کیا مصیبت		یارب یہ دل ہمارا کس سے جدا ہوا ہے
ہو گرد باد جیدھر ہم کو ادھر ہے جانا	ولہ	صحرا میں گمرہوں کا یہ خضر رہنما ہے

باب الکاف

۱۔ کلیم

کلیم تخلص، شیخ محمد حسین نام۔ شاہ جہان آبادی۔ مشہور سخنور ہے دلی کا، معتقدان تمیزوں میں میر تقی میر تخلص کے تھا۔ ایک رسالہ عروض و قافیہ کا اس نے زبان ریختہ میں لکھا ہے، اور فصوص الحکم کا ترجمہ بھی زبان ہندی میں کیا ہے۔ ایک نثر اور بھی رنگین زبان ریختہ میں ریختۂ قلم معنی رقم رکھتا ہے۔ لیکن باوصف اس خوش گوئی کے کلام مشہور بہت کم رکھتا ہے۔ عہد دولت میں احمد شاہ بن فردوس آرامگاہ کے ایام اس کے شعر و شاعری کا تھا، اور زمرۂ پروانانِ شاہ جہان آباد کے ساتھ ہم صفیر و ہم نوا تھا۔ چنانچہ دلی ہی میں اس خرابۂ دارِ فانی سے گذرا، اور مقیم بیت المعمور کاشانۂ باقی کا ہوا۔ صاحبِ دلِ متین اور شاعر شیریں بیان تھا۔ یہ اس کلیم طور سخندانی کے کلام سے ہے:

کورِ دیدۂ رضواں کو میں اک آن میں دیکھا	ولہ	جب گل کی طرح جھانک گریباں میں دیکھا
لگتی ہے اب تو قلقلِ مینا سی دل کو ٹھیس	ولہ	وے دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا
قبر میں بھی لئے ہمراہ گیا اپنے کلیم	ولہ	آہ کیوں دردِ دل اپنا نہ کسی کو سونپا
رکھتا ہے زلف یار کا کوچہ ہزار پیچ	ولہ	اے دل سمجھ کے جائیو ہے راہ مار پیچ
ہو چکا حشر گئی دوزخ و جنت کو خلق	ولہ	رہ گیا میں ترے کوچے میں گرفتار ہنوز

پوچھ مت غم کی داستاں اے دل	وله	گر پڑا ٹوٹ آسماں اے دل
پیری کی بھی سیر کر گئے ہم	وله	اس پل سے بھی بس گذر گئے ہم
واں غصہ ہوئے رقیب پر تم		یاں مارے ادب کے مر گئے ہم
بات اُس کی زبان پر آئی	وله	پھر خرابی جہان پر آئی
غرورِ حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہنچے	وله	غرض ہم سُن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے
اُس کے ابرو کی اگر تصویر کھینچا چاہئے	وله	اوّل اپنے قتل پر شمشیر کھینچا چاہئے
عرق ہی منہ پہ ترے یا گلاب ٹپکے ہی	وله	عجب ہے مجھ کو کہ شعلہ سے آب ٹپکے ہی
تجھے میں آنکھوں میں کیونکر رکھوں کہ ہی برسات		پھر ایسا گھر کہ یہ خانہ خراب ٹپکے ہے
گلرو تو چمن میں اپنی سے نہ گیا	رباعی	یہ دل بھی کلی سے بے کلی سے نہ گیا
جو کوئی گیا دل کو گیا چھوڑ یہاں		دل سے تو کوئی تیری گلی سے نہ گیا
دنیا کے ہاتھ سے جو دل ریش ہیں ہم	رباعی	اس واسطے یاں عاقبت اندیش ہیں ہم
دنیا داری و نوکری محنت و کسب		جب کچھ نہ بنا کما کہ درویش ہیں ہم

بابُ اللّام

۱۔ لُطف

لطف تخلص مرزا علی نام۔ راقم ہے اس چند اوراق پریشان کا، کہ مانند نامۂ اعمال اپنے کے سیاہ کئے۔ اور اسمِ گرامی والد بزرگوار کا اس خاکسار کے کاظم بیگ خاں ہے متوطن استرآباد شجاعت بنیاد کے ہیں۔ سنہ ۱۱ گیارہ سو چون ہجری میں نادر شاہ کے ساتھ شاہ جہان آباد میں تشریف لائے اور ابوالمنصور خاں صفدر جنگ کی وساطت سے، کہ آپس میں معرفت ولایت کی تھی ہمصدر عنایات بادشاہی ہوئے۔ آگے بیان امورات دنیوی باعث ہی طول کلام کا، اور وہ معاملہ دیکھا ہوا ہے خلص

...عام کا۔ بہرحال غزل فارسی کے کہنے میں حضرت کو ید طولیٰ تھا، اور ہجری تخلص آپ کا تھا۔ اس تذکرہ
...میں اشعار ہندی کا التزام ہے، اس سبب سے یہاں لکھا نہیں گیا آپ کا کلام ہے۔ اصلاح فارسی
...کی اس ہیچمدان کو آپ ہی کی جناب سے ہے، اور مشورہ ریختہ کا فقط اپنی ہی طبع ناصواب سے۔ یہ خذف
...ریزے کتنی ایک کہ سراب گاہ طبع ناقص کے فراہم ہوئے تھے، عرضِ خدمت ارباب معنی کے
...کئے جاتے ہیں●

پاسِ ناموسِ محبت فرض ہے پروانہ وار
شمع ساں سوزِ شبِ ہجراں زباں پر لائیں کیا

بلبل و گل میں وہ جوشش سرو قمری میں یہ ربط
گلستانِ دہر میں ہم دل کو تئیں الجھائیں کیا

غیر لبریز شکایت ہے مری جانب سے آج
سُن کے میرے قدرداں اب دیکھئے فرمائیں کیا

چمن کو گل جو تری مے کشی کا دھیان آیا
ہر ایک پات کے کھڑکے پہ گل کا کان رہا

رہا جو زندہ شبِ تیرۂ فراق میں قیس
سیاہ خیمۂ لیلیٰ کا اُس کو دھیان رہا

جو عمرِ خضر ہو شاید تو وصل ہووے نصیب
یہ زندگی جو تھی اس میں تو امتحان رہا

نہ آنکھ بھر کے کبھو ڈر سے ہم تو دیکھ سکے
وہ سامنے بھی اگر اپنے ایک آن رہا

نہ کر اے بلبلِ دل سوختہ صیاد کا شکوا
کہ جاں بازوں کے دیں میں کفر ہی جلّاد کا شکوا

نہیں شیریں پہ کچھ موقوف یہ قسمت کی خوبی ہے
زبانِ تیشہ سے کوئی سُنے فرہاد کا شکوا

میں اپنے سروقامت سے ہی کیا شاکی تھا گلشن میں
تسلی ہو گئی قمری سے سُن شمشاد کا شکوا

نہ تنہا میں ہی اپنی خانہ ویرانی کا شاکی ہوں
کرے ہے اک جہاں اُس خانماں آباد کا شکوا

ترے کانوں تلک بھی لطف کچھ آواز آتا ہے
ہے اک عالم کو تیرے نالہ و فریاد کا شکوا

ولہ

ایک دن حالِ دلِ زار نہ دیکھا نہ سُنا
سچ تو یہ تجھ سا بھی دلدار نہ دیکھا نہ سُنا

دیکھ کل نبض مری رو کے لگا کہنے طبیب
کبھی میں نے تو یہ آزار نہ دیکھا نہ سنا

وہ مجھے تم نے دکھایا ہے کہ یعقوب نے جو
کبھی اے دیدۂ خونبار نہ دیکھا نہ سُنا

لختِ دل کرتا ہے کیا کیا صفِ مژگاں پہ نمود
اس جواں سا بھی نمودار نہ دیکھا نہ سُنا

چشم اور گوش زمانہ ہیں مقر اُس کی لطف
ثانیِ حیدرِ کرّار نہ دیکھا نہ سُنا

ولہ

ہے شناس شدت سی رنگینیِ کہئے یار کا چرچا
کہ بھولا عندلیبوں کو گل گلزار کا چرچا

ڈھکا رہ جائے اسرارِ محبت تو غنیمت ہے
ہوا ہے اب حکیموں میں مری آزار کا چرچا

برنگِ پیکرِ تصویر رہتا ہوں سدا ساکت
ہے اس پر اُس کی محفل میں مری گفتار کا چرچا

رہیں ہے یار کی چرچے سے یہ فرصت کہاں ہم
کہ اب دن رات بیٹھے کیجئے اغیار کا چرچا

بیانِ ہندو دل کس لطف سے کرتے ہیں لطف افسوس
جو ہوتا بزم میں اُس کی بھی اشعار کا چرچا

نہ ہے غفلت کہ ہم دنیا کو بزمِ عیش سمجھے تھے
کھلی چشمِ حقیقت میں تو کامِ اژدہا نکلا

نہ کرے لطف ناحق رہروانِ دہر سی حجت
یہی رستہ تو کہا کرچکے ہے کعبہ کو جا نکلا

ولہ

از بس نہ ہوا ہم سے سرانجامِ محبت
شرماتا ہے دل لیتے ہوئے نامِ محبت

فرہاد سا نہ رنگ نہ مجنوں سا کیا حال
کس مُنہ سے اُسے بھیجئے پیغامِ محبت

ولہ

کیونکر نہ بھلا ہمدم ہو زندگی اب مشکل
ہیں دل میں تو سو باتیں ہو جنبشِ لب مشکل

اک آہ کے کرنے کو سو چاہئیں تمہیدیں
کس سی کہیں حالِ دل ہے آہ عجب مشکل

وہ لاکھ بہانے ہوں نت روئے وہ آنسو
دو دن کا ہوا جینا ہم کو تو غضب مشکل

ولہ

یاروں نے یہ تو کہنی کیا کیا بھائیاں ہیں
بے وجہ کچھ نہیں یہ ہم سے لڑائیاں ہیں

میں کیا ہوں باختہ رنگ اُس شعلہ رو کی آگے
مہتاب کے بھی منہ پر چھٹتی ہوائیاں ہیں

اک جوئے شیر بہہ لے اے آفریں ہے فرہاد
کیا بے ستوں میں خوں کی نہریں بہائیاں ہیں

کب غنچۂ دل اپنا واشد صبا ہو تجھ سے
گو سیکڑوں گلوں کی عقدہ کشائیاں ہیں

طاقت حباب ساں اک نظارہ کی ملی ہے
ان فرصتوں پہ ظالم یہ خود نمائیاں ہیں

کعبہ سے ہم نہ واقف نہ بتکدہ سی آگاہ
یہاں آستانِ دل ہے اور جبہ سائیاں ہیں

اُس قد کا سرو سی ذکر کچھ نامناسب ہے بری بات
غنچہ کو دل بے ڈھب باتیں بنائیاں ہیں

ہے لطف اس غزل پر کہنا بقولِ سودا
یہ عاشقی نہیں ہے زور آزمائیاں ہیں

او میاں تیغ والے اور اک زخم — کب سے ہم ایڑیاں رگڑتے ہیں
برنگ گل جس نمط خزاں میں جھڑیں — لخت دل یوں مژہ سے جھڑتے ہیں
بس عزم یار اب خبر جلدی — ورنہ اب یار ہی نبڑتی ہیں

وله

تم جو بزم عیش سے ہو وہاں اور صحبت دلبریاں — ہم ہیں کنج غم میں یہاں اور جان سی بیزاریاں
تم کو سیر باغ و گلگشت چمن کا واں ہے شوق — یاں بدن پہ ہے ہجوم داغ سے گلکاریاں
دھیان ہے آرایش زلف پریشاں کا تمہیں — یاد ہیں حال پریشاں کی ہے کچھ خواریاں
تم صفاء ساعد و بازو دکھاتے ہو وہاں — ہم پہ یاں موئے بدن کرتے ہیں نشتر زنیاں
تم تو دکھلاؤ وہاں پیٹ اور چوٹی کی پھبن — یاں مری چھاتی پہ ہیں کالے سے لہریاں
نیک و بد دونوں سے یہاں ہم نے تو آنکھیں موندلیں — تم وہاں چتون کی دکھلاتے ہو جادوگاریاں
یہاں برنگ پیکر تصویر ہم خاموش ہیں — گفتگو کی تم دکھاتے ہو وہاں طراریاں
قہقہے تم مارتے ہو واں بآواز بلند — دشمنوں سے یہاں چھپا کر ہم ہیں کرتے زاریاں
ہر مریض غم کی جان بخشی کا ہے تم کو دھیان — کھنچ گئیں یاں طول شدت سے مری بیماریاں
اضطراب دل سے بے پردہ ہوا یہاں راز عشق — سوجھتی ہیں وہاں تمہیں ہر بات میں تہ داریاں
کیا کسی سے بات کیجے بھولتے اک دم نہیں — ان بھلاؤں سے وہ باتوں میں تری عیاریاں

وله

نہیں یہ شیشہ مست ای محتسب بجا دمومیں — دھرا ہے آبلۂ دل ہمارے پہلو میں
کب اپنی چشم میں طوفان نوح کو ہو قدر — نہاں ہے یہاں وہی عالم ہر ایک آنسو میں
اگرچہ فرق زمیں آسماں کا ہے تاہم — ملے ہے وضع فلک کی بہت تری خو میں

وله

غبار بیکسی سے کیا ضرر پاکیزہ جوہر کو — کہ ہے خشت جلا گرد یتیمی آب گوہر کو
کند جا سر سے مانند قلم گر ہے سر شاہی — نہ آساں سمجھیو پانا سیہ بختی افسر کو
کبھی تو خاکساروں کا بھی غم خانہ کرو روشن — نہیں گو کچھ بھی نقش بوریا تو ہو گا بستر کو
چھلکتا عمر کا اک دم میں پیمانہ ہے ای ساقی — وفا دشمن شتابی کر خدا لبریز ساغر کو

پھر مجنوں کا دل سنگِ ملامت سے نہ مرنے تک — ٹھرا ہی چاہیئے بحر جنوں میں بار لنگر کو
کیا ہم نے تو ترک مدعا کو مدعا اپنا — خدا توفیق بخشے نیک چرخ سفلہ پرور کو

وله
نہیں معلوم کیا اس سینۂ سوزاں میں پنہاں ہے — کہ ہر تارِ نفس جوں رشتۂ شمع آج سوزاں ہے
نہ میں فرہاد ہوں ای عشق نہ مجنونِ دل خستہ — مرا پھر منتظر تیرا تو کیوں کوہ و بیاباں ہے
تری طرزِ سخن پہنچی کہیں اے لطف گلشن میں — ترے انداز سے بلبل چمن میں اب غزل خواں ہے

وله
جس دن سے ہم جنوں کے ہیں داماں لگے ہوئے — دامن کی جا یہاں ہیں گریباں لگے ہوئے
اللہ رے قید خانۂ ہستی کہ دم کے ساتھ — ہر اک قدم پہ لاکھوں ہیں زنداں لگے ہوئے
رویا میں دیکھ مرقد مجنوں کو دھاڑ مار — تھے جائے گل درختِ مغیلاں لگے ہوئے
باسے چھوٹا اسیرِ بلا اس گلی میں آج — ہیں تو وہ ہائے گنج شہیداں سے لگے ہوئے
بیمار کا چرے تو کھلا حال بعد مرگ — سینے میں زخم تھے کئی پنہاں لگے ہوئے
یارانِ پیش رو ذرا ٹھیرو کہ جوں جرس — ہم پیچھے پیچھے آتے ہیں نالاں لگے ہوئے
سلکہ سوچ کر قدم مرے وادی میں گرد باد — پاؤں سے اپنے ہیں یہ بیاباں لگے ہوئے
کوئی تو میرے ناصحِ دانا سے یہ کہو — دل چھوٹتے ہیں باتوں میں ناداں لگے ہوئے
کیا دن تھے وہ بھی لطف کہ رہتے تھے مثلِ زلف — کانوں سے اس کے ہم بھی پریشاں لگے ہوئے

وله
خورشید کی بھی آنکھ فلک پر جھپک گئی — ٹک جو گرہ نقاب کی اس کے سرک گئی

وله
سب کنارہ گیر اپنے اور بیگانے ہوئے — اب کی فصلِ گل میں ہم بے طرح دیوانے ہوئے
شہر میں پایا نہ تیرے جور سے شہرا کہ اب — گھر بہ گھر ظالم مرے مذکور افسانے ہوئے
بزم میں آیا جو شب وہ گل رخِ خوں شمع سے — بلبلوں کی طرح جی دینے کو پروانے ہوئے
سنتے ہیں کی محتسب نے بیعتِ دستِ سبو — مژدہ مے نوشاں کہ پھر آباد میخانے ہوئے
تو تو کس کا آشنا ہے ہاں مگر کہنے کو ہم — آشنا ہو تجھ سے اک عالم سے بیگانے ہوئے

وله
روشن ضمیر کیونکہ نہ ہوں دل کے داغ سے — خورشید کو ہے کسب ضیا اس چراغ سے

وہ خود فروش آگیا بارے چمن میں کل
بوئے خودی نکل گئی گل کے دماغ سے
ہووے فضائے ہستیِ موہوم کا بُرا
کُنجِ عدم میں کاٹتے تھے کس فراغ سے
اُس گلبدن بغیر ہمیں سیرِ باغ میں
صوتِ ہزار کم نہیں فریادِ زاغ سے
جس دل زدے کو نغمۂ بلبل ہو بانگِ زاغ
کیا خاک وہ شگفتہ ہو گلگشتِ باغ سے

وله

دیکھنا جن صورتوں کا شکل تھی آرام کی
اُن سے ہیں مسدود راہیں نامہ و پیغام کی
رخصت ای اہلِ وطن اب ہم ہیں اور آوارگی
حق رکھے بنیاد قایم گردشِ ایام کی
پاؤں نے اُن تنگ کوچوں کی فضا صحرا کی دیکھ
ہر قدم پر جان ماری ہے دلِ ناکام کی
گردشِ چشمِ بتاں کے بسکہ ساغر نوش تھے
گردشِ گردوں کو ہم کہتے تھے گردش جام کی
جب سے کھینچا لطف رنجِ فرقتِ یار و دیار
اب ہوئی معلوم محنت گردشِ ایام کی

کیوں دل پھر سے جادو اُن آنکھوں کا نہ چل جائے
جس پر کہ پڑے آنکھ سو دیوانہ سا بن جائے
پلکیں وہ نکیلیں کہ نظر جب پڑے اُن پر
سینہ میں یہ عالم ہو کلیجہ کا کہ چھن جائے
بے چین بہت لطف کی ہے کل سے طبیعت
اللہ کرے آج وہ روٹھا ہوا من جائے

وله

کیا سبب بتلائیں ہنستے ہنستے باہم رک گئے
خود بخود کچھ وہم کچھ اودھر اِدھر ہم رک گئے
دیر تک ضبطِ سخن کل اُس میں اور ہم میں رہا
بول اُٹھے گھبرا کے جب آخر کے تئیں دم رک گئے

وله

اِدھر سے جتنی یگانگت کی اُدھر سے اُتنی ہوئی جدائی
بڑھائی تھوڑی سی جب اُدھر سے بہت سی تم نے اِدھر گھٹائی
نہ ہم سے بگڑو نباہ دو جی نہیں ہے کچھ تم کو دھیان اس کا
کہے گی خلقت کہ ہو چکی بس وہ دیکھو دو دن کی آشنائی

رباعی

جنت سے کہے بزم مری بو دیکھو
یوں جام کہے جم سے کہ مجھ کو دیکھو
ہر آئینہ آئینہ محل کا تیرے
کہتا ہے سکندر سے کہ منہ تو دیکھو

رباعی

منہ تکتی ہیں کیا صاحبِ تاج و دیہیم
جو خاک نشینوں کے تئیں جانے سقیم
ہم تک اُٹھا دیکھیں نہ گردوں کی طرف
گر خم نہ ہو ماہِ نو برائے تعظیم

باب المیم

میر

میر تخلص، نام نامی اس نگین خاتم سخن آفرینی کا میر محمد تقی ہے، متوطن اکبر آباد کے سراج الدین علی خاں آرزو تخلص آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دو سے تھے۔ ابتدائے سن شعور سے پرورش انہوں نے دار الخلافہ شاہ جہان آباد میں پائی ہے، اور خان مذکور کے فیض صحبت سے تکلم ریختہ کی کیفیت باریکیوں کے ساتھ اٹھائی ہے۔ تازگی مضمون کی اور علو معانی کا بیان سے ان کے ظاہر ہے، فی الحقیقت کہ شاعر مذکور لطافتوں سے ریختہ کی بخوبی ماہر ہے۔ جو شخص کہ نظارہ گاہ سخن میں چشم خوردہ بیں رکھتا ہے، اور چاشنی خرد سے امتیاز ذائقہ تلخ و شیریں رکھتا ہے۔ تو وہ اس بات کو جانتا ہے، اور اس رمز کو پہچانتا ہے۔ کہ میر شیریں مقال میں، اور ریختہ گویان سابق و حال میں، نسبت خورشید و ماہ ہے، اور فرق سفید و سیاہ ہے۔ بلکہ حجاب اگر مانع نہ ہو بیان کا، تو تفاوت ہے زمین اور آسمان کا۔ غرض اس تردد سے زبان قلم کی، اور اس خراش سے عارض رقم کی، مرادیہ ہے کہ نا قدر دانی سے اغنیا کی، اور نا سمجھی سے اہل دنیا کی، اب بازار سخن سازی اس درجہ کاسد ہے، اور ہوائے شہرستان معنی طرازی اس مرتبہ فاسد، کہ میر سا شاعر جو کہ سحر کاری سخن میں طلسم ساز ہے خیال کا، اور جادو طرازی بیان میں معانی پرداز ہے مقال کا، وہ نان شبینہ کا محتاج ہے، اور بات کوئی نہیں اس کی پوچھتا آج ہے۔ جس ایام میں کہ درخواست صاحبان عالی شان کی زبان دانان ریختہ کے مقدمہ میں کلکتے سے لکھنو کو گئی، تو پہلے کرنیل اسکاٹ صاحب کے روبرو تقریب میر کی ہوئی، لیکن علت پیری سے یہ بیچارے عجول کے محمول ہوئے، اور جوانان نومشق مربی گری سے قوت بدنی کے مقبول ہوئے۔

زمانہ خوش طبیعتوں سے کبھی نہیں خالی ہے، اکثر اہل لکھنو پکارتے تھے کہ کلکتے میں شاعری کی جا درخواست خالی ہے، کس واسطے کہ یہ جانتے سب اہل تمیز ہیں، کہ آج بھی بوڑھے کے سامنے

نوجوان خوب کے میں مور رہیں۔ اب بھی جو بوجہ تمکنتِ معنی کا جرِ ثقیل طبع سے ترازو کرکے وہ دکھلاتا ہے جوان اگر کوہ بو قبیس ہے تو تحمل سے اُس کے کمر چراتا ہے۔ بہر تقدیر غرض جب میرزا محمد رفیع سودا بلدۂ لکھنؤ میں اس دار فانی سے عالم باقی کو سدھارے، تو میر مذکور شاہ جہان آباد میں تھے ۱۱۹۷ھ گیارہ سو ستانوے ہجری میں رایات عزم اس صاحب لشکر مضامین تازہ کے حرکت میں آئے، اور خود بدولت لکھنؤ میں تشریف لائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے روزِ ملازمت خلعتِ فاخرہ دیا، اور تین سو روپے مشاہرہ مقرر کرکے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کیا۔ اگرچہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی، لیکن تنخواہ میں کبھی نہ قصور رہا۔ اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد وزارت میں آج کے دن تک، کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، وہی حال ہے، جو اوپر مذکور ہوا۔ اقسامِ نظم میں یہ صدر نشین بارگاہِ سخندانی ہر قسم چکیدۂ خامۂ معجز نما رکھتا ہے، لیکن سچ تو یہ ہے کہ نظمِ غزل میں ید بیضا رکھتا ہے۔ قصیدہ تو ختم میرزا محمد رفیع سودا پر ہوا، ہاں طرزِ مثنوی کی بھی ان کی بہت خوب ہے، خصوصاً دریائے عشق، جوان کی مثنوی ہے، اک جہان کے مرغوب ہے۔ یہ رہنما قوم سخن سرمایہ گان کا مالک چار کتاب پر دلیل و برہان ہے یعنی صاحبِ چار دیوان، خوش بندش خوش بیان ہے مثنویاں بھی متعدد ان سے ثبتِ جریدۂ روزگار ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخبِ افکار ہیں +

اس دور میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو اُن نے مروت کو کیا ہوا

امیدوارِ وعدۂ دیدار مر چلے
آتے ہی آتے یارو قیامت کو کیا ہوا

ولہ

چمن میں گل نے جو کل دعوئے جمال کیا
جمالِ یار نے منہ اُس کا خوب لال کیا

بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو
چمن کو یُمنِ قدم نے ترے نہال کیا

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے
جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

ولہ

بیتاب جی کو دیکھا دل کو کباب دیکھا
جیتے رہے تھے کیوں ہم جو یہ عذاب دیکھا

دل کا نہیں ٹھکانا حالت جگر کی کم ہے
تیرے بلا کشوں کا ہم نے حساب دیکھا

لیتے ہی نام اُس کا سوتے سے چونک اُٹھے — ہے خیر میر صاحب کچھ تم نے خواب دیکھا

ولہ

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
خراب رہتے تھے مسجد کے آگے بت خانے — نگاہِ مست نے ساقی کے انتقام لیا
وہ کج روش نہ ملا راستے میں ہم سے کبھو — نہ سیدھی طرح سے اُن نے مرا سلام لیا

پیغام غم جگر کا گلزار تک نہ پہنچا — نالہ مرا چمن کی دیوار تک نہ پہنچا
اُس آئینہ کے مانند زنگار جس کو کھا جائے — کام اپنا اُس کے غم میں دیدار تک نہ پہنچا
لبریز شکوہ تھے ہم لیکن حضور اُس کے — کارِ شکایت اپنا گفتار تک نہ پہنچا
مستوری خوبروئی دونوں نہ جمع ہوویں — خوبی کا کام کس کے اظہار تک نہ پہنچا
یوسف سے لے کے تا گل پھر گل سے لے کے تا شمع — یہ حُسن کس کے لے کے بازار تک نہ پہنچا

ولہ

گل کو محبوب میں قیاس کیا — فرق نکلا بہت جو پاس کیا
صبح تک شمع سر کو دھنتی رہی — کیا پتنگے نے التماس کیا

ولہ

ہم خاک میں ملے تو ملے لیکن اے سپہر — اُس شوخ کو بھی راہ پہ لانا ضرور تھا
کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر پڑا جو میر — یک سر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُر غرور تھا

ولہ

دل سے شوقِ رخِ نکو نہ گیا — جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا

گذرا بنائے چرخ سے نالہ پگاہ کا — خانہ خراب ہو جیو اس دل کی چاہ کا
آنکھوں میں جی مرا ہے اِدھر دیکھنا نہیں — مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا
یک قطرہ خوں ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا — قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

ولہ

سر سے باندھا ہے کفن عشق میں تیرے یعنی — جمع ہم نے بھی کیا ہے سر و ساماں یکجا

ولہ

دل پہنچا ہلاکت کو بہت کھینچ کسالا — لے یار مرے سلمہ اللہ تعالیٰ
گذری ہے لہو وہاں سر ہر خار سے اب تک — جس دشت میں پھوٹا ہے مری پاؤں کا چھالا

دل کے جاتے کا نہایت غم رہا		غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی		ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا
تجھ کو میرے حال سے تھی آگہی		نالۂ شب سب کو خبر کر گیا
یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ		نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا
کلہ سرکشاں جہان میں کھینچا تھا ہم نے میر		پایانِ کار مور کا خاک قدم ہوا
دل و داغ ہے اب کس کو زندگانی کا		جو کچھ کہ یہاں ہے سو افسوس ہی جوانی کا
اشک آنکھوں میں کب نہیں آتا	ولہ	لہو آتا ہے جب نہیں آتا
دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش		گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا
عشق کو حوصلہ ہے شرط ورنہ		بات کا کس کو ڈھب نہیں آتا
جو یہ دل ہے تو کیا سرانجام ہوگا	ولہ	تہِ خاک بھی خاک آرام ہوگا
سخت کافر تھا جس نے پہلے میر	ولہ	مذہبِ عشق اختیار کیا
دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا	ولہ	اب جس جگہ کہ داغ ہے یہ آگے درد تھا
عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبطِ عشق کے		دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا
خوبی کو اس کے چہرے کی کب پہنچے آفتاب	ولہ	ہے اس میں اس میں فرق زمین آسمان کا
کام دل میں مرا تمام کیا		غرض اس شوخ نے بھی کام کیا
تیرے کوچے کے رہنے والوں نے		یہیں سے کعبہ کو سلام کیا
وصفِ خط و خال میں خوباں کی میر	ولہ	نامہ اعمال سیہ کر گیا
جو اس شور سے میر روتا رہے گا	ولہ	تو ہمسایہ کاہے کو سوتا رہے گا
میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں		جسے ابر ہر سال روتا رہے گا
تو اب گالیاں غیر کو شوق سے دے		ہمیں کچھ کہے گا تو ہوتا رہے گا
مجھے کام ہر دم ہے رونے سے ناصح		مرے منہ کو کب تک تو دھوتا رہے گا

مرا خون تجھ پہ خون ثابت کرے گا	وله	کنارے بیٹھ کر ہاتھوں کو دھونا
وصیت میر نے مجھ کو یہی کی تھی		کہ سب کچھ ہونا اک عاشق نہ ہونا
کیا بعد مرگ یاد کروں گا وفا تجھے	وله	سہتا رہا جفا ہی میں جب تک جیا گیا
مغاں مجھ مست بن پھر قلقل مینا نہ ہووے گا		مے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا
آرام عدم میں نہ تھا ہستی میں نہیں چین	وله	معلوم نہیں میر ارادہ ہے کہاں کا
الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا	وله	دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند		یعنی رات بہت تھے جاگے صبح ہوئی آرام کیا
ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی		چاہتے ہیں جو آپ کریں ہم کو عبث بدنام کیا
کس کا کعبہ کس کا قبلہ کون حرم ہے کیا احرام		کوچے کے تیرے باشندوں نے سب کو یہیں سے سلام کیا
شیخ جو ہے مسجد میں ننگا رات کو تھا مے خانے میں		جبہ خرقہ۔ کرتا۔ ٹوپی مستی میں انعام کیا
کاش اب برقع منہ سے اٹھا دے ورنہ پھر کیا حاصل ہے		آنکھ موندے پر اپنی ان نے گو دیدار عام کیا
یہاں کے سفید و سیہ میں دخل جو ہے سو اتنا ہے		رات کو رو رو صبح کیا اور دن کو جوں توں شام کیا
زندگانی بھی ایک وقفہ ہے		یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
ضعف یہاں تک کھنچا اے صورت گر		رہ گیا ہاتھ میں قلم لے کر
کام آنے کا نہیں ایک بھی یار آخر کار	وله	ہاتھ سے جائے گا سررشتۂ کار آخر کار
مشت خاک اپنی جو پامال ہے یہاں اس پہ نہ جا		سر کو کھینچے گا فلک تک یہ غبار آخر کار
میر گم کردہ چمن زمزمہ پرواز ہے ایک	وله	جس کی لے دام سے تا گوش گل آواز ہے ایک
ناتوانی سے نہیں بال فشانی کا دماغ		ورنہ تا باغ قفس سے مری پرواز ہے ایک
گوش کو ہوش ہے ٹک کھول کے سن شور جہاں		سب کی آواز کے پردے میں سخن ساز ہے ایک
گل کی جفا بھی دیکھی دیکھی وفائے بلبل	وله	اک مشت پر پڑے ہیں گلشن میں جائے بلبل
سیر کر عندلیب کا احوال	وله	ہیں پریشاں چمن میں کچھ پر و بال

دن نہیں رات نہیں صبح نہیں شام نہیں	وله	وقت ملنے کا مگر داخلِ ایام نہیں
بے قراری جو کوئی دیکھے ہے کہتا ہے یہی		کچھ تو ہے میر کہ اک دم تجھے آرام نہیں
چلا نہ اٹھ کے وہیں پھر تو چپکے چپکے میر		ابھی میں اُس کی گلی سے پکار لایا ہوں
ملنے لگے ہو دیر دیر دیکھیے کیا ہو کیا نہیں	وله	تم تو کرو ہو صاحبی بندے میں کچھ رہا نہیں
نازِ بتاں اُٹھا چکا دیر کو میر ترک کر		کعبہ میں جا کے بیٹھ میاں تیرا اگر خدا نہیں
گردش فلک کی کیا ہے جو دورِ قدح میں ہوں		دیتا رہوں گا چرخ مدام آسماں کو میں
عاشق ہے یا مریض ہے پوچھو تو میر سے		پاتا ہوں زرد روز بروز اس جواں کو میں
صد تمنا سے یار رکھتے ہیں	وله	تو بھی ہم دل کو مار رکھتے ہیں
چپکے کرتے ہیں میر صاحب عشق		ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں
دن گذرتا ہے مجھے فکر ہی میں تا کیا ہو	وله	رات جاتی ہے اسی غم میں کہ فردا کیا ہو
خاک میں لوٹوں کہ لوہو میں نہاؤں میر		یار مستغنی ہے اُس کو مری پروا کیا ہو
عشق کو نغمہ نہ بیتابی کرے ہے نہ شکیب	وله	کرے تدبیر جو یہ درد دوا رکھتا ہو
ہائے اُسے زخمی شمشیر محبت کا جگر		درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو
فقیرانہ آئے صدا کر چلے	وله	میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
یارب کوئی ہو عشق کا بیمار نہ ہووے	وله	مر جائے ولے اُس کو یہ آزار نہ ہووے
زنداں میں پھنسے طوق پڑے قید میں مر جائے		پر دام محبت میں گرفتار نہ ہووے
اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہر آہ نپٹ سرد		یہ باؤ کلیجے کے کہیں پار نہ ہووے
مانگے ہے دعا دیکھ مجھے خلق یہ ظالم		یارب کسی کو اس سے سروکار نہ ہووے
صحرائے محبت ہے قدم دیکھ کے رکھ میر		یہ سیر سرِ کوچہ و بازار نہ ہووے
جو دے آرام ٹک آوارگی میر		تو شام غربت اک صبح وطن ہے
عشق میں بے خوف و خطر چاہیے	وله	جان کے دینے کو جگر چاہیے

باقلِ آغوشِ ستم دیدگاں — اشک سا پاکیزہ گہر چاہیے
شرطِ سلیقہ ہے ہر اک امر میں — عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

ولہ
نہیں وسواس جی گنوانے کا — ہائے رے ذوق دل لگانے کا
دم آخر ہی کیا نہ آنا تھا — اور بھی وقت تھا بہانے کا

ولہ
اب جو اک حسرتِ جوانی ہے — عمرِ رفتہ کی یہ نشانی ہے
اُس کی شمشیر تیز ہے ہمدم — مر رہیں گے جو زندگانی ہے
یاں ہوئے میر ہم برابر خاک — وہاں وہی ناز و سرگرانی ہے

ولہ
اوا کھینچ سکتا ہے بہزاد اُس کی — وے تصویر کھینچے گا یہ ہم نے مانی

ولہ
گرم میں شور سے تجھ حسن کے بازار کئی — رشک سے جلتے ہیں یوسف کے خریدار کئی

ولہ
کیا حال بیاں کریئے عجب طرح پڑی ہے — وہ طرح تو نازک ہے کہانی یہ بڑی ہے
کیا فکر کروں میں کہ ٹلے آگے سے گردوں — یہ گاڑی مری راہ میں بے طرح اڑی ہے
ہے چشمکِ انجم طرف اُس مہ کے اشارے — دیکھو تو مری آنکھ کہاں جاکے لڑی ہے
وہ دن گئے جو پہروں لگی رہتی تھیں آنکھیں — اب یہاں ہمیں مہلت کوئی پل کوئی گھڑی ہے
ایسا نہ ہوا ہوگا کوئی واقعہ آگے — اک خواہش دل ساتھ مرے جی کے کھڑی ہے
جاتے ہیں چلے متصل آنسو جو ہمارے — ہر تارِ نگہ آنکھوں میں موتی کی لڑی ہے

رباعی
اب عشق میں میر پاؤں دھرتا ہے گا — سب زیست منغص اپنی کرتا ہے گا
یارو چلو سب چل کے اُسے سمجھاویں — افسوس کہ نوجوان مرتا ہے گا

دیگر
خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے — ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر — مر مر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

دیگر
اب وقتِ عزیز کو جو یوں کھوؤ گے — پھر صبح کے غفلت کے تئیں رؤ گے
کیا خواب گراں پہ روز و شب مائل ہو — جاگو ٹک میر پھر بہت سوؤ گے

دیگر

دل غم سے ہوا گداز سارا اللہ … غیرت نے ہمیں عشق کی مارا اللہ
ہے نسبتِ خاص تجھ سے ہر ایک تئیں … کہتے ہیں چنانچہ سب ہمارا اللہ

دیگر

تسبیح کو مدتوں سنبھالا ہم نے … خرقہ برسوں گلے میں ڈالا ہم نے
اب آخرِ عمر میں ہی کی خاطر … سجادہ گرد رکھنے نکالا ہم نے

۲۔ مظہر

مظہر تخلص، میرزا مظہر جان جاناں کہ کے مشہور تھے یہ مشہور سخنوروں میں دلی کے نظم و نثر ریختہ میں نہایت خوش بیان، اور اندازِ گفتگو میں نادر زبان تھے۔ اصل وطن ان کا اکبر آباد ہے، اور دلی ان کے نشو و نما کی بنیاد ہے۔ قناعت اور استغنائے طبیعت کے ساتھ مشہور، اور علم و عمل سے فقہ کے معمور تھے۔ حسن پرستی و دل بستگی سے رغبت تمام رکھتے تھے، اور عشق حقیقی و مجازی سے کام۔ انعام اللہ خاں یقین اور فقیہ صاحب درد مندان کے شاگردانِ رشید سے کہاتے ہیں، اور میر عبد الحی تاباں تخلص بھی علیٰ ہذا القیاس اسی طرح سے گنے جاتے ہیں +

کہتے ہیں کہ ہفتم روزِ عاشورہ کو لب بام یہ اپنے گھر میں سر راہ بیٹھے تھے، اور کوئی سوداگر میلو کا بھی آیا ہوا تھا واسطے ان کی ملاقات کے، کہ ناگاہ گذر شیعوں کا ان کے زیرِ بام سے ہوا، اس گروہ نے کھڑے ہو کر سینہ زنی بھی کی۔ اور مواقف سلام سے ہوا، اور میرزائے مذکور جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح بیٹھے رہے۔ بلکہ متبسم ہو کے فرمانے لگے کہ "بارہ سو برس جس مقدمے کو ہو چکے ہوں ہر سال اسے زیادہ کرنا کیا بدعت ہے، اور لکڑیوں کو سلام و تسلیم کرنا نہایت عقل کی غفلت ہے": یہ گفتگو بجنسہ وہ لوگ جو کہ علم اور شیعوں کے ساتھ تھے اُنہوں نے سُنی، اور تعصب کی مرزائے مذکور کے امام بارے میں اور محفلوں میں دو تین شب گفتگو رہی۔ آخر شب شہادت کو، کہ عبادت شب دہم عاشورہ سے ہے کوئی شخص ان کے دروازے پر آیا، اور ان کو باہر بلوایا جب باہر آئے تو بے گفتگو ایک چوٹ پہنچے کی نذر کی، اور کام ان کا پورا کر کے تلوہ راہ اپنے گھر کی لی۔ سن بھی ان کا قریب سو برس کے تھا، اور

ایسا زخم کاری کھایا، لیکن استقلال طبیعت سے پھر اپنے تئیں کوٹھے کے اوپر پہنچایا۔ ۱۱۹۴ سنہ گیارہ سو چورانوے ہجری تھے کہ اُس روشن ساز مسائل صدیقی نے، اور اُس مصقلہ پرداز احکام فاروقی نے اس آئینہ زنگار آلودہ دنیا سے منہ پھیر لیا، اور سفر خلفائے راشدین کے منازل کے طریقت پر کیا۔ یہ اشعار اُن کے نتائج افکار سے ہیں ؎

گرچہ الطاف کے قابل یہ دلِ زار نہ تھا ؎	وله	اس قدر جور و جفا کا بھی سزاوار نہ تھا
نہیں کچھ غم کہ یوں ملتا نہیں یہاں گُل میرا	وله	کہ میں روتا ہوں دل کی بیکسی پر ہائے دل میرا
ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہے بہار	وله	ہائے کچھ چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو کیا ہے کام گلشن سے ولیک		جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں کہ آتی ہے بہار
مرتا ہوں میرزا سے گل ہر سحر	وله	سورج کے ہاتھ جوہری و صبا صبا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دلِ نازک کے تئیں مرے		یہ شیشہ بیچتا ہے کسی میرزا کے ہاتھ
خدا کے واسطے اُن کو نہ ٹوکو ؎	وله	یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے
رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے		ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

۳۔ مضموں

مضمون تخلص، شیخ شرف الدین نام، متوطن باج مئو کے تھے۔ باج مئو ایک قصبہ ہے قصبوں میں سے اکبر آباد کے۔ جس ایام میں کہ وطن سے اپنے یہ وارد شاہ جہان آباد میں ہوئے تھے، تو زینت المساجد میں آن کر اترے تھے۔ طور ان کی بود و باش کا پھر وہیں رہا ہے۔ اور اتفاق اصلاح کا سراج الدین علی خاں آرزو سے ہوا ہے۔ ازبسکہ شیخ مذکور علت سے نزلہ کے منہ میں ایک دانت

سلہ کسی نے کیا بے مثل تاریخ آپ کی وفات کی کہی ہے ۔ عاش حمیدا مات شهیدا
لطف یہ ہے کہ یہ الفاظ حدیث نبوی کے ہیں ؎

نہیں دھرتے تھے، تو خان آرزو انہیں شاعر بیداد کہا کرتے تھے۔ دلی میں نظمِ وجود کو انہوں نے ناموزون بوجھا ہے، اور مضمونِ عالی انہیں سیرِ وجود کا وہیں سوجھا ہے۔ بیشتر حسن ان کے کلام میں ایہام کا ہے۔ یہ منتخب ان کے کلام کا ہے ❖

افسوس مار جھٹ پٹ دل کو سکھے ہیں اٹکا — کس ساحروں سے سیکھا زلفوں نے تیری لٹکا

ولہ
خوبوں کو جانتا تھا گرمی کریں گے مجھ سے — دل سرد ہو گیا ہے جب سے پڑا ہے پالا

ولہ
نہیں ہے زاہدوں کے مے ستی کام — لکھا ہے اُن کی پیشانی میں سرکا

ولہ
ہم نے کیا کیا نہ ترے غم میں ای محبوب کیا — صبر ایوب کیا گریۂ یعقوب کیا

ولہ
کچے میں بیوفا کے مارے گئے ہیں عاشق — نکلا ہے ایک مضموں بھاگوں سے اپنے جینا

ولہ
ترا مکھ ہے سرچشمۂ آفتاب — نہ لاوے ترے حسن کی ماہتاب

ولہ
جس طرح سے رہے ہے مال کی اوپر کالا — یوں رہی زلف تری مُنہ کے اُجالے کے بیچ

ولہ
گر یہی دار ہے کامل کو سرتاج — ہوا منصور سے یہ نکتہ حل آج

ولہ
لیک تو تھا ہی وہ مہ رو خودپسند — ہو گیا آرسی کے تئیں دیکھ دو چند

ولہ
تجھ بن زبس کہ پانی جاری کئے ہیں رو کر — چشموں سے میں اب اپنے بیٹھا ہوں ہاتھ دھو کر

ولہ
تیر مژگاں بہت سے ہیں مجھ پر — آب پیکاں کا اس طرف سے ڈھال

ولہ
کیفی ہو کر جو مجھ سے رہا ہے وہ شوخ — جو پوچھتا ہوں بات تو کہتا ہے چل بچل

ولہ
احوال پیش دلبر کچھ مت کہو ہمارا — آتا ہے نام میرا سُن کر اُسے پسینا

ولہ
شرم سے پانی ہو جاویں نہ عجب — جو ملا یوسف ملے آ چاہ سے

ولہ
وہی دلدار خوش آتا ہے جو ہووے بانکا — خوب لگتی نہیں وہ تیغ جو خمدار نہیں

ولہ
کیا ہوا جو خط مرا پڑھتا نہیں — جانتا ہے خوب وہ مضمون کو

ولہ
اُس دہاں بیچ سخن رکھتا ہوں — مجھ پہ اس بات کو اثبات کرو

ولہ
جب سے چاہا ہے ترا چاہِ ذقن — آب چشموں سے مرے جاری ہے

نظر آتا نہیں وہ ماہ رو کیوں — وله — گذرتا ہے مجھے یہ چاند خالی

چلا کشتی میں جب آگے سے وہ محبوب جاتا ہے — وله — ابھو آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے
یہ اشک آنکھوں میں تا مدہ کس طرح یک دم نہیں تھمتا — دلِ بیتاب کا شاید لئے مکتوب جاتا ہے

مرے آئینۂ دل سے ترا نقش — وله — جو دیکھا تو کسی صورت نہ جاوے

مضمون تو شکر کر کہ ترا نام سن رقیب — وله — غصے سے بت سا ہو گیا لیکن جلا تو ہے

مہ مخلص

مخلص تخلص، مخلص علی خاں نام، بھانجے نواب نوازش محمد خاں شہامت جنگ کے، ساکن مرشد آباد۔ میر باقر کر کے مشہور تھے۔ جوان خندہ رو اور کشادہ پیشانی، ہمیشہ خوش وقت اور خوش زندگانی بنگلے میں بہت کیفیت کے ساتھ انہوں نے گذری ہے، اوقات بیشتر عیش و کامرانی میں بسر کی ہے، شب و روز عیش و عشرت سے کام تھا، اور رات دن وقفِ احباب گردنِ صراحی اور لبِ جام تھا۔ زبانِ ریختہ میں انہوں نے بہت کچھ کہا ہے۔ چنانچہ دیوان بطور اساتذہ ترتیب بھی دیا ہے لیکن کثرتِ عیش سے ازبسکہ دھیان دھا کہیں کا کہیں ہے، کلام ان کا خالی نغزش سے نہیں ہے۔ شاید ۱۲۰۷ھ بارہ سو سات ہجری میں بلدۂ مذکور کے اندر دامِ ہستی کی کشاکش سے رہائی پائی ہے، اور سیرِ چمنستانِ عدم کی عینِ تعیش میں فرمائی ہے۔ یہ اشعار اس ستودہ کردار کے ہیں *

ید بسم اللہ ابرو ہے رخِ عنوان کا — حسنِ معنی کیوں نہ مفتوں ہو مرے دیوان کا

اب ٹک تو اس کو آکے جفا کار دیکھنا — وله — مرتا ہے کوئی دم میں گرفتار دیکھنا

ہمارے قتل کرنے سے تجھے آرام کیا ہوگا — وله — میاں اس ظلم کا تو ہی سمجھ انجام کیا ہوگا
بدی میں یاں تلک مشہورِ دنیا ہے مرا مخلص — پھر اس بدنام سے آگے کوئی بدنام کیا ہوگا

ہاتھ ملتا ہے کہ میرے دل کے ہوتے حیف ہے — وله — کیوں کفِ پا ہیں ترے رنگِ حنا سے آشنا

یہ پوچھو خضر و اسمٰعیل سے گر تم نہیں واقف	وله	حیاتِ جاوداں بہتر ہے یا سر کو فدا کرنا
ترکِ الفت یہ بتوں کی مجھے مقدور نہ تھا	وله	ورنہ کعبہ مرے بت خانہ سے کچھ دور نہ تھا
مخلص کیا دریافت یہ میں سنگ محک سے	وله	جو عیب کسی کا کہے منہ اُس کا ہو کالا
آخر یہ دل ہمارا کچھ داد کو نہ پہنچا	وله	جز نالہ کوئی اُس کی فریاد کو نہ پہنچا
ہو گئے داغ نمک داں مرے ای کان نمک	وله	جب سنی لب کا ترے شور پڑا کان میں آ
اگر یاد کر بوسے لب کو ترے	وله	نہ ہو مست کو یہ خمار شراب
زخمِ دل سینے کو کہتا ہے مرے کام آتا	وله	باقی رہتا جو کوئی تار گریبان کے بیچ
گئے یہ بال و پر برباد صیاد	وله	قفس سے اب نہ کر آزاد صیاد
دکھلائیے نرگس نہیں پھولی یہ باغ و دشت میں	وله	دور سے آنکھیں خزاں کی تئیں دکھلاتی ہے ہوا
دل خستہ و سوداز دہ تدبیر ہے نازک	وله	دیوانہ زبردست اور زنجیر ہے نازک
محبت میں تری جا کر پھنسا دل	وله	دریغا ہائے دل واحسرتا دل
تھی یہ خوشی کہ ہوگا مرے دل کا غم تمام	وله	وہ تو ہوا نہ کم پہ ہوئے ہای ہم تمام
کیوں محبت میں علاج داغ کرو	وله	خانۂ دل کو بے چراغ کرو
کیوں نہ ہر دم مری آنکھوں سے چوے ہاے لہو	وله	داغ ایسا نہیں کوئی دل میں کہ ناسور نہیں
منظور بندگی مری ہو تجھ کو گو نہیں	وله	میں دست کش ہوں تجھ سے یہ ہوتا ہی سو نہیں
لی جب خواب سے اٹھ آنکھ تو تے صحن گلشن میں	وله	شگفتہ ہو گئیں گلزار میں نرگس کی سب کلیاں
کیوں کیا جھاڑ کے نوبت غبار دامن	وله	کچھ نہ اتنا تھا میاں وہ ترا بلبد دامن
نہ لی آخر خبر اس نیم بسمل کی کبھو تو نے	وله	تجھے صد آفریں صیاد یوں ہی صید کرتے ہیں
جن کو دولت سے شہادت کی تمنا مخلص	وله	تیغ بیداد کو وہ بال ہما کہتے ہیں
کرم جو شی سیتی مخلص سے ملے ہی جب یار	وله	رشک سے اُس کے رقیبوں کے جگر جلتے ہیں
ستم سے ترے آشنا کم رہے ہیں	وله	ہمیں ہیں کہ اب تک کہ یہاں تم رہے ہیں

کہتے تو ہو ملنے کی آتی ہیں ہمیں گھاتیں ولہ جھوٹے ہو میاں تم تو کہنے کی ہیں یہ باتیں
روتے روتے جو کبھی ہوش میں آجاتا ہوں ولہ شرم سے اپنے میں جیسے کہ موا جاتا ہوں
اُس کے یہ ظلم و ستم کچھ نہ کہے جاتے ہیں ولہ نہ ہمیں چھوڑتے بنے ہے نہ سہی جاتی ہیں
کہتا ہے تو جوہر دم شمشیر سے ادیں ہیں ولہ یہ لطف ہے اور سر ہو تقصیر وار ادیں ہیں
مخلص تیرے کے یار بہت ہیں گے مشتری ولہ تم بھی اگر ہو اُس کے خریدار کچھ کہو
آئینہ رو کے دل میں کوئی راہ کیا کرے ولہ دم مارنے کی بات نہیں آہ کیا کرے
عاشق سوائے رونے کے اور کام کیا کرے ولہ جس کا جلا ہو دل سو وہ آرام کیا کرے
قاصد کو دیکھ دور سے دیتا ہے گالیاں ولہ ایسی پری کو پھر کوئی پیغام کیا کرے
مرے دل میں آ نا بسا آکے تو سے ولہ کہ مجھ کو پڑی اپنی اب جستجو ہے
ڈرتا ہوں محبت مری اظہار نہ ہووے ولہ مجھ سے کہیں آزردہ وہ دلدار نہ ہووے
دل کو مرے ہرگز کبھی آرام نہ ہووے آغوش میں میرے جو دل آرام نہ ہووے
یہ مشتِ خاک اُڑ جاتی ہو جب ملنے کو مجنوں سے ولہ بگولے آگے آتے ہیں اُسے لینے کو جنگل سے
کیوں کہ ہووے گی زندگی اب آہ ولہ دل کی نوبت تو جان پر آئی
نہیں یک دل سلامت اس میں پایا ولہ شکن اُس زلف کی کیا دل شکن ہے
چمن میں قد نے ترے طرح جلوہ جب ڈالی ولہ نہال و گل نے کہا مد ظلہ العالی
ڈرتے ہو دامن آہ کے شعلے سے جل نہ جائے ولہ عاشق کی خاک پر نہیں آتے میاں کبھی
کوئی اپنے اسیروں سے تغافل یوں بھی کرتا ہے ولہ قفس میں مر گئے ہم یہ خبر صیاد کو پہنچے
سحر روتے لہو اور کرتے شام آہ رسا گذری ولہ کبھی تو نے نہ پوچھا آہ مخلص پہ کیا گذری
مخلص سا وفادار کوئی ہم نے نہ دیکھا ولہ اس طور کا بندہ نہیں ہوتا ہے خدا سے
رہتا ہے غضب مجھ پہ تو ہر شام و پگاہ رباعی کرتا ہے تو ثابت مری گردن پہ گناہ
تجھ سے نہیں اتنی بھی ظالم درکار مطلوب اگر سر ہے مرا بسم اللہ

تا صبح میں عجب دیکھی مروت تیری | باہم | عاشق کے ستانے میں ہے رغبت تیری
دل غم سے نہیں بھرا ہے اتنا میرا | | جو اس میں سما دے یہ نصیحت تیری

۵- مجذوب

مجذوب تخلص، میر غلام حیدر نام۔ شاہ جہان آبادی۔ بیٹا سر تاج شعرائے بلند مقام میر محمد رفیع سودا شاعر شیریں کلام کا ہے۔ آشنا پرستی اور یک رنگی کے ساتھ موصوف، درد دل اور گداز طبیعت میں مشہور و معروف۔ نظم ریختہ میں صاحب دیوان ہیں، اور حسن ترکیب میں ناظم رنگیں بیان۔ تلاش سے معنی تلذذ کے حتی الامکان نہیں گذرتے ہیں، اور باندھنے سے مضامین مشہور کے حتی المقدور کنارہ کرتے ہیں دو دیوان جواب میں میر تقی میر کے انہوں نے کہے، اور مقدور بھر سرانجام جواب سے غافل نہیں رہے غرض بالفعل، کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ساتھ عسرت معاش کے لکھنو میں جیتے ہیں مصرع لخت دل کھاتے ہیں اور خون جگر پیتے ہیں + یہ منتخب افکار اس ستودہ اطوار کا ہے +

خوباں سے جو دل ملا کرے گا | | دھڑکا ہے یہی کہ کیا کرے گا

عداوت سے تمہاری کچھ اگر ہو وے تو میں جانوں | ولہ | بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہو وے تو میں جانوں
نہ اندیشہ کرو پیارے کہ شب ہے وصل کی تھوڑی | | تم اپنی زلف کو کھولو سحر ہو وے تو میں جانوں

آوے ہے مسیحا مری بالیں پہ تو کیا ہو | ولہ | بیمار یہ ایسا تو نہیں جس کو شفا ہو
اشک آنکھ میں ہو عشق سے تا دل میں غم رہے | ولہ | یہ گھر ہے وہ خراب کہ آتش میں نم رہے
چھوٹے اگر قفس سے تو خاموش ہم صفیر | | صیاد نے سنا یہ ترانا تو ہم رہے

۶- مصحفی

مصحفی تخلص، غلام ہمدانی نام، ساکن امروہے کا۔ اپنی قوم کا اشراف ہے، سچ تو یہ ہے کہ گفتگو اس کی بہت صاف صاف ہے۔ بندش نظم میں اس کے ایک صفائی اور شیرینی ہے، اور معنی

بندش میں اس کے بلندی اور رنگینی۔ ایک مدت شاہ عالم بادشاہ غازی کے عہد سلطنت میں مقیم شاہجہان آباد کا رہا ہے۔ بالفعل کہ ١٢١٥ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، ایک چودہ برس سے اوقات لکھنؤ میں بسر کرتا ہے مینق معاش تو وہاں ایک مدت سے نصیبِ اہلِ کمال ہے، اسی طور پر وہ بھی برہم اس غریب کا بھی احوال ہے۔ دیوان اس عزیز کا بھرا ہوا نظم کے جمیع اقسام سے ہے۔ یہ اس کے منتخب کلام سے ہے۔

پیری میں اور بھی ہوئے غافل ہزار حیف — بے اختیار لے گئی ہم کو یہ خواب صبح

ولہ

ہوئی ہے بسکہ یہ فصلِ بہار دامن گیر — چلیں چمن سے تو ہوتا ہے خار دامنگیر
بچ کے رکھیو قدم دل جلوں کی تربت پر — مبادا ہو کوئی تیرِ شرار دامنگیر

ولہ

آگیا خط پہ سرِ مو نہ گیا ناز ہنوز — ہے اسی ڈھب پہ نگاہِ غلط انداز ہنوز

ولہ

ایک دن رو کر نکالی تھی وہاں کلفتِ دل — اب تلک دامن صحرا سے ہے غبار آلودہ

ولہ

زبس آئینہ رو ہے طفلِ حجام — نہیں بن دیکھے اس کے دل کو آرام

ولہ

جو دیکھیں انگلیاں وہ گوری گوری — بنا خورشید پانی دل لٹوری
وہ جس کے روبرو ناگاہ آیا — اسے حیرت نے آئینہ دکھایا
ملا جب آئینہ کو ویسا نائی — بنائی چار ابرو کی صفائی
نہ کھینچے نامہ مو اس کی تمثال — کہ وہ ہے عاشقوں کی ناک کا بال
سنے ہی مصحفی اب تو بھی فی الحال — منڈا کر سر کو ہو جا فارغ البال

۷ محبت

محبت تخلص، نواب محبت خاں نام خلف ارشد نواب حافظ الملک حافظ رحمت خاں کے ہیں حسب و نسب کی طرف سے کثرت شہرت کے باعث نہیں محتاج بیان کے ہیں۔ جوان خوش ظاہر و خوش رو ہیں، اور خوش اختلاط و خوش خو و حسنِ خلق سے معمور اور مروت و جوانمردی کے ساتھ

مشہور۔ فقط خوش مزاجی خلقی کے باعث انہوں نے مشیوہ سخنوری کا اختیار کیا، اور خوش استعدادی طبعی کے سبب طبع بیگانہ خو کے تئیں لطافت معنی سے یار کیا۔ جمیع اقسام نظم میں انہوں نے طبع آزمائی کی ہے، اور اصلاح سخن کی میرزا جعفر علی حسرت تخلص سے لی ہے۔ معاصرین اپنے میں مشہور ہیں ساتھ خوش بیانی کے، اور روشن طبیعتوں میں شہرت رکھتے ہیں ساتھ روشن زبانی کے۔ قصہ سسی پنو کا فرمانے سے ممتاز الدولہ مستر جانسنین بہادر کے انہوں نے نظم کیا ہے، اور نام اس مثنوی کا اسرارِ محبت رکھا ہے۔ بعد نواب حافظ رحمت خاں کی شکست کے، جو لکھنؤ میں آئے، تو اُسی ایام سے بس طور بود و باش کی وہیں ٹھہرائے۔ نواب آصف الدولہ مرحوم نے بہت اعزاز و اکرام کیا تھا، اور مشاہرہ بھی معقول کر دیا تھا۔ بالفعل، کہ ۱۲۱۵ھ بارہ سو پندرہ ہجری ہیں، اُسی شہر میں بود و باش رکھتے ہیں، اور مضامینِ تازہ کی ہمیشہ تلاش رکھتے ہیں۔ دیوان میں ان کے نظم کے سب اقسام ہیں۔ یہ غزلیں ان کی منتخب کلام ہیں +

جب تلک وہ بت خود کام نہیں آنے کا
دلِ بیتاب کو آرام کو نہیں آنے کا

مجھ کو خطرہ ہے خدا یہ نہ کرے جو اُس کا
ہو یوسف نہ سلیمیں پیغام نہیں آنے کا

کیا خوشی کیجئے یاں رو کہ وہ خورشید لقا
صبح آوے گا تو پھر شام نہیں آنے کا

ولہ

کوئی ڈھب بھی تجھے آتا ہے وفاداری کا
یا کہ سیکھا ہے یہی شیوہ ستمگاری کا

دیکھا اک جھڑکی میں اے یار کوئی بھی ٹھہرا
کیا ہی اغیار کو دعویٰ تھا تری یاری کا

ولہ

قید ہو بیٹھے ہوا دونوں جہاں سے آزاد
میں تو بندہ ہوں محبت کی گرفتاری کا

ولہ

دشمن کی آنکھ میں بھی پہنچے نہ اے صبا تک
میرا غبار کیجو برباد اس طرح کا

ولہ

مذکور جو محفل میں ہوا دوش کسی کا
سنتے ہی ٹھکانا نہ رہا ہوش کسی کا

ولہ

شب کہ مجلس بیچ وہ غارت گر ہر خانہ تھا
تھے جو باہم آشنا ایک ایک سے بیگانہ تھا

ولہ

بس گھڑی گھر و مرے تو جلوہ فرمانے لگا
غنچۂ تصویر بھی خجلت سے مرجھانے لگا

یہ بڑھا دیوانہ پن اپنا کہ تا صبح دل ہوا
تھا مرا ہمدرد لیکن مجھ کو سمجھانے لگا

ولہ
عاشقوں میں مجھے لکھا تو نے / آج چہرا مرا بحال ہوا

ولہ
تیری گلی سے دل افگار جو گیا سو گیا / عدم کے کوچہ سے اے یار جو گیا سو گیا
تو اُس کے گھر کو تو ڈھہتا ہوا چلا اے دل / یہ ہے وہ قہقہہ دیوار جو گیا سو گیا

ولہ
دل جو جاتا ہے چلا جاے کہیں مجھ کو کیا / اُس کی رسوائی کو کہتا ہوں نہیں مجھ کو کیا
چشم حیراں سے کہاں دل کو ملے لذت دید / مری آنکھیں جو تجھے دیکھ رہیں مجھ کو کیا
منزل اوّل ہی ابھی عشق کی اے تاب و تواں دل / چھوڑ جاتے ہو تم افسوس نہیں مجھ کو کیا

ولہ
دل دیں سگے رونمائی دستور ہے ہمارا / کیا کیجیے یہی کچھ مقدور ہے ہمارا
اللہ رے تکبر سنتا نہیں سخن بھی / یہاں تک وہ بت عزیزو مغرور ہے ہمارا
جاتے ہیں جلد پھینکے توسن کو ٹھوکر کے ہم / کیا کیجیے محبت گھر دور ہے ہمارا

ولہ
غیر کو یاد تو زنہار نہ رکھ اے پیارے / بھول جا مجھ کو بھی لیکن یہ مری بات نہ بھول

ولہ
عید زمانہ کرتے ہیں ہم چشم خانہ میں / اُڑتا ہے اپنا مرغ نگہ آشیانے میں
دل خشک سے کہاں سی بہیں اشک چشم سے / تو اہرا تب چھٹے جو ہو پانی خزانے میں

ولہ
نزع میں دم ترے پاس آنے کا ہم رکھتے ہیں / دم میں دم جب تلک اپنے ہے یہ دم رکھتے ہیں
آپ کچھ غیروں کو چھپ چھپ کے رقم کرتے ہیں / یہ جو جھوٹ ہو دی تو ہم ہات قلم کرتے ہیں

ولہ
سرخی اشک کبھی اور کبھی زردی رو / تو نے اے عشق عجب رنگ دکھایا مجھ کو

ولہ
بیٹھنے دیوے نہ وہ بزم میں اپنی جو مجھے / تو اُٹھا لیجیو اے بار خدایا مجھ کو

ولہ
ساقی گھٹا ہیں جو برستی نظر پڑی / یاد آئی مے وہیں وہیں مستی نظر پڑی
بوسے کی بھی عوض نہ خریدی یہ جنس ہائے / اُس کو متاع دل مری سستی نظر پڑی
یا تھا فلک پہ اُس کا دماغ اب ہے خاک پر / دل کی عجب بلندی و پستی نظر پڑی

ولہ
تمنّا یاس سے ہیہات کہنے میں نہیں آتی / غرض یہ کیا کہوں کچھ بات کہنے میں نہیں آتی

مخمس

کون سے روز میں سر سنگ سے مارا نہ کیا
ہجر میں تیرے میں کب جیب کو پارا نہ کیا
پر مرض کا مرے تو نے کبھی چارا نہ کیا
درد دل سے تو میں کس رات پکارا نہ کیا
نہ کیا میری طرف تو نے گذارا نہ کیا

یوں ہی آ نکلے تھے محفل میں تمہارے ہم تو
آپ کے دیکھ چکے سب ہے اشارے ہم تو
مر گئے ہائے اسی رشک کے مارے ہم تو
آ لگے گور کے اس غم سے کنارے ہم تو
تو بھی غیروں سے میاں تم نے کنارا نہ کیا

ساری شب رہتی ہے مجھ میں اور دلبر میں خوشی
وله
اگر ہے میں جام بھر بھر دوں بھلا وہ مجھ کو کبھی
لیک حرف ناز اس کا سُن نہیں رہ جی میں جی
پھیرتا ہوں جب میں اس کو تب یہ کہتا ہے ابھی
پاس سے ہم تیرے ان باتوں سے اب اٹھ جائینگے

مثنوی

کہی القصہ پھر بندے سے یہ بات
اگر مانع نہ ہووے اس میں اوقات

تو مضموں کر کے اس قصہ کا معلوم
یہ ہی منشا رکر تو اس کو منظوم

یہ بات اتنے لئے تجھ سے کہی ہے
کہ مشق اس کی بہت تم کو رہی ہے

تجھے اس عشق کے ہیں کا معلوم
محبت کے ہیں سب اسرار معلوم

پیا ہے تو نے بھی جام محبت
سراپا تو ہے ہم نام محبت

ترے اشعار سن کر سب سخنداں
محبت کا اسے کہتے ہیں دیواں

سراپا کیا لکھوں اس شمع رو کا
کہ تھی وہ حسن کا شعلہ سراپا

عیاں یوں ہوئے سے تھے عنبر آلود
کہ جیسے شمع کے شعلہ پہ ہو دود

دوپٹا چاند تارے کا زری باف — جو اوڑھے تھی کر اپنی پٹیاں صاف
سما ہوتا تھا یوں جیسے فلک پر — شبِ دیجور میں چمکے ہیں اختر
گُندھی چوٹی نظر اس شکل آوے — کہ جوں مارِ سیہ لہریں دکھاوے
بہت سے تھا دلوں کا اُس میں مسکن — اچنبا ہے کہ اک سانپ اور کئی من
نگہ بدرِ فلک کی اُس جبیں پر — اک ابرِ سیہ جیسے ہو مُنہ پر
وہ دندان آبدار اُس سیم بر کے — کہ سوراخ اُن سے ہیں دل میں گُہر کے
کروں کیا خوبیِ لب کی میں تقریر — قیامت اُس پہ تھی مسّی کی تحریر
تبسم میں نظر اس رنگ سے آئے — کہ غنچہ جیسے نافرماں کا کھِل جائے
زباں کھولوں اگر وصفِ دہاں پر — سخن ہو جائے گم میری زباں پر
گو ٹھکیا کیا جھمکا دے عشق اُس آہ — جسے چاہِ زنخ کی اُس کے ہو چاہ
نہیں گردن کی کچھ تعریف ہوتی — وہ ہے گویا صراحی دارِ موتی
حنا سے سرخ تھا یوں پنجۂ ماہ — کہ جوں خوش خط لکھیں سُرخی سے اللہ
بھلا دوں کس سے نسبت ان کفوں کو — جو میداں حُسن کے سے لے گئی گو
عیاں وہ گلشنِ خوبی میں ہیں یوں — کہ جیسے دو انار اک شاخ میں ہوں
اگر دیکھے اُنھیں نامردِ ذاتی — عجب کیا وہ بھی اپنی کوٹے چھاتی
جو وصف اُس ساقِ سیمیں کا سنے ہے — بحسرت شمع رو رو سر دُھنے ہے
قدِ موزوں وہ جب اپنا دکھا جائے — اور اُس کے فندقِ پا تک نظر آئے
تو حیرت سے بھول یہ سب کو پہ دیکھے — بنِ شمشاد میں غنچے نہ دیکھے
جھنک خلخال کی تھی کیا قیامت — کہ ہر سو جس سے برپا تھی قیامت
جو ہو ٹک نقشِ گل برگرم رفتار — رگِ گل پشتِ پا سے ہو نمودار

۸ منت

منت تخلص، میر قمرالدین نام شاہجہان آبادی سلسلان کے نسب کا ماں کی طرف سے سید جلال بخاری کو پہنچتا ہے۔ وہ سید جلال جو بیٹے تھے سید مقصد یزدی کے جن کا احوال مفصل تذکرہ کاتبی میں لکھا ہے۔ قرابتوں کی تقریب اور پیوندوں کے سبب سے تربیت منت مذکور نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے گھرانے میں پائی ہے، اور کیفیت راہ طریقت و معرفت کی فخر العارفین مولوی فخرالدین قدس سرہٗ کی خدمت سے اٹھائی ہے۔ عقدے فن شعر و شاعری کے میر شمس الدین فقیر تخلص کی فیض صحبت سے ان پر کھلے، اور میر نورالدین نوید تخلص کی برکت مجالست سے دقیقے مستی و چستی تعلم کے طے ہوئے۔ صفائی بندش و حسن بیان میں فی الحقیقت استاد، اور موشگافی معنی میں قلم اس کا رشک خامۂ بہزاد۔ زبان فارسی میں کلک عنبر سلک نے ان کے بہت کچھ لکھا ہے۔ نظم و نثر ملا کے قریب لاکھ بیت کے کلیات ان کا ہے۔ مثنویاں متعدد انہوں نے کہیں، اور کتابیں بیشتر تالیف کیں۔ چنانچہ شکرستاں کر کے ایک نسخہ اس فقیر پر مقال کا بطور گلستاں کے مشہور ہے، اور جواب اگر گلستاں کا کہیں تو کیا مقدور ہے۔ سنہ ۱۱۹۱ گیارہ سو اکانوے ہجری میں ویرانی شاہجہان آباد کے باعث لکھنؤ میں ان کا آنا ہوا، اور میر محمد حسین فرنگی لقب کی بار فروشی کی سبب مشتاق ان کا وہاں ایک زمانہ ہوا۔ بعد چندے مربی گری سے میر مذکور کے ممتاز الدولہ مسٹر جانسٹین بہادر کی سرکار میں توسل انہوں نے حاصل کیا، اور رفاقت میں صاحب مذکور کی کلکتے آکر عماد الدولہ گورنر مسٹر ہیسٹن جلادت جنگ بہادر کی اعانت کے باعث پیشگاہ نظامت سے صوبہ بنگ کے خطاب ملک الشعرا کا لیا۔ بعد ایک مدت کے رفیق یہ مہاراجہ نکیت رائے کے ہوئے، اور چند ایام زندگی کے اپنے طور پر بسر کئے۔ سنہ ۱۲۰۶ بارہ سو چھ ہجری میں نواب سرفراز الدولہ میرزا حسن رضا خاں بہادر اور مہاراجہ ٹکیت رائے واسطے کچھ سوال و جواب معاملات کے لکھنؤ سے کلکتے جو تشریف لائے، تو میر قمرالدین منت بھی ساتھ آئے۔ ایک تین چار روز تپ محرق ان کو عارض ہوئی، اور بغیر جان کے لئے وہ تپ نہ گئی۔ چنانچہ کلکتہ اس سید غریب الدیار کا مدفن ہوا۔

اور تا رستخیز قیامت وہی مسکن ہوا۔ یہ خلاصۂ افکار اُس منتخب روزگار کا ہے +

خشک تالے ہوگئے بہنے سے دریا تم رہا
چشم میں اپنے نہیں اک عمر سے کچھ نم رہا

مے کدہ سے ٹل گئے اہلِ ہوس پی پی کر جام
انگبیں وہ ہوں کہ اس پیرِ مغاں میں جم رہا

ولہ
کو تہی اُس کی تغافل سے دستِ صبا ہنوز
عقدہ ہوا یہ دل کا ہمارے نہ وا ہنوز

ولہ
گُل نکلتے ہیں زمیں سے یتی برنگِ شعلہ
کون دل سوختہ جلتا ہے تہ خاک ہنوز

ولہ
گر نقش دوئی مٹائیں گے ہم
سچ کہیو کہ کیا کہائیں گے ہم

مصری سے وہ ہونٹ ٹک دکھاوے
کچھ گھول کے پی نہ جائیں گے ہم

اس آنے کا کچھ بھی لطف پیارے
ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم

آئینۂ دل جو تھا وہ ٹوٹا
کیا اب تمہیں منہ دکھائیں گے ہم

ولہ
سو کوہِ آتشیں کو چھاتی سے پیلتے ہیں
کچھ عاشقی نہیں ہی ہم جی پہ کھیلتے ہیں

دل ہم ستم زدوں کا ہے واجب الترحم
اس نیم قطرہ خوں پر سو زخم جھیلتے ہیں

خوانِ کرم پہ تیرے ہے سیر ایک عالم
ہم بے نصیب ابتک پاپڑ ہی بیلتے ہیں

ولہ
منّت ایسے کو دل دیا تو نے
اے مری جان کیا کیا تو نے

ولہ
مدعی اس سے سخن ساز بہ سالوسی ہے
پھر تمنّا کو یہاں مژدۂ پابوسی ہے

ہے مری طرح جگر خون ترا مدت سے
اے حنا کس کی تجھے خواہش پابوسی ہے

تہمتِ عشق عبث کرتے ہیں مجھ پر منّت
ہاں یہ سچ ملنے کی خوباں سے تو اک خوسی ہے

ولہ
کوئی اس بدمزاجی پر تمہارے پاس کیا بیٹھے
ادھر ٹک ہم نے دم مارا ادھر تم منہ بنا بیٹھے

یہیں سے ہمرہانِ قافلہ اپنی تو رخصت ہے
کہ اس وادی میں ہم تو ضعف سے جوں نقش پا بیٹھے

قطعہ
کھڑے رہتے جو اُس کی بزم میں تو یوں لگو کہنے
دکھاتا ہی یہ اپنے پاؤں کیوں ناحق کمر رکھ بیٹھو

جو اتنی بات سن کر بیٹھ جاویں تو لگے کہنے
ہنسی سے کہتے ہی لک بات کے بس آپ آ بیٹھو

دو آمے باز یہ بندہ تو منّت بد کہلانے سے
تکلف برطرف گر ساتھ اُس بت کے خدا بیٹھے

کہاں ہم کو خوش غم دل رو سے ہے	ولہ	گرہ زیر لب فتنۂ آرزو سے ہے
قدم رکھ گیا کون سینہ پا سپنے		گل دماغ میں آج مہندی کی بو ہے
سُنا تا تھا میں حال دل اُس کو منّت		کہا چل بے بیاں سے یہ کیا گفتگو ہے
آہو سے تری چشم کی کب چھوڑیں یہ تشبیہ		جب تک کسی ساغر کو تو آنکھیں نہ دکھاوے
اُٹھ جائے کسی کے جو دل صاف سے پردا		پھر آئینہ دنیا میں کبھو مُنہ نہ دکھاوے
بندے کو خدا کے نہیں جز دل شکنی کام	ولہ	کیا سنگ سے دل شیخ کا اللہ سے پاوے
منت یک بار عشق سے توبہ کر	رباعی	چار و نا چار عشق سے توبہ کر
اب تک مردود دین و دنیا رہنا		آجانے دے یار عشق سے توبہ کر
منت جوں شمع دل جلا جاتا ہے	دیگر	رو کا کب غم کا دلولا جاتا ہے
کیا جانئے کیا خلش ہے سینہ میں آج		ہر سانس کے ساتھ جی چلا جاتا ہے
منت اے جان ان بتوں کو مت پوچھ	دیگر	مت کھو ایمان ان بتوں کو مت پوچھ
ان باتوں پر پتھر پڑیں تیری ظالم		اللہ کو مان ان بتوں کو مت پوچھ

باب النون

۱- ناجی

ناجی تخلص، نام اس کا محمد شاکر تھا۔ شاہ جہان آبادی۔ شاہ نجم الدین آبرو تخلص کا معاصر تھا۔ محمد شاہ فردوس آرام گاہ کے وقت میں اس نے شہرت پائی ہے، اور بطور قدما کے طرز ابہام میں کرتا طبع آزمائی ہے۔ خوش طبعی اور ظرافت سے بیشتر سروکار رکھتا تھا، اور عالم کی ہجو کرنا شعار رکھتا تھا۔ بشہوۂ قدیم میں صاحب دیوان ہے۔ اور وضع سابق میں شاعر خوش بیان ہے لیکن ازبسکہ غیر مروج طرز ابہام ہے، کلام ان کا نامقبول طبائع خاص و عام ہے۔ یہ منتخب اوراق اُس کہنہ مشاق کا ہے۔

قوس قزح سے چرچا کرتا ہے تجھ بھوان کا	شاید کہ سر پھرا ہے اب پھر آسمان کا

نہ پوچھو خود بخود عارض خورشید کی خوبی ولہ لیا ہے داد حسن ماہ مہ رویوں نے گرچندہ

مجھ کو باتوں میں لگا معلوم نیں کیا کیا کیا ولہ لے چلا جی کے تئیں منہ دیکھتا میں رہ گیا

تری نگاہ کی کثرت سے اے کماں ابرو ولہ ہمارے سینہ میں تودا ہوا ہے تیر دل کا

مت گرفتار ہو دام زلف سے دل ولہ بال باندھا غلام ہے تیرا

سخن سن اُس بت کافر ادا کا ولہ بچا ہوگا کوئی بندہ خدا کا

رنگ تیرا گندمی دیکھ اور بدن مخمل سا صاف ولہ ہوش کھو کر آدمی بھوسے میں اپنی خور دو خواب

دی سے ہے دریا او پہ مجھے مجھتی ولہ لا اُتارا ہے میں اُسے کس گھات

محبت سوں علیؓ کی دیکھ ناجی ولہ ہوا ہے دل مرا اب حیدرآباد

یکبار جو بغل میں لوں اُس سرو قد کے تئیں ولہ بالا بتاؤں خضر کی عمر ابد کے تئیں

عاشق کو روتے دیکھ چڑھا مت بھواں کے تئیں ولہ برسات میں اُتار رکھے ہیں کماں کے تئیں

زلف کیوں کھولتے ہو دن کو صنم ولہ مکھ دکھایا ہے تو مت رات کرو

ہی غرض ملنے میں نہ اُلفت کچھ اس بے درد کو ولہ پوچھتا ہے کان زر عاشق کے رنگ زرد کو

غم نہیں گر دلبری سے دل کو لے جاتا ہے وہ ولہ پاس میرے تب تو آتا ہے جو دل پاتا ہے وہ

ان بتوں کو ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہے ولہ یہ تو طالب زر کے ہیں اور یہاں خدا کا نام ہے

وظیفہ راگنی کے سُر میں زاہد کفر ہے مت پڑھ ولہ نہیں تسبیح تیرے ہاتھ میں یہ راگ مالا ہے

ہوا جب آئینہ میں جلوہ گر میں تب لیا بوسا ولہ جو آیا اپنے قابو میں تو پھر منہ دیکھنا کیا ہے

انا الحق بولنے لگتا ہے اُس کے زخم کا بسمل ولہ کناری آبدار اُس شوخ کی منصور خانی ہے

اُس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں ولہ عارضی میری زندگانی ہے

تصور سے ترے رخ کے گئی ہے نیند آنکھوں سے ولہ مقابل جس کے ہو خورشید کیونکر اُس کو خواب آئے

۲- نعیم

نعیم تخلص، نعیم اللہ نام۔ یہ وطن شاہجہان آباد کا معاصر محمد حاتم حاتم تخلص کا تھا۔ چنانچہ اکثر شاعروں میں گفتگوئیں طنز و ایما کی ان کے درمیان آئیں ہیں، اور مکرر غزلیں انہوں نے باہم لڑائیں ہیں۔ ایک دن محمد حاتم نے مشاعرے میں یہ غزل پڑھی، اور مطلع میں غزل کے طنز محمد نعیم پر کی ؎

جس دن سے کوئے یار کا حاتم مقیم ہو		بد تر اسے خزاں سے بہار نعیم ہے

جب دور پڑھنے کا محمد نعیم تک پہنچا تو انھوں نے بھی مطلع غزل یہ پڑھا ؎

طلب نہ ہو تو سلیماں کی کچھ بھی خاتم ہے		لب سوال نہ ہووے تو ہیچ حاتم ہے

غرض نعیم مذکور نے مرتے دم تک دلی نہ چھوڑی، اور شاہجہان آبادہی میں سیر جنت النعیم کی کی۔ ایک دیوان مختصر زبانِ ریختہ میں اس کہن اُستاد سے ہے۔ یہ اُس کے طبع زاد سے ہے ✦

اس وقت تلک اے یار گفتار نہ کیجے گا		اُس فتنۂ عالم کو بیدار نہ کیجے گا
احوال مرا اُن کے کہنے لگا وہ ظالم		اب چاہیئے بس زیادہ تکرار نہ کیجے گا
خیال کرکے ترے موکمر کو روتا ہوں	ولہ	وہ کیوں نہ رووے پڑی جسکے بال آنکھوں میں
دیکھ آئینہ خانے میں گر تجھ کو نہیں باور	ولہ	تجھ سے تو جہان میں بھی دلدار بہت ہوں گے

بابُ الواو

۱- ولی

ولی تخلص، شاہ ولی اللہ نام، دکھنی۔ وطن بزرگوں کا اس کے گجرات ہے۔ شاعر بلند مقام تھا۔ اول زبان ہندی میں دیوان اس عزیز نے جمع کیا ہے۔ اور نظم ریختہ کو سرزمین دکھن میں رواج اس نے دیا ہے۔ شعراء دکن میں مشہور و ممتاز ہے، اور اپنے معاصروں میں سربلند اور سرفراز۔ عالمگیر بادشاہ کی سلطنت میں ہندوستان کی طرف آیا، اور میاں گلشن کے فیض خدمت سے فائدہ انواع

وا قسام کا اُٹھایا۔ خوب خوب داد تلاشِ معنی کی دی، آخر اس بیتِ بے معنی وجود سے راہ کاشانۂ عدم کی لی۔ یہ اشعار اُس سربلند افکار کے ثبتِ جریدۂ روزگار ہیں +

پھر میری خبر لینے کو صیاد نہ آیا / شاید کہ اُسے حال مرا یاد نہ آیا

ولہ
بلبل و پروانہ کرنا دل کے تئیں / کام ہے تجھ چہرۂ گلنار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں / تشنہ لب ہوں شربتِ دیدار کا

ولہ
گذر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا / ہوا دھاوا مٹھائی پر مگس کا

ولہ
صحنِ گلشن میں جب خرام کیا / سروِ آزاد کو غلام کیا

ولہ
پھرتے ہیں سیہ مست ہو شمشیر نظر لے / بن بند آن انکوں کو پکڑ کون سکے گا
ہے نقش کناری کا ترے جامے کے اوپر / دامن کو ترے ہات لگا کون سکے گا

ولہ
جب تجھ عرق کے وصف میں جاری قلم ہوا / عالم میں اُس کا ناؤ جواہر رقم ہوا
نقطہ پہ تیرے خال کے باندھا ہے جس نے دل / وہ دائرے میں عشق کے ثابت قدم ہوا

ولہ
خدا نے منہ پہ ترے بابِ حسن باز کیا / قدِ بلند کو تیرے تمام ناز کیا

ولہ
تخت جس بے خانماں کا دشت ویرانی ہوا / سر اوپر اُس کے بگولا تاجِ سلطانی ہوا

ولہ
حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سے آزاد / طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ
حاکمِ وقت ہے تجھ گھر میں رقیبِ بدخو / دیو مختار ہوا ملکِ سلیمان میں آ
بسکہ مجھ حال سوں ہمسر ہے پریشانی میں / درد کہتی ہے مرا زلف ترے کان میں آ

ولہ
شغل بہتر ہے عشق بازی کا / کیا حقیقی و کیا مجازی کا
ہر زباں پر ہے مثلِ شانہ مدام / ذکر تجھ زلف کی درازی کا

ولہ
دل صدپارہ تجھ پلک سوں بندھا / خرقہ دوزی ہے کام سوزن کا

ولہ
آیا ہے نقل لینے ترے منہ کی تاب کی / تار خطوط سیتی بنا مسطر آفتاب کی

ولہ
بجا ہے گر شہیدِ سرو قد کو / بنا دیں چوبِ طوبیٰ کی تابوت

نکلا ہے بے حجاب ہو بازار کی طرف	وله	ہر بوالہوس کی گرم ہوئی ہے دکان آج
کیا ہے رفع مرے دردِ سر کو رونے نے	وله	ہوا ہے حق میں مرے خون دیدہ صندلِ سرخ
رحم سے بے جا ستم یہ بار ہے	وله	تو رقیباں اوپر کرم مت کر
جو آیا مست ساقی جام لے کر	وله	گیا یکبارگی آرام لے کر
میں اُس کو جوں نگیں کرتا ہوں سجدہ		جو کوئی آتا ہے تیرا نام لے کر
میں نے جانا تھا کہ تو نادان ہے	وله	دل دیا تھا تجھ کو دانا بوجھ کر
ہوں گرچہ خاکسار وسیلے از رہِ ادب	وله	دامن کو تیرے ہاتھ لگایا نہیں ہنوز
لبِ دلبر پہ جلوہ گر ہے خال	وله	حوض کوثر پہ جوں کھڑا ہو بلال
صنم کے لعلِ لب وقتِ تکلم	وله	رگِ یاقوت ہے موجِ تبسم
نہ جا آنکھوں میں آ بیٹھ دل میں اے شوخ	وله	کہ ہے خلوت میں اُس کی خوفِ مردم
ٹک ولی کو صنم گلے سے لگا	وله	تجھ کو ہے بندہ پروری کی قسم
اُس کے دہنِ تنگ کی تعریف کو میں نے	وله	صنعت سے ولی دیدہ عنقا پہ لکھا ہوں
خوبیِ اعجازِ حسنِ یار گر انشا کروں	وله	بے تکلف صفحہ کاغذ ید بیضا کروں
کیا کہوں تجھ قد کی خوبی سروِ عریاں کے حضور		خود بخود رسوا ہے اُس کو اور کیا رسوا کروں
سر کروں جب وصف تیرے جامۂ گل رنگ کا		جامۂ زیبوں کو بہ رنگِ جامۂ زیبا کروں
رات کو آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب		زیورِ لب ذکر سبحان الذی اسریٰ کروں
آرزو دل میں یہی ہے وقت مرنے کی ولی		سروِ قد کو دیکھ سیرِ عالمِ بالا کروں
یک بار اگر بات مری گوش کرے تو	وله	ملنے کو رقیبوں کے فراموش کرے تو
غیرت سے کرے چاکِ گریباں دلِ پُرخوں		گر گل کی حمائل کو ہم آغوش کرے تو
اے جانِ ولی وعدۂ دیدار کو اپنے		ڈرتا ہوں مبادا کہ فراموش کرے تو
ایسے نصیب میرے کہاں ہیں ولی کہ آج	وله	اُس گل بدن کو اپنے گلے ہار کر رکھوں

خوش قد اس دل کو بند کرتے ہیں | وله | نام اپنا بلند کرتے ہیں
اے سامری تو دیکھ مری ساحری کے تئیں | وله | شیشہ میں دل کو بند کیا ہوں پری کے تئیں
صحبت غیر میں جایا نہ کرو | وله | دردمندوں کو کڑھایا نہ کرو
اک دل نہیں آرزو سے خالی | وله | برجا ہے محال اگر خلا ہے
کیونکہ کپڑے رنگوں میں تجھ غم سے | وله | عاشقی میں لباس ہوتا ہے
رہیں گے خاک ہو تیری گلی میں | وله | وفاداری ہماری اس قدر ہے
دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن | وله | باعثِ خمیازۂ آغوش ہے
اب خلاصی عشق سے ممکن نہیں | دامِ دل زلفِ دوامی پوش ہے
نشہ بخش عاشقاں وہ ساقیِ گلفام ہے | وله | جس کی آنکھوں کا تصور بیخودی کا جام ہے
مفلسی سب بہار کھوتی ہے | وله | عشق کا اعتبار کھوتی ہے

ترا منہ مشرقی حسن انوری جلوہ جمالی ہے | وله | لبیں جامی جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے
مت تصور کرو مجھ دل کو کہ ہرجائی ہے | وله | چمن حسنِ پری رو کا تماشائی ہے
گل رخاں کیوں نہ کہیں تجھ کو سکندر طالع | جلوہ گر بر میں ترے جامۂ دارائی ہے
شیخ مت گھر سوں نکل آج تو خوباں کے حضور | گول دستار ترا باعثِ رسوائی ہے
اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق | کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

دل چھوڑ کے یار کیونکہ جاوے | وله | زخمی ہو شکار کیونکہ جاوے
چھوڑا ے شوخ طرزِ خودکامی | وله | مت ہو سر دیدہ باز کا دامی
جب تک نہ ملے شرابِ دیدار | وله | آنکھوں کا خمار کیونکہ جاوے
تجھ لب و زلف کے تماشے کو | وله | چل کہ آئے ہیں مصری و شامی

۲۔ ولی

ولی تخلص، میرزا محمد ولی نام، متوطن شاہ جہان آباد کے، بھتیجے ہیں شاہ اسرار اللہ صاحب ارشاد کے۔ علی ابراہیم خاں مرحوم نے گلزار ابراہیم میں لکھا ہے احوال اُس خجستہ کردار کا کہ جوانِ آزاد حال اور دوست ہے اس خاکسار کا۔ سنہ ۱۱۹۴ گیارہ سو چورانوے ہجری میں بلدۂ مرشد آباد کے اندر جائے قرار رکھتے تھے، اور بیشتر شغل اشعار، زبان ریختہ میں انہوں نے بہت کچھ کہا ہے، اور دیوان بھی ان کا منتظم ہوا ہے۔ یہ منتخب افکار اُس ستودہ اطوار کا ہے۔

نشۂ مے سے مرا پژمردہ دل گلشن ہوا | یہ چراغِ مردہ فیضِ آب سے روشن ہوا

وله

دل سے تجھے منظور رہو اُس کا اگر دیکھنا | جان سے دھو ہاتھ کو تب تو ادھر دیکھنا
زلف کو ہے کھولتا اپنے وہ منہ پر ولی | ملتی ہے آپس میں اب شام و سحر دیکھنا

وله

آہ کا اُس کو کچھ اثر نہ ہوا | میرے اس نخل میں ثمر نہ ہوا

وله

بےکسی پر مری کہے کوئی | تجھ بن اے نالہ نوحہ گر نہ ہوا

وله

صحبتِ نیکاں کرے دل میں بد دل کے کیا اثر | قند کب شیریں کرے ہوئے اگر بادام تلخ
کیا تمنا اُس شکر لب سے تو رکھتا ہے ولی | ہو گیا فرہاد کا شیریں سے آخر کام تلخ

وله

تھی آشنا نہ تیغ سے اُس کی کمر ہنوز | ہم تب سے ہاتھ پہ لئے پھرتے ہیں سر ہنوز
آنکھیں بھی انتظار میں پتھرا گئیں ولی | قاصد پر اُس صنم کی نہ لایا خبر ہنوز

وله

میری زبان تر سے نہ ہو تازہ کام خشک | کب سیر آب تیغ سے ہووے نیام خشک

وله

کبھی جو زلف اُٹھاوے تو منہ نظر آوے | اسی اُمید میں گذری ہے صبح و شام ہمیں

وله

زندگی کی اُس نے کچھ لذت ولی جانی نہیں | جس کے دل میں دردِ عشقِ دلبر جانی نہیں

وله

چاہے کیونکر کہ یہ جی تن سے نکل جانے کو | پھر نہ آیا جو گیا اُس کی خبر لانے کو

وله

عیاں گر کروں دل کے سوز نہاں کو | لگے آگ جل شمع میری زباں کو

کبھی درد کی چاشنی کو نہ بھولے — ہما کھا دے میرے اگر استخواں کو

وله
حد سے زیادہ رشتۂ الفت ہی مختصر — ایسا نہ ہو کہ اس میں پڑے اب جدا گرہ

وله
ہجر کی مارے ہی ڈالے ہے شب تار مجھے — کب دکھا دے گا خدا صبح رخ یار مجھے
دانۂ خال دکھا کر کیا تو نے صیاد — زلف کے دام میں آخر کو گرفتار مجھے

وله
جس جگہ عشق رخش تاختہ ہے — وہاں رستم حواس باختہ ہے
نگہ گرم سے پری رو کے — شیشۂ دل مرا گداختہ ہے

وله
جو اس لعل میگوں سے مدہوش ہووے — اسے ہر دو عالم فراموش ہووے

وله
بند قبا چمن میں جو وہ یار وا کرے — لے برگ گل کو ہاتھ میں پنکھا صبا کرے

باب الہاء

۱- ہدایت

ہدایت تخلص۔ شیخ ہدایت نام اس مرد کا ہے۔ شاہجہان آبادی۔ معتقد اور شاگرد خواجہ میر درد کا ہے۔ ایک مثنوی انہوں نے بنارس کی تعریف میں بہت خوب لکھی ہے۔ اور داد مضمون تراشی کی دی ہے۔ شاعر فصیح بیان ہے، اور ناظم شیریں زبان۔ دیوان مختصر زبان ریختہ میں طبع زاد سے اس کے ہے، اور گم شدگان راہ معنی کو بیشتر ہدایت اس کہن استاد سے ہے۔ یہ منتخب کلام اس شاعر بلند مقام کا ہے +

جب لول ہوں ترا نام ٹپک پڑتا ہے آنسو — جس طرح کہ سمرن کا ڈھلک جاتا ہے منکا

وله
جسے کہ زلف سیہ نے تری ڈسا ہوگا — غرض وہ مر ہی گیا ہوگا کیا جیا ہوگا

وله
جوں غنچہ ترے وصف میں ہوں سر بگریباں — ہے منہ میں زباں پر نہیں مقدور سخن کا

وله
نہ رحم اس کے ہے جی میں نہ دل میں ہے کچھ مہر — ہماری گذرے گی کیونکر الٰہی کیا ہوگا

وله
ہو گیا ہوں میں زرد جوں خورشید — تھا ہرا وقت ہے اخیر مرا

وله
تمام صبر و دل و دیں تو یار لوٹ گیا — نہ خلف وعدہ کیا پر ترا نہ جھوٹ گیا

بلا ہی زور سے ہے اس دختِ رز کا اے ساقی
خمار جس کا مرے ہاتھ پاؤں کوٹ گیا

ملا ہے جا کے یہ آخر کو سادہ رویوں سے
اگرچہ آئینہ تھا دل پہ ہم سے پھوٹ گیا

ہے آدمی کو بھی قیدِ حیات اک زنداں
کسی نے خوب کہا ہے موا سو چھوٹ گیا

ولہ

آتش سے داغِ دل کی سراپا میں جل گیا
گلزار ہوے کیا کہ بدن سارا پھل گیا

رو دے ہے کیا جوانی پہ اپنی کہ بے خبر
شب کیا گذر گئی ہے کہ اب دن بھی ڈھل گیا

لب پر نہا حرفِ شکایت کا تھا ہجوم
مکھڑے کے دیکھتے ہی یہ کچھ دل بہل گیا

ولہ

ہر لختِ دل سے گلے کا مرے ہار ہو گیا
گل تھا پر اپنی چشم میں یہ خار ہو گیا

ہے کس کے جی میں خواہشِ سیرِ چمن یہاں
سینہ تمام داغوں سے گلزار ہو گیا

آیا ہوں تنگ کشمکشِ دامِ زلف میں
یارو میں کس بلا میں گرفتار ہو گیا

بوسہ طلب کیا تھا فقط اور کچھ نہیں
میں اتنی بات کہتے گنہگار ہو گیا

کچھ ان دنوں سے ہے حال ہدایت ترا تباہ
کیوں میری جان کیا تجھے آزار ہو گیا

ولہ

عالم کو تیری چشم نے بیہوش کر دیا
جس کی طرف نظر گئی مدہوش کر دیا

جاتا رہا ہوں آپ بھی میں اپنی یاد سے
کیا جانئے کہ کس نے فراموش کر دیا

مجلس میں اس کی رات ہدایت نے سوزِ دل
یہاں تک کہا کہ شمع کو خاموش کر دیا

ولہ

نے جم رہا جہاں میں نہ یہ جام رہ گیا
مردوں کا اس جگہ میں مگر نام رہ گیا

کوئی پھرا نہ ملکِ عدم سے تو اب تلک
پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا

دیکھا جو تیرے چشم و دہن کو تو شرم سے
منہ اپنا لے کے پستہ و بادام رہ گیا

آتی ہے آج تجھ سے تو کچھ اور بوئے نسیم
رات اس چمن میں کون گل اندام رہ گیا

کیا دن تھے وہ بھی آہ ہدایت کہ جن دنوں
راتوں کو اپنے پاس وہ گلفام رہ گیا

مدت ہوئی ہے اب تو ملاقات بھی نہیں
آنے سے بلکہ نامہ و پیغام رہ گیا

ولہ

اک دن بھی مہرباں نہ وہ بے وفا ہوا
اے آہ و نالۂ سحری تم کو کیا ہوا

ہر ایک دانۂ انگور یہاں شراب ہوا
نہ صحنِ باغ میں لگتا ہے جی نہ صحرا میں
دیکھ اُس کی چشمِ مست کو دل تو بہک گیا
دیکھا نہیں ہے ہم نے ہدایت کو ان دنوں
عشق میں خوباں کے ہے طرزِ ستمگاری بہت
مار ڈالا ہند کے کافر اداؤں نے ہمیں

ولہ وصلے یہ آبلہ اپنا نہ کامیاب ہوا
ہوا ہوں آہ میں یارب کس انجمن سے جدا
ولہ بس میری جان دو ہی پیالوں میں جھک گیا
شاید کسی جگہ پہ دل اُس کا اٹک گیا
ولہ آہ دلداری ہے کم یہاں اور آزاری بہت
حسن میں ان کے نمک اور طرح دلی ہی بہت

نہ ملے کارِ دل سے ہم اسے والے
یار ہے ہم میں ہدایت جلوہ گر
پر نہیں معلوم ہرگز آپ کو
تیری زلفوں کی کچھ چلی تھی بات
دل تو سمجھا سے سمجھتا ہے کبھو
کٹتی ہی نہیں یہ ہجر کی شب

ولہ گرچہ گستا جرس پکار رہا
ولہ جس طرح ہو گوہرِ یکتا میں آب
آب میں دریا ہے یا دریا میں آب
ولہ روتے روتے ہی گذری ساری رات
ولہ پر ہدایت چشمِ تر کا کیا علاج
ولہ یارب کیا آج سو گئی صبح

تو نے گر قتل کیا ہم کو صنم خوب کیا
قیس روں مر گیا فرہاد کی وہ شکل ہوئی
تم نہ فریاد کسی کی نہ فغاں سنتے ہو
صبا لے ہاتھ آئی سُن تجھے گلشن میں آئی ہے
چولی مسک رہی ہے اور آنکھیں ہیں رسمی
کرتا نہیں ہے جانے کو دل کوئے یار سی
کیا خاک کو مری کہیں گلشن میں جا نہ تھی
سیرِ چمن ہوا دمے و صحبت ولستر
گلشن دوستی کے میں دیکھا چمن چمن

ولہ ہاں میاں سچ ہے کہ ایسے ہی گنہگار تھے ہم
آہ اس کوہ و بیاباں میں کئی یاس تھے ہم
ولہ اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو جاں سنتے ہو
ولہ یہ نرگس باوجود اس کے کہ ہے معذور آنکھوں سے
ولہ سچ کہیو ہم سے رات پیاری کہاں رہے
گو اس میں جی رہے نہ رہے ہم تو یہاں رہے
ولہ پر چشم تجھ سے ملائے مجھے یہ صبا نہ تھی
ایسی گئی کہ ہم سے گویا آشنا نہ تھی
جز بوئے خونِ دل کہیں بوئے وفا نہ تھی

ضعف سے بیٹھا ہیں جوں نقش قدم تو کیا ہوا	ولہ	گرد باد آسا مری طینت میں ہے آوارگی
ہوتے جب صد عیش و عشرت ہم کو تیرا دیکھنا	ولہ	مل گئے جس دن گلے تیرے سے اُسی دن عید ہے
دل مرا کیوں کر ہو غافل گور سے	ولہ	گھر نظر آتا ہے اپنا دور سے
آنکھ سے آنسو کبھو تھمتا نہیں		چشم بھی کیا کم ہے یہ ناسور سے
دل نہ کر تو شکوۂ جور بتاں		فائدہ کیا یار اس مذکور سے
گر نیت یہی جور اور جفا ہے	ولہ	بندے کا بھی اے بتاں خدا ہے
غرض یہی ہے مجھے اشک کے بہانے سے		کہ مہرباں ہو وہ یا لب کسی بہانے سے
برنگ اشک اُسے آبرو ہے دنیا میں		جو اپنے گھر میں ہی محفوظ آب و دانے سے
وہ کیا کرے کہ محبت کا اقتضا ہے یہی		وگرنہ فائدہ اُس کو مرے ستانے سے
کہیں جو مہر و وفا ہو جہاں میں یا اخلاص		الٰہی اُٹھ گئی یہ رسم کیا زمانے سے
میں چھوڑتا ہوں کوئی اُس کو مثل حلقۂ در		یہ سر لگا ہے مرا اس کے آستانے سے
آنکھوں نے تری جس کے تئیں مست کیا ہے	ولہ	وہ شور قیامت ستی ہشیار نہ ہووے
آتا ہے مجھے رحم ترے حال پہ زاہد		اے وائے اُس اوپر کہ جو مے خوار نہ ہووے
کیا کہوں تجھ سے ہدایت کہ مری شام و سحر	ولہ	یاد میں زلف و رخ یار کے کیونکر گذری
دن گذرتا ہے مجھو روز قیامت سے دراز		رات گذری تو شب گور سے بدتر گذری
پختہ مغزانِ جنوں سے ہے کسی کو جنگ سے	ولہ	جو ثمر پکا سو پامالِ جفائے سنگ ہے
عشق نے تیری مجھے یاں تک کیا ہے ناتواں		تا بہ لب آتا نفس کو راہ صد فرسنگ ہے
ان دنوں کچھ تو ہدایت ہو گیا ہے زرد سا		ظاہرا عاشق کسی پر ہے ترا کیا رنگ ہے
صدقے ترے گلعذار جی سے	ولہ	اک جی سے ہیں کیا ہزار جی سے
کھٹکے ہے تری مژہ ہر اک وقت		نکلا نہ کبھو یہ خار جی سے
گھر سے نکلے ہے تو جی ساتھ نکل جاتا ہے	ولہ	کوئی قامت ہے کہ یہ آہ دلِ محزوں ہے

زلفِ کج منہ اوپر جو چھوڑی ہے	وله	کیا یہ صید ہے نکلتا تھوڑی ہے
چشمۂ خوں سے ہے دامن دریا		آستیں کس نے یاں نچوڑی ہے
شاخ گُل خم نہیں کسو نے کیا		ہاتھ معشوق کے مڑوڑی ہے
عمر کوتاہ کارِ عمر دراز		ساتھ ہے بہت رات تھوڑی ہے
ایک وہ ماہ رو غائب ہے نظر سے ورنہ	وله	وہی تارے ہیں وہی ماہ وہی گردوں ہے
ہے خوب سیر کی جگ میں ہر ایک بستی کی	وله	بنا خراب ہو بنیادِ بت پرستی کی
ہمیں نشیبُ فرازِ زمانہ سے کیا کام		جو سربلند ہیں اُن کو ہے فکر پستی کی
جی تو گلشن میں بھی نہیں لگتا	وله	کس کی مجلس سے ہم اُداس گئے
جب سُنا میں نے غم ہدایت کا		سُنتے ہی بس مرے حواس گئے
جاؤں نکل میں دشت میں یا شہر میں پھروں		کوئی ایسی شکل ہو دے کہ ٹک جی بہل سکے
شہیدِ تیغ ابرو ہی اسیر دام گیسو ہے	وله	ہدایت بھی تو کوئی زور ہی شہدِ شکستہ ہے
ثابت کوئی اپنے جسم و جاں سے نہ پھرا	رباعی	یک شخص ہزار کشتگاں سے نہ پھرا
کوچہ تو ترا رہِ عدم سے نہیں کم		جو کوئی گیا سو پھر وہاں سے نہ پھرا
دلِ عہد شباب ہو چکا ہے باقی	رباعی	پیری ہے سو اس میں کیا رہا ہے باقی
ہوتا ہے کوئی دم میں یہ دور لب آخر		شب گذری ہے صدف رہ گیا ہے باقی

باب الیاء

یقین

یقین تخلص، انعام اللہ خاں نام شاہ جہان آبادی۔ بیٹا اظہر الدین خاں، اور نواسا شیخ مجدد الف ثانی کا تھا۔ شاگرد میرزا مظہر جان جاناں کا۔ مشہور اور منظورِ نظر مرزائے مذکور۔ اکثر یہ گمان باشندگان شاہ جہان آباد کو تھا، کہ یقین فنِ شعر و شاعری میں محض بے استعداد تھا۔ مرزا مظہر خود شعر کہتے تھے، اور نام اس کا داخل اشعار

کرتے تھے۔ مارے جانے کو اس کے بعضے تو یوں نقل کرتے ہیں کہ احمد شاہ بادشاہ کے عہدِ سلطنت میں بہ سبب کسی حرکت نامعقول کے، کہ وہ صادر نہ ہوئی تھی یقین سے، باپ نے اس کے اس کو قتل کیا، اور نعش کی اس کو دریا میں بہا دیا۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ ارتکاب اس عملِ شنیع کا گذرا تھا اس کے باپ کے دھیان میں کہ وہ ممنوع ہے جمیع ادیان میں، یقین نے اس مقدمہ میں باپ کو اکثر متنبہ کیا۔ ایک دن اس نے خفا ہو کر اس بیچارے کا جی ہی لیا۔ علم غیب کا بدرستی خدا کو ہے، اہلِ یقین گمانوں کا بالکلیہ اس خالق ارض و سما کو ہے۔ بہرحال یقین مذکور کا کلام طبائع کے مرغوب ہے، اور اشعار اس کے جاں خراش و دل کوب۔ یہ ابیات آبدار اس کا خلاصہ افکار ہیں ◆

نہ مرتا میں اگر صدقے ترے جانے کی کام آتا		گرسنہ ناز کا تھا گالیاں کھانے کے کام آتا
میں تو ظاہر نہ کروں اس کی جفا کو لیکن	ولہ	چھپ سکے کیونکہ یقیں زخم نمایاں میرا
مجھے گر حق تعالیٰ کارفرمائے جہاں کرتا	ولہ	بتوں کو میں بہ بندانِ بیکسوں پر مہرباں کرتا
نہ دیتا عیش کی خسرو کو فرصت قصرِ شیریں میں		جو میں ہوتا بجائے تیشہ جوئے خوں رواں کرتا
اگر مر کر نہ میں اس شوخ کی خاطر نشاں ہوتا		خدا جانے وفا میرے کے حق میں کیا گماں کرتا
زباں فولاد کی ہو تب جوابِ کوہکن دیوے		ستم ہوتا اگر پرویز کو عشق امتحاں کرتا
نہیں معلوم اب کے سال میخانے پہ کیا گذرا	ولہ	ہماری توبہ کرنے سیتی پیمانے پہ کیا گذرا
برہمن اپنے سر کو پیٹتا تھا دیر کے آگے		خدا جانے مری صورت سے بتخانے پہ کیا گذرا
یقیں کب میرے سوزِ دل کی داد کو پہنچی		کہاں ہے شمع کو پروا کہ پروانے پہ کیا گذرا
ہیں زخم مرے کاری اس سینے سے کیا ہوگا	ولہ	اب مرنا ہی بہتر ہے اس جینے سی کیا ہوگا
اگر تجھ کو زلیخا دیکھتی سب کچھ بسر جاتی	ولہ	تماشا ماہِ کنعانی کا اس کو خواب ہو جاتا
سریرِ سلطنت سے آستانِ یار بہتر تھا	ولہ	ہمیں ظلِ ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا
مرا دل مر گیا جس دن سی نظارہ سی باز آیا		یقیں پرہیز اگر کرتا تو یہ بیمار بہتر تھا
تنگ دل کو کب بھلی لگتی ہے بستاں کی ہوا	ولہ	باغ سے یوسف کو رنگیں تر ہے زنداں کی ہوا

وله
نہ اب تیشہ فرہاد اپنے خوں میں گر لا سکتا — تو ایسے رنگ سے کب نقش شیریں کو بنا سکتا
یہ عشق شکر شکن فرہاد پر لایا جو کچھ لایا — مگر وہ کون ایسی فتح خسرو کو دلا سکتا

وله
تجھ آنکھوں سے اُتر کر دل نہ کرتا شور کیا کرتا — یہ شیشہ طاق سے گرتا نہ ہوتا چور کیا کرتا

وله
یہ دل ایسا خرابِ کوچہ و بازار کیوں ہوتا — اگر ملتا نہ اتنا گل رخوں سے خوار کیوں ہوتا
تری اُلفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ — یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا
یقیں اُمید جینے کی نہیں تیری ان آنکھوں سے — اگر پرہیز تو کرتا تو یوں بیمار کیوں ہوتا

وله
گرا میں آنکھ سے تیری جہاں کے ہاتھ کیا آیا — مجھے پٹکا زمیں پر آسماں کے ہاتھ کیا آیا
نہ کہتی رازِ دل تو اتنی رسوائی بھلا سہتی — فضیحت کر کے مجھ کو اس زباں کے ہاتھ کیا آیا

وله
کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کا بند — برگِ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہو گیا

وله
دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک — دیکھا سوا اس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

وله
اس قدر غرق لہو میں یہ دلِ زار نہ تھا — جب حنا کو ترے پاؤں سے سروکار نہ تھا
حسن کا عشق زلیخا سیتی کچھ چل نہ سکا — ورنہ وہ پاک گہر قابلِ بازار نہ تھا
دل مرا عشق کے دھڑکوں سی مُوا جاتا ہے — یہ وہ دل ہے کہ کوئی ایسا جگر دار نہ تھا
دل میں زاہد کے جو جنت کی ہوا کی ہے ہوس — کوچۂ یار میں کیا سایۂ دیوار نہ تھا

وله
اتنا کوئی جہاں میں کبھو بے وفا نہ تھا — ملنے میں تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا
ناصح جو یہ نصیحت بیجا ہے میں سُنی — معذور رکھیو مجھ کو مرا دل بجا نہ تھا

وله
خفیف مجھ سے اُلجھ کر عبث ہوا واعظ — کہ میں تو مست تھا اس کو بھی کیا شعور نہ تھا

وله
تری آنکھوں کی کیفیت کو مے خانے سے کیا نسبت — نگہ کی گردشوں کو دورِ پیمانے سے کیا نسبت

وله
بتاں کی مجھ سی خاطر جمع ہے یہاں تک کہ کہتے ہیں — کہاں اس دام سے یہ صید جا سکتا ہے کیا طاقت
ہمارا شور سُن مجنوں کو بھولی طرز نالے کی — کوئی شیر دل کے منہ پر نے بجا سکتا ہے کیا قدرت

وله
شیشۂ دل کے تئیں اپنے سنبھالے رکھیں — پھر کرے گا کون اس کی پھوٹ جانے کا علاج

سو جگہ سے دل گریباں پھاڑ دیوانے کی طرح
جی نکل جاتا ہے میرا جب کبھو آتی ہے یاں
خار سے مژگاں کی ہی ڈر تک ہے میرا بے طرح
فصلِ گل بھی آن پہنچی دیکھیے کیا ہو یقیں
گرچہ شیریں سخن کے ہے وجد میں آنے کا شور
آہ و نالہ پہ نہیں موقوف شہرت عشق کی
دل ہمیں کہہ کر چلا تھا اپنے جانے کی خبر
بلبلیں سہم چلی جاتی ہیں باغوں کی طرف
نہیں پہنچا ضعف سے نالہ مرا صیاد تک
توقع دے کے مت کہ ناامیدی کی سخن بس کر
جو لوہا جس نہ دی اس کو لگانا ہاتھ کیا حاصل
خال گورے منہ کا لیتا ہو مرے دل کو چرا
گریباں پھاڑتے ہیں دیکھ خوبانِ چمن کیونکر
کوئی محنت کوئی لذت اٹھاوے یار سے کوئی
تعجب سخت رہتا ہے یقیں اس بات کا مجھ کو
بعد مرنے کے ہوں میں گور میں غمناک ہنوز
منہ پہ کھاتا ہو اسی طرح سے تلوار کہ بس
نزع میں دیکھ کے مجھے یار جھجک کر بولا
آپ کو بیچ کے یوسف نے زلیخا کو لیا
آپ سے ہم نے مقرر کی ہے اپنی جا قفس
تنگ تو کرتا ہو پر ہم جو کہیں جاتے رہیں

وله زلف کی زنجیر میں آخر پھنسا شانے کی طرح
وہ قسم کھا کر اسی ساعت کھلنے کی طرح
وله رکھ مری آنکھوں پہ دیتے ہو کفِ پا یکطرح
اب کے چلتا ہے جنوں پر دل ہمارا بے طرح
وله پر قیامت بانگ ہوتا ہے مغاد کا شور
کس قدر ہے اس خموشی ساتھ پروانے کا شور
وله پھر نہ دی ہم کو کسی نے اس دیوانے کی خبر
کچھ تو اڑتی سی سنی ہے گل کے آنے کی خبر
کون لے اس ناتواں کی اب دوانے کی خبر
وله جواب تلخ مت دے مجھکو اے شیریں دہن بس کر
بہت کی تو نے اس تیشہ کی خدمت کوہکن بس کر
اس نگر میں چاندنی راتوں کو بھی پھرتے ہیں چور
وله نہ کیجے چاک ناصح اس ہوا میں پیرہن کیونکر
کہو اپنے تئیں ضائع نہ کرتا کوہکن کیونکر
کہ اتنا بولتے ہیں تلخ یہ شیریں دہن کیونکر
وله گرد پھرتے ہیں مری خاک کے افلاک ہنوز
وله دل مرا عشق میں ایسا ہے جگردار کہ بس
کیا بری طرح سے مرتا ہے یہ بیمار کہ بس
کیا خریدار یہ پایا ہے خریدار کہ بس
وله ورنہ تنگ پھڑکیں تو ہو جاوے تہ و بالا قفس
تو پڑا منہ دیکھتا رہ جائے گا تنہا قفس

ولہ
آج دیکھی ہی میں وہ لطف کی بیداد کہ بس — سر پہ آیا مرے اس طور سے جلّاد کہ بس
جی میں آتا ہے تری جیب کو گرد کھادیجے آسے — باغ میں اتنا اکڑتا ہے یہ شمشاد کہ بس
کچھ پر و بال میں طاقت نہ رہی جب چھوٹے — ہم ہوئے ایسے بُرے وقت میں آزاد کہ بس
تو نہ تھا حیف یقیں ورنہ دیوانہ ہوتا — آج اس طرح کا دیکھا ہے پریزاد کہ بس

ولہ
عاقبت تن پروری ہوتی ہے گردن کا وبال — کس قدر پہلوی چرب اپنے سی دُکھ پاتی ہی شمع
اہلِ نور آہن دلوں کو دیکھ شرماتے ہیں سخت — دیکھ کر گل گیر کی صورت کو ڈر جاتی ہی شمع

ولہ
یہ نہیں ہوتا کسی مرہم سے اس سینہ کا داغ — ہو گیا ناسور آخر یارِ دیرینہ کا داغ

ولہ
ہم تو مرتے ہیں گے اور بجھتا ہی اُلفت کا چراغ — دیکھیئے پھر ہووے کب روشن محبت کا چراغ
خاندانِ درد مجھ سے کیوں نہ ہو روشن یقین — ہے مرا ہر داغ سینہ میں مصیبت کا چراغ

ولہ
تا صبح سے مجھ کو غم نے کیا شرمسار حیف — سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف
دل نہیں کھنچتا ہی بن تیرے بیاباں کی طرف — خوش نہیں آتا نظر کرنا غزالاں کی طرف
اس ہوا میں رحم کر ساقی کہ بے جامِ شراب — دیکھ کر چھاتی بھری آتی ہے باراں کی طرف
سحر کے ڈورے جو سنتے تھے سو یہ دیکھے یقیں — دل کھنچا جاتا ہے اُس زلفِ پریشاں کی طرف
آئینہ ہوتا ہی اُس روئے درخشاں کا حریف — ماہ بن اور کون ہو خورشیدِ تاباں کی طرف

ولہ
بہت جینے کی تدبیر اہلِ عرفاں کو نہیں لائق — کہ پینا آبِ حیواں شانِ انساں کو نہیں لائق

ولہ
رشک سے لاگے ہے پروانے کے جیسی تن کو آگ — لگ گیا ہی فانوس ایسی تیرے پیراہن کو آگ
جلتے تبوں سی کل اُن تیلیا کپڑوں کے ساتھ — جی دھڑکتا ہی مبادا لگ اُٹھے دامن کو آگ

ولہ
چمن میں مجھ سی دیوانے کو لے جانیکا کیا حاصل — دکھا کر گل جنوں کو شور پر لانے کا کیا حاصل
جنہیں بالوں کی پھانسی دی ہی دی ہرگز نہیں جسے — جو زلفوں میں پھنسا دل اُس کے غم کھانے کا کیا حاصل
ہمارے درد کی دارو اگر کچھ ہی تو دارو ہے — یہ سب کچھ سُن کر ساقی بات پی جانیکا کیا حاصل

ولہ
ہم نہ کہتے تھے کہ مت چھیڑ اُن دنوں عیاروں کے تئیں — خط کی صورت میں پڑا آخر نہ آہوں کا وبال

اس تغافل ساتھ میرے سامنے سے در گذر — ہے طرح پڑتا ہی حسرت کی نگاہوں کا وبال

وله

ہاتھ لگتا گر زبان مصر کو یہ آفتاب — خواب ہو جاتا اُنہیں اس ماہ کنعاں کا خیال

وله

ہے ہوئی آخر یہی تدبیر غم کی ناتمام — کس سے دل خالی کریں اب ہو چکا ملنا تمام

وله

تیری آنکھوں میں نشہ نے اس طرح ملا ہی جوش — ڈولتے ہیں جس طرح بدمست میخانے میں دھوم

وله

کروں کیونکر میں قید زلف سے چھٹنے کی تدبیریں — پڑیں ہیں میرے ہر انگشت میں جوں شانہ زنجیریں

ہمیں بھی بات کہ آتی ہے لیکن دل نہیں حاضر — حیا سے دور ہے ناصح خموشی ساتھ تقریریں

یقیں اقبال ہاتھ آیا نہیں کچھ جی کے جانے سے — نہیں ہووے گی ہم فرہاد کو سو بار سر چیریں

وله

چمن میں شاخ ہل جاتی ہی جیسے گل کے ہلنے سے — لچک جاتا ہے دم لیتے نزاکت اس کو کہتے ہیں

وله

زخم بن مجھ کو کچھ اس لاگ سے مقصود نہیں — عشق پھیکا ہی اگر داغ نمک سود نہیں

ہے اُسی تیغ کے زنگار کا مرہم درکار — اور کسی طرح مرے زخم کا بہبود نہیں

وله

کرتا ہی کوئی یار وِاس وقت میں تدبیریں — مرتا ہے یہ دیوانہ اب کھول دو زنجیریں

ناداں ہی جو معنی چھوڑ صورت کی طرف جاوے — لڑکوں کو کتابوں سے منظور ہیں تصویریں

چہرے سے نکل کر جو لپٹے ہیں تقیں منہ پر — اوراق طلائی پر جوں کھینچی ہیں تحریریں

وله

کوئی دن اور کر لے دو جنوں مجھ کو بہاراں میں — عبث سیتے ہو اُس کو کیا رہا ہے اب گریباں میں

چمن کے بیچ کلیاں ہے جیسے شاخ سنبل کی — ہوئی ہیں کس قدر دل جمع اُس زلف پریشاں میں

وله

بہار آتی ہی ہم کو کیا کہے گا باغباں دیکھیں — چمن میں باندھنے پاویں گے اب آشیاں دیکھیں

اٹھا اس منہ سے اے باد صبا گھونگٹ کی آنچل کو — تو جب سے تری ہم بھی ٹک اک یہ گلستاں دیکھیں

وله

نہ کر خجل مجھے ملال مرا نہ ہوا اے عشق — کہ میری آنکھ میں آنسو جگر میں آہ نہیں

وله

تو نے ہم پر جو جفا کی ہے سو منظور نہیں — بس یہ ہم نے جو وفا کی ہے سو منظور نہیں

سینہ میں ترے عشق سے جو شاں ہی عمل — کون ناسور ہے جو مرہم کا محتاج نہیں

دین و دنیا کی مجھے کام سے کہتا ہے یقیں — چھوڑوں عشق نہ باللہ کہ مقدور نہیں

خدا کی بندگی کیجئے اُسے یا عشق معشوقی
وله
وہ نسبت ایک سے سو سو طرح تعبیر کرتے ہیں

سو سو ہیں التفات تغافل میں یار کے
بیگانگی سے اُس کی کوئی آشنا نہیں

شیریں دہن بھی تلخ لگے بولنے یقیں
اب چھوڑ دے نظارہ کہ کچھ اس میں مزا نہیں

وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں
وله
اُس آفتاب کا کس ذرہ میں ظہور نہیں

ترے سفر کی خبر سُن کے جان دم لبوں سے
جو پہنچوں مرنے کے نزدیک میں تو دور نہیں

کوئی بھی دیتا ہے لڑکوں کے ہاتھ شیشۂ دل
یقیں میں غور سے دیکھا تو کچھ شعور نہیں

جس محبت میں نہیں ہے شور ہے وہ بے نمک
وله
کیا مزا ہے عشق کرنے میں جو رسوائی نہیں

بن یقیں کے باغ میں جا کر بتاں کہتے ہیں سب
سیرِ گل سے جی نہیں لگتا وہ سودائی نہیں

شکوہ جفا کا یار سے کرنا وفا نہیں
وله
بندہ کو اعتراض خدا پر روا نہیں

اگر ستم ہو عاشق دم نہ مارے یار کے آگے
وله
کہ اُس کا جی نکل جاتا ہے اُس کی ایک تیکن میں

گالی بھی پی گئے ہیں ماریں بھی کھائیاں ہیں
وله
کیا کیا تری جفائیں ہم نے اُٹھائیاں ہیں

ایسا دراز دامن میں ہاتھ اُن کے آیا
بختوں کی عاشقوں کے کیا نارسائیاں ہیں

حق کو یقیں کے آخر برباد مت دو یارو
تم نے سخن کی طرزیں اُس کی اُڑائیاں ہیں

قامتِ رعنا سے تیرے بس کہ شرماتا ہے سرو
وله
دیکھ کر تجھ کو زمیں کے بیچ گڑ جاتا ہے سرو

تم ہمیں پامال یوں کرتے ہو اب خوش قامتو
دیکھتے ہو قمریوں کو سر پہ بٹھلاتا ہے سرو

کھڑا ہے سرو نپٹ بن بنا کے رعنا ہو
وله
جو یار پردے سے نکلے تو کیا تماشا ہو

نہ لاتا تھا مرے گریہ کو شور پر اے عشق
بڑی بلا تو نے چھیڑی ہے دیکھئے کیا ہو

خونِ انصاف سے اتنا بھی زباں تر نہ کرو
وله
لعل کو یار کے ہونٹوں سے برابر نہ کرو

باندھ کر مجھ پہ کمر لطف نہیں غیر کا قتل
اپنی بیداد کے مضموں کو مکرر نہ کرو

کوئی یہ چاند سا مُنہ چھوڑ کر عاشق ہو شعلہ کا
وله
گذر آتش پرستی سے یہ پروانے سے کہہ دیکھو

ستائے مت یقیں کا دل کہ خوباں کا مسکن ہے
وله
خدا جانے کہ کیا ہو اس کے مرجانے کو مت چھیڑو

جفا کے عذر میں اسے ظالمو نہ دیر کرو
حنا کی طرح میں اپنا بسمل کیا ہے خوں
خدا کرے کہ کہوں حق شتاب ثابت ہو
جو تو شراب پیے کیونکہ دل کباب نہ ہو
تنک گذرتے ہیں ایام عشق داغ بغیر
دیوانے شہر سے یہاں آکے جی چھپاتے ہیں
بتاں کی وجہ نہیں حسنِ خلق و دامنِ پاک
یقیں بتاں کا ہوا جب سے بند ہے بے داغ
شہر میں تھا نہ ترے حسن کا سا شور کبھو
فکر مرہم کی مرے واسطے مت کر ناصح
گو نہ کر وعدہ وفا دے مجھے اس کا تو جواب
اپنی بیداد کی سوگند ہے تجھ کو اے مرگ
خواب میں کس طرح دیکھوں تجھ کو بیخوابی کے ساتھ
مفت نہیں لیتے وفا کو شہر خوباں میں یقیں
بہار آئی ہمیں کیا حکم ہو اے باغباں سچ کہہ
تنک ڈالا ہے مجھ میں اے جفا شورِ محبت نے
یقیں راتوں کو کر کر شور نیندیں سب کی کھوتا ہے
کچھ عمر نہیں باقی پیاسے تو شتاب آجا
منہ اپنے کو گلشن میں ہنسنے نہ دیا کر تو
روداد محبت کی مت پوچھ یقیں مجھ سے
عمر میں تو نے تو دیکھے ہیں بہت غم خانے

وله
مری زباں پہ شکایت پست دلیر کرو
بتاں شہید کرو خواہ دستگیر کرو
مت امتحانِ وفا میں یقیں کے دیر کرو

وله
لگے جب آگ کہاں تک یہ زہر آب نہ ہو
کہ سرد ہووے ہوا جس دن آفتاب نہ ہو
خدا کرے یہ خرابہ کبھی خراب نہ ہو
وہ کیا مزا ہے جو معشوق بد شراب نہ ہو
جو ہووے کافر اسے کس طرح عذاب نہ ہو

وله
مصر اس جنس سے آنا نہ تھا معمور کبھو
خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کبھو
مجھ سے ملنا ہی سخن ہے تجھے منظور کبھو
تو نے دیکھا ہے یقیں سا کوئی رنجور کبھو

وله
جمع آسائش کہاں ہوتی ہے بیگانے کے ساتھ
کس قدر بے قدر ہے یہ جنس نایابی کے ساتھ

وله
چمن میں رہنے پاوے گا ہمارا آشیاں سچ کہہ
کبھو کھائی ہیں تو نے اس مزے کی استخواں سچ کہہ
یہ کس سے درد سیکھا ہے فریاد و فغاں سچ کہہ

وله
ڈرتا ہوں چھلک جاوے لبریز ہے پیمانہ
یہ سبز تمہارے خط کا ہے سبزۂ بیگانہ
کچھ خوب نہیں سنتا افسوں ہے یہ افسانہ

وله
آ تو اسے جمع تک اک اس دلِ ناشاد کو دیکھ

وله
کہاں تاثیر نالوں میں ہے ای مرغِ سحر چپ رہ
عبث صیاد کو ناخوش ہے کیوں کرتا بس چپ رہ

وله
جب ہوا معشوق عاشق دلربائی کیا کرے
بندگی سے جس نے خوکی ہو خدائی کیا کرے

وصل کی گرمی سے مجھ کو ضعف آتا ہے یقیں
دیکھیے مجھ ساتھ خوباں کی جدائی کیا کرے

وله
کیا دل ہے اگر جلوہ گہِ یار نہ ہووے
ہے طور سے کیا کام جو دیدار نہ ہووے

دل جل جو گیا خوب ہوا سوختہ بہتر
وہ جنس کوئی جس کا خریدار نہ ہووے

وله
دیوانے کس طرح نہ اُٹھاویں ہاتھ طفلاں سے
کہ ہے کشتِ جنوں سیراب اُن کو سنگ باراں سے

وله
یار کب دل کی جراحت پہ نظر کرتا ہے
کون اُس کوچہ میں جز تیر گذر کرتا ہے

اپنی حیرانی کی ہم عرض کریں کس مُنہ سے
کب وہ آئینہ پہ مغرور نظر کرتا ہے

،
عمر فریاد میں برباد گئی کچھ نہ ہوا
نالہ مشہور غلط ہے کہ اثر کرتا ہے

وله
جو سر پاؤں پہ رکھ دیجے تو خوش ہوویں میل ہم سے
ولیکن ہائی ہو سکتی ہے یہ جرأت کہاں ہم سے

وله
مرے آنسو بھی مارے ضعف کے اب چل نہیں سکتے
کیا اے عشق مجھ کو ہاے ایسا ناتواں تو نے

وله
خطا ہے مفت سر کر یار کیوں دیجے رقیباں کو
ہماری ہم سے پوچھو کوہکن کی کوہکن جانے

وله
اگر دیتے ہو دل کی داد جتنا اُس کا جی چاہے
تو کرنے دو اُسے فریاد جتنا اُس کا جی چاہے

نہیں ممکن کہ ہم کعبہ کو جاویں چھوڑ بت خانہ
کرے واعظ ہمیں ارشاد جتنا اُس کا جی چاہے

وله
نہیں کوئی کہ دشنام اُس کی ہم تک یا دعا لاوے
گیا ہے اب اُس کو دیکھئے کب تک خدا لاوے

پڑے پتھر الٰہی اس محبت پر کہ ہو بے کس
مرے فرہاد اور پرویز و شیریں کو اُٹھا لاوے

دیارِ حسن میں تو خوش ہوا پر یہ پڑی مشکل
کہ لُٹ جاتا ہے وہاں جو کارواں حسن و فا لاوے

مناسب نہیں ہے شکوہ اور کا ان خوب رویوں سے
یقین کوئی بُری باتوں کو اچھے منہ پہ کیا لاوے

وله
زمیں پر جس طرح گرتا ہے سایہ سروِ رعنا کا
تری قامت کے آگے فرش ہو جاتی ہے رعنائی

نہیں ہوتے کبھو احباب کی خاطر ملول اُس سے
خدا شاہد ہے عجب یہ مصاحب ہے یہ تنہائی

وله
معاذ اللہ میں وفا کے جو یہ جفا ہووے
کبھو کسو سے کوئی کیونکر آشنا ہووے

اگرچہ غیر ہیں یاد کر نہیں سکتا | کبھو بُرا ہی ہمیں کہ ترا بھلا ہووے
یقیں ہوا ہے مجھے قطرے سرِ اشک کے معلوم | نہ اٹھ سکے کوئی جو آنکھ سے گرا ہووے

ولہ
خبر کیا پوچھئے مرغِ قفس سے آشیانے کی | اسیروں کو توقع کب ہے پھر گلشن میں جانے کی
گئے کب سے شرح گلیں اور پرواز اول میں | نہ دی فرصت زمانے نے ہمیں دو میں بچانے کی
سو ہا جاتا ہوں مت آتا ہی کس کر باندھ بالوں کو | ٹک اک ڈھیلی تو کر دے جان زنجیریں دوانے کی

ولہ
زنجیریں بالوں کے پھنس جانے کو گیا کہہ | کیا کیا کیا یہ دل نے دیوانے کو کہا کہو
دل چھوڑ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا | اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہیے

ولہ
دکھ تو دیتا ہے کروں تجھ کو بھی حیران تو سہی | باغباں ایک اجازت لوں گلستاں تو سہی

ولہ
منت کب آنہ کرتی ہے گرفتاری مجھے | جی ہی لے چھوڑے گی آخر کو یہ بیماری مجھے
کب ہوس ہے مجھ کو رسوائی کی لیکن کیا کروں | کھینچ کر لاتی ہے اس کوچہ میں ناچاری مجھے
کیا لگا لیتا ہے خوباں کو تقیس کرتی ہی دریغ | آئینہ کی سادہ لوحی سا تہ پرکاری ہے مجھے

ولہ
جس کو منظور ہو جینا اسے مرنا ہو عذاب | ہے دمِ پاک مسیحا دمِ شمشیر مجھے

ولہ
بے قراری کب ٹھہرنے دیتی مجھ کو زیر تیغ | مانا سیماب کا مشکل ہے قاتل کیا کہوں

ولہ
ستم ہے قید کرنا اس طرح کے مرغ ناداں کو | کہ جو مارے بھلائی کے قفس کو آشیاں سمجھے

ولہ
کرتے ہیں اپنے بال و کھا مبتلا مجھے | اس پیچ سے بتاں کے نکالے خدا مجھے
جورو جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر | کرتے تو کیں پہ راست نہ آئی وفا مجھے

ولہ
خدا مجھے ترے داغوں سے لالہ زار کرے | یہ خارِ خشک مگر آگ سے بہار کرے
قیامت آپ پر اُس قد سے اچکے ہم تو | کہاں تلک کوئی محشر کا انتظار کرے

ولہ
اس بہشتی پوش سے آغوش رنگیں کیجئے | جی میں ہے اک مصرع موزوں کو تضمین کیجئے
نگاہ گرم سے کھا وہی تاب سو کس طرح | خدا کسی کے تئیں اتنا خوش کمر نہ کرے

ولہ
یہ دل ملوک ہے خوباں کا کون اس کو پہچانے | بغل میں کون مالِ بادشاہی کو دبائے

عجب کیا ہو تری خشکی کی شامت سے جو تو زاہد | نہال تاک ٹیلاوے تو وہ مسواک ہو جاوے

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے | وله | مزا بُرا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

یہ کون ڈھب ہے ہمیں خاک میں ملانے کا | کسو کا دل کبھو پاؤں تلے ملا بھی ہے

قیس کا شور جنوں سُن کے یار نے پوچھا | کوئی قبیلۂ مجنوں میں کیا رہا بھی ہے

خوش آئی ہم کو یہ بات اُس مجنونِ عریاں سے | وله | کیا کیجے کہاں تک چاک گذری ہم گریباں سے

نہیں ہو جامِ مے بن کچھ ہمارا خونبہا ساقی | وله | اس آبِ زندگی سے اپنے یاروں کو جلا ساقی

ٹک اک تو رحم کر اے مرگ مے کی تمنا میں | ہماری جان کو روتی ہیں یہ ابر و ہوا ساقی

وفا کا کیا قیامت ہے کوئی بدلا جفا دیوے | وله | ترحم ان بتوں کو اپنے بندوں پہ خدا دیوے

نہیں پرواز قسمت میں میری اُڑا | وله | خفا ہو زندگی سے مر گیا ہوں لیک ڈرتا ہوں

مبادا حشر مجھ کو خوابِ راحت سے جگا دیوے | وله | محبت کا ہوتا ہے عجب آداب میں اُس کے

کہ جوں جوں یار دیوے گالیاں عاشق دعا دیوے | وله | نہ دے فرصت ان ہاتھوں سے کہ کچھ کام لیجے بھی

ہم آخر ہوں گو دامنگیر اس چاکِ گریباں کے | وله | رگڑتا ہے سر اپنا پشت پا پر متصل تیرے

گریباں پھاڑیے اس پر کہ کیا طالع ہیں دامن کے | وله | ٹک اک انصاف کر کرتا ہو اتنی بھی جفا کوئی

لکھوڑ صندل کھینچ ماتھے پر کیا ہے قتلِ عام | وله | تیغ ابرو کو دیا ہو سنگ دیکھا چاہیے

۲- یکرنگ

یکرنگ تخلص، مصطفیٰ قلی خاں نام، متوطن شاہجہان آباد کے۔ نواسوں میں خانجہان خاں لودی کے تھے، اور معاصر شاہ نجم الدین آبرو کے تھے۔ منصبداروں میں محمد شاہ بادشاہ، اور شہرۂ آفاق ساتھ عزت و ماہ کے، مشہور و معروف میں شاہجہان آباد کے، اور معروف باں آوروں میں اس خجستہ بنیاد کے تھے۔ طور انکی گویائی کا پیرو قدما کی گفتگو کے ہے، اور طرز ان کے کلام کی روئیہ پر مضمون و آبرو کی ہو، لیکن از بسکہ شیوہ سابق یاران حال کے غیر مرغوب ہے، تو آہنگ قدیم سمع خراش و دماغ کوب ہے۔ بلدۂ شاہجہان آباد میں انہوں نے اس سرائے فانی سے سفر کیا، اور دلوں پر احباب کے داغ حرماں کا دیا۔ یہ اشعار پُر معنی و خوش بیان ان کے منتخب دیوان ہیں۔

مجھے مت بوجھ پیارے اپنا دشمن	وله	کوئی دشمن ہوا ہے اپنی جاں کا
میں روز و شب جمال سے تیرے ہوں کامیاب	وله	کیونکر کہوں کہ تجھ سی بہتر ہے آفتاب
سچ کہے جو کوئی تو مارا جائے	وله	راستے ہیں تمھے دار کی صورت
مجھ کو معلوم یوں ہوا گل سے	وله	پھول جاتے ہیں اس سے دولتمند
کیوں نہ بچیں گے ہم کہو دشمن ہمارے اس قدر	وله	دوست کا دشمن کوئی ہوتا ہی پیارے اس قدر
نگہباں چاہیئے سرشار کے پاس	وله	تری آنکھوں سے کیونکر دل جدا ہو
روٹھتا ہوں اس سبب ہر بار میں	وله	تا گلے تیرے لگوں اے یار میں
اُس پری پیکر کو مت انسان بوجھ	وله	شک میں کیوں پڑتا ہے اے دل جان بوجھ
کیا جانئے وصال ترا ہو کسے نصیب	وله	ہم تو ترے فراق میں اے یار مر چلے
رونقِ اسلام تیرے رو سے ہے	وله	کفر کا رشتہ ترے گیسو سے ہے
بے قراروں کے تئیں آرام دل		اے مرے پیارے ترے پہلو سے ہے
جدائی سے تری اے صندلی رنگ	وله	مجھے یہ زندگانی دردِ سر ہے
ہوا معلوم یہ غنچہ سے ہم کو	وله	جو کوئی زردار ہے سو تنگدل ہے
نہیں چھوڑیں ہیں سدا زلف تری اپنی مروڑ	وله	باوجودیکہ کمال ان میں پریشانی ہے
اب تو سجن ہمیں کو تباہی تمہیں سے ہے	وله	ہم سب طرف سوں یار تمہاری گلے پڑے
یکرنگ پاس اور سجن کچھ نہیں بساط	وله	رکھتا ہے یہ دو دمن کہو تو نظر کرے
زخمی برنگِ گل ہیں شہیدانِ کربلا	وله	گلزار کی نمط ہے بیابانِ کربلا
کھانے چلا ہے زخمِ ستم شامیوں کے ہاتھ		دھو ہاتھ زندگی سیتی مہمانِ کربلا
اندھیر ہے جہاں میں کہ اب شامیوں کے ہاتھ		ہے سر بریدہ شمع شبستانِ کربلا

بعون اللہ تعالیٰ کتاب تذکرۃ الشعرا من تالیف مرزا علی خاں لطف تخلص بتاریخ بست و ششم
ماہ ربیع الثانی ۱۲۳۵ھ ہجری روز جمعہ بعد سہ پاس روز گذشتہ باتمام رسید